جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۴	بابت ماہ جولائی ۱۹۶۶ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

8V02

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

ج ۲
۳۶۷۶۹

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ضیاء الحسن فاروقی

نیاز فتحپوری

۲۳ مئی کی رات گذار کر ۲۴ مئی کی صبح کو ۴ بجے کراچی میں حضرت نیاز فتحپوری رحلت فرما گئے، وہ کئی مہینے سے گلے کے سرطان میں مبتلا تھے، آپریشن ہوا اور زخم مندمل بھی ہوئے لیکن انتقال سے چند روز قبل یہ زخم ہرے ہو گئے اور جان لیوا ثابت ہوئے ——— حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نیاز کوئی چالیس پینتالیس برس تک ہماری ادبی دنیا پر چھائے رہے، انھوں نے اردو کے ادیبوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا، اور اس طرح متاثر کیا کہ چراغ سے چراغ جلتے رہے، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ یہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

حضرت نیاز نے پرانے طرز کی تعلیم پائی تھی، لیکن ان کے والد مرحوم نے جو صہبائی کے شاگرد تھے، اُن میں فارسی کا گہرا اور ستھرا ذوق پیدا کیا، انھوں نے فارسی کی رائج کتابوں کے علاوہ نیاز کو ہند وعجم کے ممتاز شاعروں اور مصنفوں کے شہ پاروں سے متعارف کیا، اس سے اُن کے ادبی ذوق میں اور نکھار پیدا ہوا۔ وہ بیدل سے روشناس ہوئے۔ اُن کا 'انا' بیدل کے 'انا' سے ہم آہنگ ہو گیا، اس ہم آہنگی کے نقوش ان کی ابتدائی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔ انگریزی انھوں نے تقریباً خود پڑھی اور اپنی ذہانت اور بلند ادبی ذوق کی وجہ سے انگریزی ادب کے فن کاروں سے واقف ہوئے، انگریزی کی طرح ترکی زبان بھی انھوں نے خود سیکھی اور تھوڑے عرصے میں اتنی سیکھ لی کہ ترک ادیبوں کا براہ راست مطالعہ کرنے لگے۔

اردو میں انشائے لطیف کے اماموں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں انھوں نے انشاپردازی کا حق ادا کر دیا، کیوپڈ و سائکی اس انشاپردازی کا نقش جمیل ہے، ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ کم و بیش کیوپڈ اور سائکی کے زمانے ہی کا ایک اور پُرشکوہ ادبی کارنامہ "گیتان جلی" کا ترجمہ ہے۔ شاید خود ٹیگور بھی اردو میں عرض مناجات کرتے تو اس سے زیادہ بہتر حسن بیان کی قدرت نہ پاتے

لیکن جس طرح ٹیگور کو ان کے اہلِ وطن نے اس وقت جانا پہچانا جب ان کو نوبل پرائز ملا اسی طرح نیاز بھی اپنی
زبان کے ادبی افق پر اس وقت ممتاز اور نمایاں ہوئے جب ان کا یہ ترجمہ شائع ہوا۔ اس طرح انشائے لطیف
اور ادبِ عالیہ کی راہوں سے چل کر وہ گونجتی ہوئی آواز بن کے ساتھ اس انداز سے نازل ہوئے کہ اردو ادب
کی دنیا چونک اٹھی، مرحوم میں چونکانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی، اس سے کام لے کر انھوں نے بت شکنی
بھی کی اور بت تراشی بھی۔

نیاز صاحب کے متعلق یہ مشہور تھا کہ انھوں نے "انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا" سے اردو والوں کو روشناس
کیا۔ اس بات سے کئی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں، معلوم نہیں کہنے والوں کی منشا کیا تھی، بہرحال جو کچھ بھی ہو، اگر
یہ صحیح ہے تو یہ کام تھا بڑا مقتدر، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی انشا پردازی کے بل پر بیک وقت
مختلف موضوعات پر لکھ سکتے تھے اور اپنی مخصوص طرزِ انشا سے قارئین کو حیرت میں ڈال دیتے تھے، اُن
کی طرزِ تحریر کی خصوصیت سلاست زبان اور سادگیِ بیان نہیں، بلکہ عبارت کی رنگینی، اظہار کی شوخی اور
فنِ انشا کی ریزہ کاری ہے[1]، اس کے ساتھ ان کے یہاں موضوع اور ہیئت کا وہ خوشگوار امتزاج بھی
ملتا ہے جس سے ان کی انشا پردازی کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیاز کا حافظہ بہت اچھا تھا، فارسی اور
اردو کے ہزاروں اشعار اُن کو ازبر تھے۔ وہ اپنی نثر میں ان سے کام لیتے تھے اور ان کا استعمال ایسا
برمحل اور بے ساختہ کرتے تھے کہ اشعار کی پیوندکاری اُن کی نثر کو اور حسین بنا دیتی تھی۔ ان کی طبیعت میں
ایک جولانی اور بے قراری تھی، یہی وجہ ہے کہ اُن کی عبارت میں عام طور پر غضب کی رعنائی یا یوں کہیے
کہ تخیل بردوش ایک سیلِ رواں ملتا ہے جو پڑھنے والوں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ اپنی حسن پرست طبیعت
حساس دل اور ذہنی اپج سے انھوں نے "اردو ادب میں ایسے ایسے حسین جملوں کا اضافہ کیا ہے کہ معلوم
ہوتا ہے کہ وہ دوسرے محمد حسین آزاد، ظفر علی خاں، اقبال اور غالب ہیں۔ بمبئی میں وہ حسین عورتوں کے
جمگھٹ کو دیکھ کر "حسن پاشیدہ" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں، یہ حسین ترکیب ان سے پیشتر کسی نے

۱۔ منظور حسین شور، نیاز کی انشا پردازی، نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۳ء (نیاز نمبر)۔

استعمال نہیں کی، ایسی بیسوں ترکیبیں ان کی تحریروں میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔[2]

مذہب اور علم کے بارے میں نیاز عقلیت پسند تھے اور اس کے سبب ایک زمانہ اُن کی زندگی میں وہ آیا جب علماء اور روایتی مذہب کے خرقہ پوش ان سے اتنے برہم ہوئے کہ انھیں اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی، لیکن وہ اپنے مسلک پر ڈٹے رہے اس لئے کہ مسلمانوں کا روشن خیال طبقہ انھیں پسند کرتا تھا، ان کا تصور یہ تھا کہ وہ مقلد نہیں تھے، اور مذہب کو روایت سے نہیں بلکہ "تدبر و تفکر" سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے، ہمارے معاشرہ کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ شاہراہ عام سے ذرا ہٹ کر اگر چلنے کی کوشش کیجئے تو فوراً سرزنش شروع ہو جاتی ہے اور قدغن لگ جاتی ہے، ہماری ہر طرح کی پسماندگی کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ اسلام ضمیر اور فکر کی آزادی بخشتا ہے، لیکن ہمارے عالم جو بزعم خود اپنے آپ کو اسلام کا شارح تصور کرتے ہیں، یہ آزادی چھین لینا چاہتے ہیں، کتنا بڑا ظلم ہے یہ لیکن یہ ظلم روا رکھا جاتا ہے، نیاز بھی اسی ظلم کا شکار ہوئے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے خدا، قرآن اور رسولؐ سے کبھی انکار نہیں کیا۔ نسیم انہونوی ان سے بہت قریب تھے، وہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ "مرحوم خدا اور رسول سب کو مانتے تھے، قرآن اور احادیث کی صداقت سے بھی انھیں انکار نہ تھا، قیامت اور روزِ حشر کا بھی یقین رکھتے تھے، مگر ان کا نقطۂ نظر عام مولویوں کے فکر و خیال سے مختلف تھا اور یہی وجہ تھی کہ مرحوم پر اکثر اعتراضات ہوتے رہتے۔"[3]

میں نے ایک مسلمان کی شہادت اس لئے پیش کی ہے کہ اسلام میں شہادت کی اہمیت ہے ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی، اُن کی تحریریں خود ان کے ایمان و ایقان کی شاہد ہیں، وہ قدامت پرستی کے خلاف تھے (خواہ وہ مذہب سے متعلق رہی ہو یا کسی اور چیز سے)، فتحپور میں طالب علمی کے زمانے میں انھیں جس قسم کے مولویوں سے واسطہ پڑا، وہ ذہنی رجعت پرستی کے کڑے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، خود نیاز نے اپنے مضمون "والد مرحوم" میں اور نگار[4] میں مذہبی قدامت پرستی اور اس نوع کی 'مولویت' کے خلاف اپنے شدید ردعمل کا اظہار کسی

۲۔ ضیاء الدین احمد برنی، حضرت نیاز اور اُن کا فن، نگار سالنامہ ۱۹۶۳ء (نیاز نمبر)

۳۔ ماہنامہ حریم، جون ۱۹۶۳ء

۴۔ نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۳ء (نیاز نمبر)

قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ اس مضمون کے چند ٹکڑے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"مولانا نور محمد صاحب عربی کے عالم تھے لیکن محض صرف و نحو، فقہ و حدیث کی حد تک، ان کو منطق و فلسفہ کا ذوق کم تھا اور ادبیت کا بالکل نہیں، وہ عالم ضرور تھے لیکن ان کا علم حاضر نہ تھا اور جب وہ کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو ہمیشہ شروح و حواشی سے مدد لیتے تھے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے لیکن سختی کا یہ عالم تھا کہ طلبہ کو سخت جسمانی ضرر پہونچانے سے بھی ان کو دریغ نہ تھا۔ یہ میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میری ذہنیت میں مذہب اور مذہبیت سے انحراف کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری ایک حد تک اس ماحول پر تھی.....

"میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مولانا کی اس سخت گیری اور طبعی کرختگی کا سبب محض ان کا مذہبی تقشف تھا اور میں اس کمسنی میں بھی بارہا سوچا کرتا تھا کہ اگر عبادت اور مذہبی تعلیم کا صحیح نتیجہ یہی ہے تو مذہب اور مذہبیت کوئی معقول بات نہیں۔ دوسری چیز جس نے مجھے مذہبیت سے بددل کیا، اس مدرسہ کا حافظ خانہ تھا، یہ بڑا قدیم ادارہ تھا جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اور اس بے دردی کے ساتھ کہ اس کے خیال سے میرے جسم کے رونگٹے اب بھی کھڑے ہو جاتے ہیں.... صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار اور بچوں کی آہ و بکا سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی، کبھی کبھی میں والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچے کے جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بیکار کر دیا جائے تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے۔"

"بہر حال مدرسۂ اسلامیہ میں مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری و تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا، میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک کیفیت احتراز پیدا کر دی تھی اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی معقول مذہب نہیں۔"

"..... ہاں..... مجھ بعض ایسے مولویوں سے بھی واسطہ پڑا جن سے مجھے نفرت کی جگہ الفت پیدا ہوئی، لیکن یہ وہی تھے جو مولوی کم اور صوفی زیادہ تھے....."

"...... اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ یہ بڑی طویل داستان ہے مختصراً یہاں سمجھ لیجئے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا میں مولویوں کے بتائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا اور میرا یہ جذبہ نگار کے اجراء کے بعد اس حد تک شدید ہو گیا کہ آخر کار میں نے اس جماعت کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا اور ان کے عقاید اور ان کے اخلاق پر نکتہ چینی شروع کر دی۔"

"مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا۔۔ اور اس لحاظ سے میں ان کا شکر گزار ہوں کہ اگر ان سے مجھے واسطہ نہ پڑتا تو نہ میں اپنے مذہبی مطالعہ میں وسعت پیدا کر سکتا اور نہ مسایل مذہب میں صرف عقل کا سلیقہ مجھ میں پیدا ہوتا۔"

مرحوم جانی پہچانی راہوں سے ہٹ کر نئی راہ پر چلنے کو ترجیح دیتے تھے، یہ کام یوں بھی مشکل ہے لیکن علم و ادب کی دنیا میں اس کے لئے بڑی ہمت، ذہانت اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شدید مخالفتیں ہوتی ہیں، روایتی انداز میں سوچنے والے ناک بھوں چڑھاتے ہیں، حریف کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن تدبیر کی جاتی ہے لیکن اگر نئی زمین توڑنے والے میں ہمت اور استقلال ہے تو اسے کامیابی ضرور ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ لوگ اس کا لوہا مان لیتے ہیں، نیاز کے افسانوں پر آج کا نقاد سخت سے سخت تنقید کر سکتا ہے لیکن جس زمانے میں انھوں نے افسانے لکھے اس وقت کی فضا اور تھی، ان کا کارنامہ تو یہی ہے کہ انھوں نے طرز قدیم سے علاحدہ ہونے کی کوشش کی "ترقی پسند تحریک کی روشنی ان کے شعور میں بہت پہلے آئی چنانچہ اس تحریک کے آغاز سے چند سال قبل ہی وہ تخیل کی دنیا سے نکل کر زندگی کے ماحول میں آ گئے اور مقصدیت بھی نمایاں ہو گئی، "انددواج" کم رنگ میں یہ فضا موجود ہے۔ نیاز صاحب کا شمار ان فنکاروں میں ہے جنھوں نے داستان کے بطن سے کہانی کی نئی صنف پیدا ہی نہیں کی بلکہ آپریشن کر کے نکالی ہے[۵]۔"

اردو افسانہ نگاری میں رومانوی تحریک کا جب بھی ذکر کیا جائے گا تو یلدرم اور نیاز کا ذکر ضرور ہو گا۔

۵۔ کوثر چاندپوری، دیدۂ بینا، صفحات ۲۳۸ - ۲۳۹

کیونکہ ان دونوں ادیبوں کے ساتھ ایک ایسا اسلوب وابستہ ہے جس نے جدید ذہن خاص طور سے نوجوانوں کے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ یلدرم کی طرح نیاز کو بھی قصہ کی صداقت سے سروکار نہیں تھا بلکہ وہ تخیل کی دنیا میں ایک پیکر اور تصور تراش کر اپنی عبارت کے بانکپن، بندشوں کی جدت اور شگفتگی اور سرمدی رومانی تاروپود سے سرور و انبساط کی ایک ایسی فضا کی تخلیق کرتے تھے، جہاں پڑھنے والا مخمور اور مبہوت ہو کر رہ جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ایک خاص عمر کے نوجوانوں کو اُن کے افسانوں میں وہ رومانی لذت ملتی تھی جو تخیل پرستوں کو اپنے فکر کے پیکروں کی ذہنی دید و باز دید میں ملتی ہے۔" نیاز کے رومانی افسانوں کی جان، انھیں پرتاثیر بنانے والی قوت، ان میں شعریت اور رنگینی کی کیف آگینیاں شامل کرنے والی لطیف شئے صرف عورت ہے .. عورت کے ساتھ ساتھ ان کا نظریۂ محبت بھی رومانی ہے ۔۔۔۔ نیاز کے افسانوں میں ۔۔۔ اتحاد اثر بہت زیادہ ہے اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں، ایک ہی رنگ میں ڈوب کر لکھتے ہیں ... نیاز کے دوسرے دور کے افسانوں میں حقیقت اور نفسیات کا مظاہرہ رومانیت اور کلاسکیت سے کہیں زیادہ ہوا ہے جن میں ہمیں نفسیات کے گہرے نقوش اور تصورات کے علاوہ کرداری ارتقاء، جذبات و تحریکات کی جنگ، خیالات و احساسات کے فطری نمونے زیادہ نظر آتے ہیں۔ اُن میں نیاز رومانیت پسند تو ضرور ہیں لیکن رومان پرست نہیں، اس کی کمی بڑی حد تک حقیقت شعاری نے پوری کی ہے[6]"

نقاد کی حیثیت سے نیاز کے بارے میں مختلف رائیں رہی ہیں، لیکن جو کچھ بھی ہو اُن کے نقاد ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ ان کی تنقیدیں عام طور سے جمالیاتی اور تاثراتی ہوتی تھیں اور وہ خاص طور سے اس لئے کہ شاعری کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ معانی کے مقابلہ میں اسلوب کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، اس میں اُن کی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو زیادہ دخل ہوتا تھا، ان میں یہ کمزوری بھی تھی کہ وہ کبھی کبھی بحیثیت نقاد حد سے گزر جاتے تھے اور کسی سے اگر ذرا سا اختلاف بھی ہوا تو وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے تھے اور اُس کی بخیہ ادھیڑنے میں

۶۔ وقار عظیم، رومانی افسانہ اور نیاز، نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۳ء

بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے تھے تنقید کے معاملہ میں وہ بالکل مشرقی تھے اور معانی و بیان کی اصطلاحات، جدت ادا، ندرت خیال وغیرہ کو بہت اہمیت دیتے تھے، وہ لوگ جو مغرب کی خوشہ چینی میں، اور وہ بھی چھوٹے طریقہ سے حد اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے اور ہر روایت سے بغاوت ہی کو روح ادب اور جان ادب تصور کرتے تھے، ان کے شور و غلغلے میں نیاز نے اپنی عملی تنقید کے ذریعہ روایتی انداز بیان کی اہمیت کو زندہ رکھا اور اس کی وجہ سے ادبی فضا میں توازن اور اعتدال کے قائم ہونے میں بہت مدد ملی، یہ اُن کا کارنامہ ہے۔

مکتوب نگار، مقالہ نویس اور علم و ادب کے مختلف موضوعات پر لکھنے والے کی حیثیت سے بھی نیاز کا نام زندہ رہے گا۔ لیکن ہم بہرحال انھیں مورخ، محدث، فقیہہ، ماہر موسیقی و علم النجوم یا ماہر جنسیات نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ تاریخ، حدیث، فقہ، موسیقی، نجوم، سائنسی و تہذیبی موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ایک صحافی کی حیثیت سے لکھا، یہ اور بات ہے کہ اپنی انشا پردازی کے زور سے انھوں نے اس میں بڑی دلکشی اور جاذبیت پیدا کی۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور ان کے کلام میں موضوعات اور خیالات کا تنوع بھی ہے، لیکن اردو ادب کے حق میں یہ اچھا ہوا کہ انھوں نے اپنی صلاحیت کا اندازہ کر کے نثر کے میدان کو اپنے قلم کی جولانگاہ بنایا۔

صحافت و ادب میں نگار کا جو مقام رہا ہے اور چالیس سال تک اس ماہنامے نے علم و ادب کی جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے، وہ ہر لحاظ سے منفرد ہے، نگار کو یہ مرتبہ محض نیاز کی شخصیت سے ملا، اس کے متعدد خاص نمبر اردو زبان و ادب کے معلمین و محققین کے لئے عرصہ تک ناگزیر رہیں گے، نیاز نے کبھی مصلح ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ نگار میں جس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، اس کے کوئی متعین مقاصد ہی بتائے گئے، پھر بھی بعض لحاظ سے، اور ادب میں تو خاص طور سے، اس کا انداز فکر تعمیری و اصلاحی رہا، سرسید کا تہذیب الاخلاق ایسے جرائد کا پیش رو ہے، اس کے علاوہ مخزن، صلائے عام، نیرنگ خیال، الہلال، زمانہ، تمدن، معارف، الناظر، نقاد اور ادیب وغیرہ بھی ایسے جریدے تھے جنھوں نے قوم، علم اور ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، لیکن نگار کی یہ خصوصیت

کسی کے حصہ میں نہیں آئی کہ ایک طویل مدت تک مخصوص روایات کے ساتھ کسی ایک صاحب طرز انشا پرداز کا ادارت میں تسلسل رہا ہو۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اردو میں آزادی فکر کے رجحان کو عام کرنے اور دنیائے علم و ادب میں تنقیدی و تخلیقی قوتوں کو ابھارنے، سنوارنے اور پروان چڑھانے میں جو کام نگار نے کیا ہے کسی اور پرچے نے نہیں کیا۔[7] نگار نے خواہ اُسے کیسے ہی سخت دور سے گزرنا پڑا ہو، کبھی سستی صحافت اور بازاری اشتہار کو اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی، اور جس اعلیٰ معیار کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ اب تک قائم ہے، یہ سب کچھ ایک ذات سے تھا، یعنی نیاز، نیاز اور نگار ایک لحاظ سے مترادف بن گئے تھے، اب نگار کے نئے ذمہ داروں کی آزمائش کا وقت آیا ہے۔

نیاز کے قلم میں جادو اور شخصیت میں بانکپن تھا، اسی لئے ان کی تحریر کا اثر ہوتا تھا، بحیثیت انسان کے وہ وضعدار، شریف اور سیر چشم تھے اور ایک دل دردمند رکھتے تھے، رہن سہن میں سلیقہ، ستھرا پن اور ایک حسن ترتیب تھا، کم آمیز ضرور تھے لیکن خلوص اور محبت بھی بہت تھی اور اپنے ملنے والوں سے بڑی بے تکلفی اور کھلے دل سے ملتے تھے۔ وضعداری اور آئین دوستداری کی یہ ایک مثال کافی اور بہت بھاری ہے۔ وہ لکھنؤ میں صبح کی سیر کے بعد اپنے ایک دوست کے مکان پر بیٹھنے کے عادی تھے، ان کے پاکستان چلے جانے پر بھی اپنی یہ وضع تبدیل نہیں کی اور واپس آتے وقت بس پانچ منٹ خالی مکان ہی پر بیٹھ آتے تھے۔[8] بانکپن کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۱۹ء میں اپنے قیام بھوپال کے زمانے میں جب دوستوں کے اصرار پر انھوں نے ملکہ بھوپال سلطان جہاں بیگم کی سالگرہ کے موقع پر اپنی نئی تصنیف "گہوارۂ تمدن" پیش کی تو اس کا انتساب ان الفاظ میں لکھا:

"مانا کہ لعل و گہر بغیر کسی وصف اضافی کے بھی دنیا میں ایک مستقل امتیاز رکھتے ہیں، لیکن ان کا حقیقی شرف تو اسی طرف کلہ سے وابستہ ہے جہاں جگمگانے کے لئے وہ حقیقتاً وضع ہوئے ہیں، اس لئے اگر میں ان اوراق کو علیا حضرت، بلقیس مرتبت، نوشیرواں صفت،

۷۔ فرمان فتحپوری، نگار اور نگار کے خاص نمبر، نگار سالنامہ ۱۹۶۳ء
۸۔ دیدۂ بینا، صفحہ ۲۳۷

گردونِ رکاب، عالاجناب سلطان جہاں بیگم... کے اسمِ گرامی سے منسوب کرنے کی عزت حاصل کرکے مسرور و مفتخر ہوں، تو جائے حیرت نہیں، کیوں کہ اربابِ نظر لعل و گہر کو نہیں بلکہ

"عروجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں"

نیازؔ کا انتقال کراچی میں ہوا، کیا اچھا ہوتا کہ جس شہر میں انھوں نے اتنی کامیاب زندگی گذاری وہیں وہ دفن بھی ہوتے، وہ پاکستان گئے تو یہاں ان کے دوستوں اور قدر دانوں کو بہت افسوس ہوا، اور طرح طرح کی باتیں بھی کہی گئیں، لیکن جن حالات میں انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا، وہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں وہ اپنے خانگی معاملات سے اتنے تنگ آچکے تھے اور اتنے مجبور ہو چکے تھے کہ انھیں وطن عزیز کو خیرباد کہنا پڑا، انھوں نے خود اس افسوسناک صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"..... لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمانے کے ترکش میں ایک آخری تیر اور بھی ہے، ایسا زہر آلود تیر کہ اس سے جانبر ہونا میرے لئے دشوار ہو جائے گا۔ اس کی توضیح ضروری نہیں، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کا یہ دردناک تجربہ ۱۹۶۱ء سے شروع ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ میرے نظام عصبی اور دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اشتہا مفقود ہو گئی اور غذا ترک یہاں تک کہ میں صاحب فراش ہو گیا اور زندگی سے بالکل مایوس، پھر اگر میں تنہا ہوتا تو میری جان اتنی عزیز نہیں کہ میں اس ماحول میں جان دینے سے گریز کرتا، لیکن چونکہ میری رفیقۂ حیات اور اپنے دو چھوٹے بچوں کا مستقبل بھی میرے سامنے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد ان کو سخت مسائل کا مقابلہ کرنا پڑے گا، اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان کو لے کر پاکستان چلا آؤں۔ جہاں میرے اور میری بیوی کے اعزہ پہلے ہی سے موجود تھے اور مجھے یقین تھا اور ہے کہ میرے بعد وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی یہاں بسر کر لے جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انھیں کوئی ستائے گا نہیں، ہندوستان

میں، میں نے بعض کامیاب زندگی بسر کی اور وہاں کی حکومت نے میری حتیٰ قدر افزائی کی اس کا اقتضا یہی تھا کہ میں وہیں جان دیتا لیکن افسوس ہے کہ ان ناگزیر حالات نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا... ۹

ذیل میں ہم نیاز کے تصنیفی و تالیفی کاموں کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں، یہ فہرست سالنامہ نگار پاکستان ۱۹۶۳ء (نیاز نمبر حصہ اول) سے لی گئی ہے۔

مطبوعہ کتابیں:

(۱) ایک شاعر کا انجام
(۲) جذبات بھاشا
(۳) صحابیات
(۴) تاریخ الدولتین
(۵) المسئلۃ الشرقیہ (ترجمہ)
(۶) عرض نغمہ (ترجمہ گیت انجلی)
(۷) فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع
(۸) فراست الید
(۹) مکتوبات نیاز جلد اول
(۱۰) مکتوبات نیاز جلد دوم
(۱۱) مکتوبات نیاز جلد سوم
(۱۲) مذاکرات نیاز
(۱۳) نگارستان
(۱۴) جمالستان
(۱۵) ترغیبات جنسی
(۱۶) شہاب کی سرگزشت
(۱۷) مجموعہ استفسارات و جوابات حصہ اول و دوم و سوم
(۱۸) من و یزداں حصہ اول و دوم
(۱۹) نقاب اٹھ جانے کے بعد

۹۔ ''والد مرحوم، میں اور نگار''، نگار سالنامہ ۱۹۶۳ء

(۲۰) گہوارۂ تمدن
(۲۱) انتقادیات جلد اول و دوم
(۲۲) مذہب
(۲۳) حُسن کی عیاریاں
(۲۴) مالہ و ماعلیہ
(۲۵) نقش ہائے رنگارنگ
(۲۶) مشکلات غالب
(۲۷) محمد قاسم سے بابر تک
(۲۸) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ
(۲۹) تاریخ کے گمشدہ اوراق
(۳۰) شبستاں کا قطرۂ گوہریں

نیاز کے تحریر کردہ نگار کے خاص نمبر

(۱) ملاحظات نمبر جنوری سنہ ۱۹۳۶ء
(۲) ڈرامہ اصحاب کہف نمبر جنوری سنہ ۱۹۳۷ء
(۳) قرآن نمبر جنوری سنہ ۱۹۴۵ء
(۴) پاکستان نمبر سنہ ۱۹۴۸ء
(۵) ایک مستقبل کی تلاش نمبر جنوری سنہ ۵۱ء
(۶) فرمانروایان اسلام نمبر جنوری سنہ ۵۳ء
(۷) علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر جنوری سنہ ۵۵ء
(۸) معلومات نمبر جنوری سنہ ۵۸ء
(۹) تنقیح اسلام نمبر جنوری سنہ ۵۹ء
(۱۰) غالب نمبر جنوری سنہ ۶۱ء

اِس کے علاوہ ملاحظات، علمی و ادبی مقالات، سوانحی مضامین، معلوماتی مضامین، تبصرے، اردو نظمیں، اردو غزلیں، فارسی نظمیں اور غزلیں، افسانے اور ڈرامے ہیں جن کی تعداد چار پانچ ہزار تک پہونچتی ہے اور جو نگار میں شائع ہو چکی ہیں۔

عبدالقوی دسنوی

اقبالیات

گذشتہ چند برسوں سے اقبال پر کافی کام ہو رہا ہے اور ان کے کلام کے اس حصہ کو جسے بانگِ درا کی اشاعت کے وقت حذف کر دیا گیا تھا یا اصلاح کے بعد شائع کیا گیا تھا منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے یقیناً اقبالیات کے سلسلے میں یہ کام بڑی اہمیت رکھتا ہے اس سے اقبال کے افکار اور شعور کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں عبدالرحمٰن طارق صاحب نے پہلی اپریل ۱۹۴۷ء میں "جہانِ اقبال" شائع کی جس کے آخری حصہ میں انھوں نے اقبال کے غیر مطبوعہ کلام پیش کیے۔ محمد انور حارث صاحب نے "رختِ سفر" کے نام سے ۱۹۵۲ء میں بڑی خوبصورت کتاب شائع کی جس میں علامہ اقبال کے اسی قسم کے کلام جمع کیے گئے ہیں۔ سید عبدالواحد صاحب کی کتاب "باقیاتِ اقبال" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس زمانہ میں مولوی بشیر الحق دسنوی صاحب نے "اصلاحاتِ اقبال"، "باقیاتِ اقبال" اور "محذوفاتِ اقبال" کے نام سے الگ الگ تین مجموعے مرتب کیے۔ پہلا مجموعہ "اصلاحاتِ اقبال" کے نام سے پٹنہ سے شائع ہوا۔ انور حارث صاحب اور سید عبدالواحد صاحب کی کتابوں کی اشاعت کے بعد بشیر الحق دسنوی صاحب نے "باقیاتِ اقبال" اور "محذوفاتِ اقبال" کی جگہ ایک کتاب "تبرکاتِ اقبال" مارچ ۱۹۵۸ء میں شائع کی۔ اس کے بعد ہی غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری صاحبان نے مل کر "سرودِ رفتہ" نام کی کتاب مرتب کی جس میں اقبال کے کلام کا بہت سارا حصہ جو ان کے مجموعوں میں نہیں تھا شامل کر لیا گیا ہے۔ جلیل قدوائی صاحب کا مضمون "اقبال کی بعض اردو نظموں کا ابتدائی متن" بھی اس قسم کی دریافت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس سلسلے کی آخری کتاب "نوادرِ اقبال" ہے جسے عبدالغفار شکیل صاحب نے مرتب کیا ہے لیکن اس مجموعے میں بہت خامیاں رہ گئی ہیں جن کی طرف محمد بشیر الحق دسنوی صاحب

"ہماری زبان" کے اکثر شماروں میں اشارے کئے ہیں۔

"اصلاحات اقبال" جس زمانے میں شائع ہوئی میں کتب خانہ الاصلاح (دیسنہ۔پٹنہ) کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں بعض ایسے اخبارات اور رسائل دیکھنے کا موقع ملا جن میں علامہ اقبال کے کلام چھپے تھے اور جو بعد میں "بانگ درا" میں حذف واصلاح کے بعد شائع ہوئے تھے۔ میں نے اسی قسم کی بعض نظمیں اور غزلیں "ہماری زبان" کو بھیجیں جو شائع ہوئیں۔ ایک مضمون اقبال کی تین نظمیں (فلسفۂ غم، فاطمہ بنت عبداللہ، اور محاصرۂ ادرنہ) مہر نیمروز کراچی کے مئی۔ اگست ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ایک اور مضمون "حذف واصلاح اقبال کے کلام میں" کاروان ادب، سینٹ زیویرز کالج بمبئی میں شائع ہوا اور پسند کیا گیا۔ اس زمانے میں میرے پاس اقبال کا حذف شدہ اور اصلاح شدہ کلام کافی جمع ہو گیا تھا لیکن بعد میں جو مختلف مجموعے منظر عام پر آئے ان میں اس قسم کا بہت سارا حصہ شائع ہو گیا بجز نظر ثانی کی اور وہ ۔ جو دوسرے مجموعوں میں آگیا ہے الگ کر دیا۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کے کلام کو دوبارہ مرتب کیا جائے اور محذوفات و اصلاحات کلام اقبال میں شامل کر لیا جائے تاکہ اقبالئین کو اقبال کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

انسان اور بزم قدرت

مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء میں یہ نظم شائع ہوئی ہے جس کے دو شعر بانگ درا میں حذف کر دیئے گئے ہیں اور چار شعر اصلاح کے بعد شائع کئے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ اشعار "اصلاحات اقبال" میں درج ہیں حذف شدہ اشعار درج ذیل ہیں ؎

نور یکساں ترے ویرانے میں آبادی میں ۔۔۔ شہر میں دشت میں کہسار کی ہر وادی میں

جو سمجھنے کی تھی وہ بات نہ سمجھی تو نے ۔۔۔ یعنی مے پی ہے تمیز من و تو کی تو نے

نالۂ فراق

یہ نظم مخزن مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ بانگ درا میں تین بند حذف کر دیئے گئے ہیں اور ایک شعر اصلاح شدہ ہے جو اصلاحات اقبال میں درج ہے۔ حذف شدہ اشعار "سرود رفتہ" میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ نظم کے ساتھ اقبال کا ایک نوٹ بھی جو اس طرح ہے۔

"استاذی قبلہ مسٹر ارنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکینت قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ایک روز تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا اور چند اشعار بے اختیار زبان پر آ گئے جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں اگرچہ ان کی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کئے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اس وقت لکھی بھی جا چکی تھی تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک درد آمیز اظہار تھا کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔"

(اقبال)

سرگزشت آدم

یہ نظم "تازہ غزلیں" کی سرخی سے مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی ہے جس میں کل ۲۰ شعر ہیں، "بانگ درا" میں پانچ شعر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ حذف شدہ اشعار "سرود رفتہ" میں شامل کر لئے گئے ہیں، لیکن ذیل کا شعر اس میں نہیں ہے ؎

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا   وہ سادہ لوح ہوں میں کر لیا یقیں میں نے

رخصت اے بزم جہاں!

یہ نظم مخزن مارچ ۱۹۰۴ء میں اڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ بانگ درا میں اس کے

یہ شعر حذف کر دیئے گئے اور ایک شعر اصلاح کے بعد شائع ہوا۔ اصلاح شدہ شعر "اصلاحات اقبال" میں درج ہے اور حذف شدہ شعر "رخت سفر" اور "سرود رفتہ" میں شامل کر لئے گئے ہیں لیکن رخت سفر میں دو شعر تبدیل شدہ ہیں۔ ایڈیٹوریل نوٹ اور رخت سفر کے تبدیل شدہ اشعار ذیل میں ہیں۔

ایڈیٹوریل نوٹ:

"شیخ محمد اقبال صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے عظیم الشان سالانہ جلسے کے لئے نظم لکھنے کے لئے بے حد مصروف تھے جب اس رسالہ کی ترتیب کا وقت آ پہونچا اس لئے کوئی چیز خاص مخزن کے لئے نہیں لکھی جا سکی۔ انھیں دنوں ان کی ایک دل پسند نظم "دکن ریویو" میں چھپی ہے، اسی کو بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ وہ ہمیں بغرض اشاعت عنایت کرتے ہیں"۔

تبدیل شدہ اشعار

مخزن۔ سرود رفتہ	رخت سفر
تیر لگتی ہے نگاہ چشم نو دولت مجھے	زخم پیکاں ہے نگاہ چشم نو دولت مجھے
ہے ترے عجز خوشامد زادہ سے نفرت مجھے	....
خامشی کا بار لیکن اب اٹھا سکتا نہیں	اب مگر بار خموشی میں اٹھا سکتا نہیں
آئینہ مشرب ہوں راز اپنا چھپا سکتا نہیں	....

دنیا

یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی ہے جس میں کل نو شعر ہیں۔ بانگ درا میں یہ نظم شامل نہیں کی گئی ہے "باقیات اقبال" اور "رخت سفر" دونوں میں یہ نظم شائع کی گئی ہے لیکن ذیل کا شعر دونوں مجموعوں میں نہیں ہے اور اشعار کی ترتیب میں بھی فرق ہے ؎

یاس و امید کا ملا ہوا ہوں   کوئی جاتی بہار ہے دنیا

پیام

یہ نظم مخزن فروری ۱۹۰۷ء میں "پیغام راز" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اور کل بارہ شعروں پر مشتمل ہے، بانگ درا میں پانچ شعر حذف کر دیئے گئے ہیں اور چار شعر اصلاح شدہ ہیں جو اصلاحات اقبال میں درج کر لئے گئے ہیں، ذیل میں ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ حذف شدہ اشعار درج ہیں۔

ایڈیٹوریل نوٹ ـــ

"شیخ محمد اقبال صاحب جب سے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں پہونچے ہیں، اپنے نئے مشاغل علمی میں بے حد مصروف ہو گئے ہیں اور نظم کے حصہ کا وقت نذر جستجو ہو رہا ہے اور کتب خانوں کی ورق گردانی باقی سب شوقوں پر غالب ہے۔ ان دنوں میں انھیں نظم لکھنے کی تحریک کرتے ہوئے بھی تامل ہوتا ہے خدا بھلا کرے نذر محمد صاحب بی۔ اے (اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقۂ دہلی) کا کہ ان کے ایک خط نے ذیل کے اشعار لکھوا لئے۔ یہ گویا ان کے خط کا جواب ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے خط میں کیا کیا لکھا تھا جس کے جواب میں یہ رنگین شعر نکلے ہیں۔ اس وقت ہم رازدار ہیں محض پیغامبر نہیں ہاں اتنا جانتے ہیں ؏

یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے"

حذف شدہ اشعار:

کیوں کر نہ وہ جہاں کو پیغام بزم راز دے ۔۔۔ غم کی صدائے دل نشیں جس کا شکستہ ساز دے

غافل تجھے خبر نہیں لذت فراغ میں ہے کیا ۔۔۔ دنیا ادا پہ کر فدا عقبیٰ بہائے ناز دے

پابند اک صنم نہ ہو ہر لحظہ تو نیا زرہ ۔۔۔ پوجا کو اس روش سے تو پیرہن نماز دے

ہو شوق سیر گل اگر ایسا چمن تلاش کر ۔۔۔ ہر غنچے کی چٹک جہاں لطف نوائے راز دے

طلبائے علیگڈھ کے نام

مخزن جون ۱۹۰۷ء میں یہ نظم شائع ہوئی ہے اور بارہ شعر پر مشتمل ہے، بانگ درا میں پانچ شعر

حذف کر دیئے گئے ہیں۔ سات شعر اصلاح شدہ ہیں جو "اصلاحاتِ اقبال" میں درج ہیں۔ حذف شدہ اشعار نوادراتِ اقبال میں شامل کر لئے گئے ہیں۔

ایڈیٹوریل نوٹ ملاحظہ ہو

"کلامِ اقبال علیگڈھ میں ہمیشہ مقبول ہے اور شوق و توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ مگر پیامِ اقبال جو آج ہم شائع کرتے ہیں نہایت غور سے پڑھے جانے کے لائق ہے۔ طلبائے علیگڈھ کو خصوصیت سے مخاطب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی آئندہ امیدیں بہت کچھ ان سے وابستہ ہیں ورنہ سب پڑھے لکھے نوجوان اس دردمندانہ مشورے کے مخاطب ہو سکتے ہیں جو حضرت اقبال نے ان چند اشعار کے جامع الفاظ اور بلیغ اشارات میں انھیں دیا ہے"۔

پیغامِ عشق

مخزن اکتوبر ۱۹۰۸ء میں یہ نظم شائع ہوئی ہے اور آٹھ شعر پر مشتمل ہے۔ بانگ درا میں ذیل کا شعر قلم انداز کر دیا گیا ہے سے

دیارِ خاموشِ دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو
کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورتِ حرفِ راز ہو جا

نظمِ اقبال

علامہ اقبال کی دو نظمیں "شکریہ" اور "گورستانِ شاہی" مخزن جون ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی ہیں۔ "نظمِ اقبال" کی سرخی سے مدیرِ مخزن نے ان پر دلچسپ نوٹ لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ایک عرصہ سے ہمارے دوست شیخ محمد اقبال صاحب ام۔ اے بیرسٹر ایٹ لا کی نظم کے مشتاق و متقاضی تھے کہ جس طرح ممکن ہو ان کی کمی فرصت کے باوجود ان سے کچھ لکھوایا جائے۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے گزشتہ مارچ میں ان کے دکن تشریف لے جانے اور وہاں کے ارباب

نظم ملکال کی صحبتوں نے ان کی طبیعت کو گدگدایا، یہ دو نظمیں جو آج شائع کی جاتی ہیں اس سفر کی یادگار ہیں۔ ان میں سے جو ایک پہلے درج کی جاتی ہے ایک قصیدہ ہے جس کے ممدوح خود شاہ دکن اعلیٰ حضرت شاہ ہیں، یہی خصوصیت اس قصیدہ کو عالی مرتبت بنانے کے لئے کافی تھی مگر مزید لطف یہ ہے کہ تمہید کی تشبیب میں حق شاعری ادا کیا گیا ہے۔ دکن کے علم دوست اور ہنر پرور وزیر اعظم کی اس خوبی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، اہل علم کی قدر دانی ان کا شیوہ ہے اور مشاغل علمی سے انھیں شغف ہے۔ انھوں نے جو الطاف نامہ شیخ محمد اقبال کو لکھا ہے اس سے نہ صرف شیخ صاحب موصوف کی قدر افزائی مقصود تھی بلکہ ان کی شاعری کے لئے ایک زبردست تحریک جس کے لئے ہم بھی غائبانہ طور پر مخزن کے ناظرین کی طرف سے ہز اکسلنسی مہاراجہ صاحب بہادر کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

دوسری نظم جو "گورستانِ شاہی" کے عنوان سے شائع کی جاتی ہے ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الوقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے اس کا ایک ایک مصرع ایسا درد بھرا ہوا اور معنی خیز ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے۔ اس نظم کے میسر آنے کے لئے ہم اپنے قدیم عنایت فرما مسٹر حیدری کے ممنون ہیں جن کے صحیح مذاق علمی نے شیخ محمد اقبال صاحب کو حیدر آباد میں وہ چیز دکھائی جو ایک خلقی شاعر کے دل پر قدرتی طور سے اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ سلاطین قطب شاہیہ کے مزار ان کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار۔ شب ماہ مگر ایسی شب ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی، سچے شاعرانہ جذبات کے نشوونما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان جذبات کا عکس جس خوبی اور صفائی سے جناب اقبال نے اتارا ہے انھیں کا حصہ ہے۔

ان دونوں نظموں کو ان کی اہمیت کی وجہ سے ہم سب مضامین سے اول جگہ دیتے ہیں خصوصاً اس لئے کہ اگر ہم انھیں حصہ نظم میں رکھنا چاہتے تو شائقین کو اگلے مہینہ کے شائع ہونے تک اور انتظار کرنا پڑتا۔ (ایڈیٹر)"

پہلی نظم "شکریہ" ہے، بانگ درا میں اس نظم کے نو شعر "نمود صبح" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

"باقیاتِ اقبال" میں یہ نظم "حیدر آباد دکن ـــ طلوعِ سحر" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ "تبرّکاتِ رفتہ" میں شکریہ کے عنوان سے ہی شائع ہوئی ہے۔ حذف شدہ اشعار "رختِ سفر" میں بھی درج کر لیے گئے ہیں۔ ان مجموعوں میں ایک شعر شائع ہونے سے رہ گیا ہے جو ذیل میں ہے ؎

جس کے بلبل عندلیبِ عقلِ کل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لئے رخسارِ حور آئینہ دار

اس نظم کے ساتھ اقبال کا یہ نوٹ بھی شامل ہے:۔

"گزشتہ مارچ میں مجھے حیدر آباد دکن جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسلنسی مہاراجہ سرکرشن پرشاد بہادر جے، سی، آئی یمین السلطنت پیشکار وزیر اعظم، دولتِ آصفیہ المتخلص بہ شادؔ کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسلنسی کی نوازشِ کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا وہ میرے لوحِ دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلامِ شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایتِ بے غایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے اختیار آ گئے۔ انھیں زبانِ قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت پہونچانے کی جرأت کرتا ہوں۔"

دوسری نظم "گورستانِ شاہی" جو ۴۳ شعر پر مشتمل ہے بانگِ درا میں چھ شعر حذف کر دیئے گئے ہیں اور چھ شعر اصلاح شدہ ہیں، اصلاح شدہ اشعار "اصلاحاتِ اقبال" میں درج ہیں۔ "سرودِ رفتہ" میں حذف شدہ اشعار اور پانچ اصلاح شدہ اشعار شامل کر لئے گئے ہیں۔ اس نظم کے ساتھ بھی علامہ اقبال کا نوٹ ہے ملاحظہ ہو:۔

"حیدر آباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی۔ اے معتمد محکمہ فنانس جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولتِ آصفیہ مستفید

ہو رہی ہے کہ مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں، رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لئیق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدر آباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ـــ اقبال"

غزل

مخزن جون ۱۹۱۷ء کے کچکول میں اقبال کے تین شعر درج ہیں جس کا ایک شعر بانگ درا میں اصلاح شدہ ہے ؎

مخزن	بانگ درا
ہے رسم عشق دور الگ سب سے بیٹھنا	ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
کعبہ بھی، تپکدہ بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے	بت خانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے

کلام اقبال

اس عنوان سے مخزن جنوری ۱۹۱۲ء اقبال کے تین شعر شائع ہوئے ہیں ؎

ہمائے اوج سعادت ہو اثر کار اپنا — کہ تاج پوش ہوا تاج دار اپنا

اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں میں — اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا

اسی سے عہد وفا ہندیوں نے باندھا ہے — اسی کے خاک قدم پر ہے دل نثار اپنا

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

یہ نظم خطیب دہلی ۱۳؍ اگست ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی ہے خطیب میں اس نظم کا عنوان "عید پر اشعار لکھنے کی فرمائش کا جواب" ہے۔ بانگ درا میں دو شعر حذف کر دیئے گئے ہیں ؎

مجھے قسم ہے نظامی مدینہ والے کی
ہمیشہ ماتم ملت میں اشکبار ہوں میں
سرور مرغ نوا ریز و ہم نشینیِ گل
مرے نصیب کہاں! غنچۂ مزار ہوں میں

شمع

یہ نظم بانگ درا میں حذف و اصلاح کے بعد شائع ہوئی ہے اور ۲۹ شعر پر مشتمل ہے۔ مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں یہی نظم ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے جس میں چالیس شعر ہیں۔ بانگ درا میں پانچ شعر اصلاح کے بعد لئے گئے ہیں۔ حذف شدہ اشعار "رخت سفر" اور "سرود رفتہ" میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ اشعار "اصلاحات اقبال" میں درج ہیں لیکن ذیل کا اصلاح شدہ شعر اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے ؎

بانگ درا	مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء
اے شمع انتہائے فریب خیال دیکھ	اے شمع حال قیدیِ دام خیال دیکھ
مسجود ساکنان فلک کا مآل دیکھ	- - - - - - - - - - -

اڈیٹوریل نوٹ جو مخزن میں اس نظم کے ساتھ شائع ہوا ہے ذیل میں ہے۔

"کلام اقبال اوراق مخزن میں ویسے مقبول ثابت ہو چکا ہے اور لوگ اس سے ایسے آشنا ہو گئے ہیں کہ تمہید کی ضرورت باقی نہیں رہی مگر اس دفعہ حسن اتفاق سے ہمیں ان کی دو ایسی نظمیں دستیاب ہوئی ہیں، جو الفاظ، طرز ادا اور بندش میں ایک دوسرے سے بالکل الگ

ہیں ایک فارسی الفاظ سے لدی ہوئی توانائی اضافات کا بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے، غالب مرحوم کے انداز کا نمونہ آہستگی اور رفتار سے چلتی ہوئی نظر آتی ہے اور دوسری سبک روی میں بیش سادہ الفاظ کا جامہ پہنے، اضافتوں کے زیور سے خالی اپنی سادگی پر ناز کرتی ہوئی دل میں بیٹھی جاتی ہے ایک کے خیالات پیچیدہ اور دقیق کہ اخذ کرنے کے لئے ذہن کو فکر سے دست و گریباں ہونا پڑتا ہے اور معنی ذہن میں آ آ کر دامن چھڑا ئے جاتے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ؎

بیا در بدگراں جا بود زباندانے　　　غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

اور دوسری کی سیدھی سادی آرزؤں کی تصویریں ہیں کہ دل پر نقش ہوئی جاتی ہیں ایک فلسفیت اور تصوف کے سمندر میں غوطہ زن ہے تو دوسری تصور کے پر لگا کوہ و بیاباں، باغ و راغ کی سیر میں معروف ہے اور جو کچھ دیکھتی ہے اس پر مصوری کا افسوں پڑھ رہی ہے، ہم ان دونوں کو اس لئے یکجا چھاپتے ہیں کہ مصنف کے دونوں رنگوں کا اندازہ ہو جائے جب کئی لوگوں نے اقبال کی مشکل پسندی کی شکایت کی تو ہم نے اس اظہار رائے کو اُن تک پہونچا دیا جو جواب انھوں نے دیا وہ یہی تھا کہ جہاں خیالات دقیق اور مشکل ہوں گے وہاں زباں کا آسان ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے اسی بنا پر وہ مرزا کی دشوار پسندی کو نہ صرف معذوری بلکہ ضرورت قرار دیتے ہیں اور یہی برہان اپنے مرغوب انداز کے حق میں رکھتے ہیں، انھوں نے دوسری نظم میں یہ دکھایا ہے کہ آسان نویسی میں بھی بند نہیں۔ جن مسائل کا ہجوم ان کے دل کے گرد رہتا ہے وہ ہمیشہ آسان الفاظ کے لباس میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے۔

غزل

یہ غزل خطیب دہلی ۲۰ مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ بانگ درا میں یہ غزل درج ہے لیکن اس میں تین شعر اصلاح شدہ ہیں اور دو شعر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ شعر "اصلاحات اقبال"

میں مندرج ہیں۔

حذف شدہ اشعار:

تجھے کیا سنائیں ہمنشیں ہمیں موت میں جو مزہ ملا
نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاط عمر دراز میں

کوئی آج مسلم خستہ جاں کو یہ میرا پیام دے
کہ وطن ہے دشمن آبرو تو اماں ہے ملک حجاز میں

دعا

یہ نظم روزنامہ زمیندار لاہور ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ بانگ درا میں ذیل کا شعر حذف کر دیا گیا ہے ؎

آتش نفسی جس کی کانٹوں کو جلا ڈالے
اس بادیہ پیما کو وہ آبلۂ پا دے

حضور رسالت مآب

یہ نظم نظام المشائخ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں نظم کی سرخی "خون شہدا کی نذر سبز گنبد والے آقا کے حضور میں" ہے۔ اس کے پہلے بند کا ایک شعر بانگ درا میں حذف کر دیا گیا ہے جو "سرود رفتہ" میں شامل کر لیا گیا ہے۔

بند سوئم تمدن اکتوبر ۱۹۱۱ء کے دو شعر بانگ درا میں اصلاح شدہ ہے۔

بانگ درا	تمدن اکتوبر ۱۹۱۱ء
حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی	کہا یہ میں نے کہ سچی خوشی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی	....

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

ریاضِ دہر میں ہیں یوں تو رنگ رنگ کے پھول
- - - - - - - - - - - -

غزل

زمیندار ۱۱ر اپریل ۱۹۱۲ء میں یہ غزل شائع ہوئی ہے۔ بانگ درا میں پوری غزل قلم انداز کر دی گئی ہے
"رختِ سفر" میں یہ غزل شامل کر لی گئی ہے لیکن مندرجہ ذیل شعر اس میں نہیں ہے ؎

اڑا کے لائی ہے اے صبا تو جو گیسوئے عنبریں کی نکہت
ہمیں سے اچھی نہیں یہ باتیں خدا کی رہ میں بھی کچھ دیا کر

وطنیت

اس نظم کا ایک شعر بانگ درا میں اصلاح شدہ ہے ؎

بانگ درا	نظام المشائخ جلد ۳، نمبر ۵
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے	- - - - - - - - - - -
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے	حریت اقوام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ایک شعر (اصلاحِ سخن جون ۱۹۰۷ء)

فتنے اٹھتے ہیں تیری کوچے سے
یہ زمین آسمان ہے گویا

ظریفانہ کلام

چند اشعار "خندۂ گل" سے نقل کئے جاتے ہیں جو بانگ درا میں درج نہیں،

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا

میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

غلام ربانی تاباں

غزل

کبھی عیادتِ دل کو جو آرزو آئی
پھر ایک محوِ تغافل کی گفتگو آئی

کسی کی بزم سے اٹھنا بہت گراں تھا مگر
مجھے خوشی ہے وفا آج سرخرو آئی

نہ پیاس کم تھی، نہ مے کم تھی، پھر یہ کیا گزری
کہ تشنہ محفلِ ساقی سے آرزو آئی

ہزار عام ہوئی نکہتوں کی بربادی
چمن کو راس مگر شورشِ نمو آئی

شمیمِ درد سے مہکی ہوئی ہے رات تمام
پھر آج یاد تری زلفِ مشکبو آئی

وہ بدنصیب بھی دیکھے ہیں جن کے حصے میں
بجائے شغلِ جنوں زحمتِ رفو آئی

سروں سے اہلِ چمن کے گذر گئی تاباں
اگر چمن میں کبھی موجِ رنگ و بو آئی

محمد ذاکر

حافظ نبی احمد صاحب مرحوم

نہیں، وہ ان لوگوں میں سے نہیں معلوم ہوتے تھے جو دنیا کو بدل دینے کی قسم کھا کر شمشیر بکف نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں سے وابستہ ہوگئے جن کے لئے عام خیال یہ تھا کہ طعنۂ نایافت سے بے پروا، جماعت کی فلاح کے کام میں تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں! اور اُن کی یہ وابستگی ساری زندگی قائم رہی۔ انھوں نے شاید اپنے آپ کو کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی!

ہمارا بچپن کا زمانہ تھا۔ قاری نعیم اللہ صاحب پانی پتی مرحوم کے مدرسہ تعلیم القرآن میں ہم پڑھتے تھے۔ قاری صاحب مرحوم بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ کے آدمی تھے۔ کبھی کبھی سردیوں میں شکار کو جاتے، حلوے بھی بنتے شاگردوں کو بھی کبھی چکھنے کو مل جاتے۔ کبھی اُن کے حصے ڈال لیتے۔ گرمیوں میں صبح کو آموں کا مربع بنتا۔ تحفہ دسہری کا چھلکا اتارا جاتا۔ گودا باریک باریک کٹتا، چینی کی بڑی قاب یا بڑے پیالے میں دودھ اور برف کے ساتھ ملا کر یہ تیار کیا جاتا۔ شام کو کچھ شاگردوں کو لے کر حضرت بھورے میاں کے مزار کے پاس ڈھلان پر جا بیٹھتے۔ مدرسہ میں ملنے والے آتے رہتے تھے۔ ان آنے والوں میں کچھ کھدر پہننے والے بزرگ بھی ہوتے۔ حافظ فیاض صاحب مرحوم سے ہم وہیں روشناس ہوئے۔ مرحوم چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ آخر میں تو سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ کھدر میں ملبوس، ذرا اُستواں چہرہ۔ چھوٹی سی ڈاڑھی۔ گھر سے باہر کبھی ٹوپی اور ترکی کوٹ کے بغیر نہیں دیکھا۔ چلتے تو نپے تلے قدم۔ انداز سے قطعیت نمایاں۔ مرحوم انجمن جامعہ ملیہ کے حیاتی رکن تھے۔ جامعہ میں آنے پر معلوم ہوا کہ یہ قطعیت کبھی کبھی محتسبانہ رنگ بھی اختیار کر سکتی تھی مگر وہ ضرر پسند نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی محنت اور جماعت سے اُن کی لگن پر غالباً کوئی انکار نہیں کرے گا۔ باوضع آدمی تھے۔ وضعداری کا ذکر آیا تو کتنے باوضع بزرگ سامنے

آنے لگے۔ وہ بھی جن سے تعلق تھا اور وہ بھی جن سے تعلق نہ تھا جنھیں صرف دور سے ہی دیکھتے تھے اور اپنے لئے باعث نشاط تصور کرتے تھے۔ ایسا ہے انسانی دماغ! زلف تخیل کی آوارگی کو کون نہیں جانتا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ کس موقع پر کیا بات خیالوں کی جھنکار کو تیز کرکے آناً فاناً میں خلوت میں جلوت کا سامان پیدا کر دے اور محشر ذہنی برپا کر دے؟ وقت کے نامعلوم رفتار سے بہتے ہوئے دھارے میں کتنے جانے انجانے چہرے، کتنے بھولے بسرے نقوش تیرتے تیرتے ٹھہر ٹھہر جاتے ہیں اور ایک ایک پل میں ایک ایک کائنات پیدا کر دیتے ہیں! جامعہ کے باوضع بزرگوں میں جواب ہم میں نہیں ہیں اختر صاحب بھی تھے۔ کھدر کا کرتہ پاجامہ اور کھدر ہی کی ٹوپی، کھدر ہی کی اچکن۔ موٹے فریم کی عینک، ہاتھ میں چھڑی، متوازن قد اور متوازن بدن، گیہواں رنگ، کلین شیو، پان سلیقہ سے کھایا ہوا، محنت سے نہ اکتانے والا انداز۔ یہ تھے اختر صاحب! انھیں دیکھ کر نفاست اور شائستگی کے الفاظ ذہن میں ابھرتے تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ القاب محض کتابی ہی سمجھے جانے لگے ہیں! روشنی کہاں ہے؟ انسان محض اپنے وجود (!) سے اپنے ہم نفسوں کو کیا دے سکتا ہے؟ کچھ ایسے ہی سوالوں کے کسی جواب کی طرف اشارہ کرتا تھا ان کا متین تبسم!

شاید یہ میں نے غلط کہا کہ وہ یا اور مرحوین ہم میں نہیں ہیں کیونکہ نظروں سے اوجھل ہوجانے والا ہر متنفس وہ کچھ چھوڑ جاتا ہے جس کا احاطہ آگہی و شعور سے کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اور اسی حد تک وہ ہم میں باقی رہتا ہے!

جب کسی ادارے سے کوئی رکن واپس نہ آنے کے لئے چلا جاتا ہے تو ٹھٹک کر سوچنا پڑتا ہے کہ اب ہم کہاں ہیں؟ کیا آنے والے اس درجے کے ہیں کہ جماعتی کام میں استواری باقی رہے گی؟ ہمارا جماعتی کام کیا ہے؟ ہماری منزل کوئی ہے یا نہیں؟ اگلوں کے نقش قدم واضح ہیں یا مبہم؟ یہی اور ایسے بہت سے سوال جماعت کی بقا اور فلاح کے سلسلہ میں ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جماعت کے کسی ایک رکن کا اس طرح جدا ہوجانا ہزار اتفاقی امر سہی مگر یقینی ہے۔ پھول کا حسن، اس کی خوشبو دل و دماغ کو موہ لینے والی حقیقتیں سہی مگر ہماری آنکھ اور پھول کے درمیان فضا کا

نتیجا ہوا سا یہ بھی تو ایک حقیقت ہے! پھول مرجھا کر خاک میں مل جاتا ہے۔ ہر دم رقص کناں عناصر کی امکانی ترتیب سے کسی نامعلوم نظام کے تحت پھر اس کی تخلیق ممکن ہے۔ پھول کی موت اور اس کی پیدائش میں، اپنے حسن کے نکھار میں اس کا اپنا دخل معلوم! انسان بھی اپنی موت اور پیدائش پر اختیار نہیں رکھتا مگر شعور کی ایک خاص منزل پر پہنچنے کے بعد وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوششوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ دل کہتا ہے کہ ایسا بھی بغیر توفیق کے ممکن نہیں ہے۔ توفیق جس کی تشریح و تجزیہ عقلِ محض سے کرنا آسان نہیں ہے۔ عقل کہتی ہے کہ سماجیات اور نفسیات کے اس بکھیڑے میں پڑنے کا یہ موقع نہیں کہ فرد اور ماحول، یا ماحول اور فرد میں کیا رشتہ ہے۔ لیکن ایک رکن کی موت یقیناً جماعت کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے!

مرحوم حافظ نبی احمد حافظ فیاض احمد صاحب مرحوم کے فرزند اور قاری نعیم اللہ مرحوم کے بھانجے تھے۔ بھاری بدن، کسرتی نہیں۔ چہرے پر کالی ڈاڑھی، بہت گھنی نہیں۔ اب اس میں دو ایک سفید بال نظر آنے لگے تھے۔ موٹے موٹے شیشوں کی کالے فریم کی عینک، اچکن اور پاجامہ میں ملبوس۔ آہستہ آہستہ چلتے غالباً بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان رہتے مگر کام جم کر کرتے۔ اور ایسے کام بھی جن کو وہ بآسانی اپنے ماتحتوں سے کرا سکتے اکثر اپنے آپ کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہتمم تھے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے قائل تھے مگر ان کے برتاؤ میں رعونت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہم کتب خانہ کا وقت ختم ہوتے ہوتے پہنچتے۔ اس وقت مرحوم اپنی مخصوص تنبیہ آمیز شفقت سے کام لیتے۔ وقت کی پابندی کا احساس دلاتے۔ نگاہ کی برہمی اور لہجہ کی سختی بس یہیں تک رہتی۔ ہماری خاموشی یا واپسی پر آمادگی پر یہ سب رخصت ہو جاتی کیونکہ وہ خود ہی ہماری مجبوریوں کا ذکر کرنے لگتے اور اکثر خود ہی ہماری مطلوبہ کتب [illegible] سے نکال کر ہمارے نام اجرا کر دیتے۔ ہمیں ناامید نہ لوٹنے دیتے۔ آدمی کو روزمرہ زندگی میں شاید ایسے ہی عمل سلوک اور اعمالِ حسنہ کا پتہ دیتے ہیں!

وہ منصبی اختیارات سے ماتحتوں کو مرعوب کرنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس دور میں جب کہ فرد کی لیاقت کا اندازہ اس کی سندوں یا ڈگریوں سے اور اس کی

منصبی کارکردگی کا اندازہ بسا اوقات اُس کی نمائشی ہنگامہ خیزی کی صلاحیت سے کیا جانے لگا ہے وہ اپنے فرائض کو چپ چاپ ادا کئے جانے کو عبادت سمجھتے تھے اور عبادت کا مفہوم اُن کے نزدیک مطالبوں کا مشینی خانہ پری یا سر سے ایک بوجھ اُتارنا نہیں تھا۔

سنتا ہوں کہ اچھے طبیب کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اسے کتنی مفرد دواؤں پر کامل قدرت ہو کچھ ایسا ہی معاملہ اچھے ادیب کا بھی ہے۔ ایک مرتبہ اردو کے ایک نامور صاحب طرز ادیب سے اچھے طرز تحریر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ موصوف نے فرمایا حقیقی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ لکھنے والے نے اپنی تحریر میں کتنے لفظ استعمال کئے ہیں بلکہ اس میں ہے کہ اسے کتنے لفظوں کے استعمال کا سلیقہ آتا ہے۔ الفاظ ہی مصنف کے اوزار ہیں، ان سے وہ کیسا کیسا کام لیتا ہے اسی میں ہے اس کی حقیقی بڑائی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ملک کے قدیم زمانہ کا اخری کا کام سامنے آئے جو بہت باریک ہو اور تحقیق سے یہ بھی معلوم ہو کہ اُس زمانے میں اتنا باریک کام کرنے کے اوزار نہیں تھے موٹا کام کرنے کے اوزاروں ہی سے اتنا باریک کام کیا گیا ہے تو بھی اس دور کے ان کاریگروں کو برا تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی مہتمم کتب خانہ یا لائبریرین کی حقیقی بڑائی کتابوں کی اس بڑی تعداد پر ہرگز نہیں ہے جو اس کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ نہ ہی اس میں ہے کہ اُس کے کتب خانے کا کتنا بڑا بجٹ ہے بلکہ اس میں ہے کہ اس نے کتابوں کو کس طرح رکھا ہے، رقم کا استعمال کتنے سلیقہ سے کیا ہے اور لائبریری کے ممبروں کی سہولتوں کو کہاں تک نظر میں رکھا ہے۔ جامعہ کے وسائل اور کتب خانہ میں کام کرنے والوں کی کمی اور جگہ کی قلت کو نظر میں رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کس کس طرح حافظ صاحب نے یہ اندوختہ یک لخت لخت کی طرح سمیٹ سمیٹ کر رکھا ہوگا۔ خود اس ذخیرے کو جمع کرنے میں ان کا کتنا حصہ تھا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو کتب خانہ سے قریب اور جامعہ کے مالی وسائل سے واقف تھے یا جن کو فقیروں سوجھیں بنا کر تماشائے اہل کرم دیکھنے کا تجربہ ہوا ہو۔ کتب خانہ سے متعلق اکثر کام وہ خود ہی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اکثر کتابوں کی 'نقل و حرکت' کا انھیں علم رہتا تھا۔ کام کی لگن میں مذہبی رنگ جھلکتا تھا۔

مرحوم ادبی تحقیق کا کام کرنے والوں کے کام میں ذاتی دلچسپی لیتے۔ کتب اور رسائل کی فراہمی میں حتی الامکان ان کی، و بلکہ رہنمائی کرتے۔ ماخذ کی ترتیب میں مشورے دیتے۔ انھیں دکھ تھا کہ کتب خانے کے اراکین کتابوں کی واپسی میں وقت کی پابندی کا خیال نہیں کرتے۔ وہ تادیبی کارروائی کے قائل نہیں معلوم ہوتے تھے بس کڑھ کر رہ جاتے۔ طبعًا وہ خاموشی پسند معلوم ہوتے تھے۔ کئی موقعوں پر میں سمجھتا تھا کہ انہیں بولنا چاہیئے۔ مسئلہ زیر بحث پر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیئے مگر وہ کچھ نہ کہتے۔ نئی روشنی کے لوگ بالعموم اس ادا پر بھناتے ہیں۔ اظہارِ رائے سے بات سمجھانے اور سمجھنے ہی میں آسانی نہیں ہوتی بلکہ نئی راہیں کھلنے کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔ مرحوم کسی واقعہ کا ذکر کر رہے تھے اور اپنے آپ کو گھوٹے لیتے تھے۔ اُن کا لہجہ اور انداز اُن کے دلی قلق کا پتہ دیتا تھا شکوے شکایت کا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حافظ صاحب چھوٹا منہ بڑی بات! آپ جب کوئی بات ادارہ کے لئے مناسب نہیں سمجھتے تو اختیار رکھتے ہوئے بھی اپنی رائے اور اپنا تاثر کیوں پیش نہیں کرتے ہ کہنے لگے کہ میں یہ اچھا نہیں سمجھتا کہ کسی کو امیر یا قائد بھی مان لوں اور پھر اس کے طریقۂ کار پر یا اُس کے کئے ہوئے پر اعتراض بھی کروں۔ ہاں پہلے سے پوچھا جائے تو بات اور ہے۔ میں نے اُن سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ کبھی کبھی قائد کے سامنے اپنی بات کہہ دینا بھی رہروؤں کا مقدس فرض ہو جاتا ہے۔

کردار کی یہ سکوں آشنا لذت مثبت ہے یا منفی ؟ سپردگی کی یہ کیفیت بے عملی کی طرف تو مائل نہیں کر دیتی؟ کیا سپردگی محض کمزور دل اور کمزور دماغ والوں کا سہارا ہی ہے اور بس ؟ کیا یہ خود مثبت یا منفی قدر پیش نہیں کرتی ؟ کیا یہ دوستی کی اُس منزل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نفئ ذات کی انتہا ہے، جہاں سب کچھ دینے اور تجنے کے لئے ہی ہوتا ہے ؟ دینے اور تجنے میں بھی تو سکون حاصل کرنے کی غرض شامل ہو سکتی ہے۔ مگر کیا دردِ دل اعلیٰ ترین صفت نہیں ہے ؟ انفرادیت کو مستحکم کرنا ضروری ہے یا جماعت کی خاطر اپنے سے درگزر کرنا اور خاموش تماشائی بننا ؟ سیاق و سباق کے اعتبار سے ان سوالوں میں سے کچھ کا جواب مختلف ہو سکتا ہے۔ حالات کا تجزیہ کر کے ہی بے لاگ اندازِ نظر بنتا ہے۔ مگر خود اندازِ نظر پر بھی تو حالات (اور شخصیت اور حادثات اور اتفاقات) اثر انداز ہوتے ہیں۔

منظر اعظمی

میر ایک عظیم ہندوستانی شاعر

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

میر کی شعری عظمت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوئیں۔ خود ان کے زمانے سے لے کر اب تک ان کے اندازِ سخن کی حسرت انگیز کوششیں کی جاتی رہیں مگر اشعار میں زخم کی وہ ٹیسیں اور نسیم کی وہ مہک پیدا نہ ہو سکی جو ان کا خاصہ ہے۔ سودا میر سے استادی کی طرف ہوتے رہے مگر نہ ہو سکے اور دوسری طرف نکل گئے۔ مصحفی کو میر کے منہ پر شعر کا دعویٰ پھیکا معلوم ہوا۔ ناسخ نے ان کی شعری عظمت کو اعتقاد و ایمان کی طرح ضروری سمجھا۔ ذوق کو زندگی بھر میر کا انداز نصیب نہ ہو سکا۔ حالانکہ بہت زور مارا۔ غالب نے بھی میر کی استادیٔ ریختہ کو مسلم سمجھا اور ان کی نبوت شعری کی تصدیق کی۔ شیفتہ، جلال، اکبر، تسلیم اور حسرت سبھی کو حسرت رہی کہ کاش وہ ان کے اشعار کی خنکی، نشتریت اور اثر کی مہکتی ہوئی کلیوں کو اپنے دامنِ سخن میں سمیٹ لیں مگر اس سعیٔ خوشگوار میں ان کے دامن جگہ جگہ سے مسک گئے اور وہ تنگیٔ داماں کا نقص نہ سمجھ سکے۔ کسی نے انھیں "نگینِ خاتم سخن آفرینی" کہا۔ کسی نے "استادیٔ ریختہ بروئے مسلم ہست" سمجھا۔ کسی نے انھیں "سرتاج شعرائے اردو" "شہنشاہ تغزل" اور "خدائے سخن" کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ ساری سخن آرائیاں اس وجہ سے تھیں کہ انھوں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ ان کے اشعار میں وہ نشتریت تھی جو ہر صاحب ذوق کے حساس دل میں اترتی رہی۔ انھوں نے دل اور دلّی دونوں کا مرثیہ کہا آپ بیتی میں جگ بیتی پیش کی۔ اور جگر لخت لخت کو جمع کر کے دیوان بنایا لیکن حقیقتاً ان کی عظمت بلند کے آگے غیر شعوری طور پر لوگ اس لئے سرِنیاز خم کرتے رہے کہ "وہ اشعار کو باتیں کہتے تھے۔ ان کی تشبیہات

کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا تعلق عوام سے اصلی اور بنیادی تھا۔ انھوں نے اردو کے ابتدائی رجحانات سے روگردانی نہیں کی۔ انھوں نے اس کو فراموش نہیں کیا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس کی جڑیں ہماری تہذیب، احساساتی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، اسی لئے ان میں ابدیت ہے" اور اسی لئے ان کی شعری درازقدی تک کسی کی سعی و کوشش کے دست نارسا کی پہونچ مشکل نظر آتی ہے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جس زمانے میں مشکل پسندی اور دقت نگاری علمیت اور ادبیت کی شان اور علامت سمجھی جاتی تھی اس عہد میں معمے اور چیستاں کہنا شاید معیار شعر و ادب رہا ہو گر اب جبکہ گفتگوئے عام ہی سخن سنجی کی قدر اول بن گئی ہے ژولیدہ خیالوں اور مشکل پسندوں کی عظمت اور ان کے دیوان کی "تقدیس" پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ جمہوریت، قومیت اور وطن دوستی کے اس دور میں ان لوگوں کی عظمت یقیناً مشکوک ہو گئی ہے جن کے اشعار کے دروبست پر ایرانیت جن کے اشعار کی فضا پر عجمیت اور جن کی سخن سنجیوں کی محرک شہنشاہوں کی خوشامد، جاگیردارانہ ماحول کی عیاش شرافت اور تصنع و تکلف کی رنگین معاشرت رہی ہو۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو میر سے بڑا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ انھوں نے ہندوستانیت سے کبھی اپنا ناطہ نہیں توڑا ان کے اشعار کی فضا اسی ماحول کے بادو باراں سے تر ہے۔ انھوں نے کسی بادشاہ کی خوشامد نہیں کی۔ انھوں نے ہمیشہ عوام سے گفتگو کی یہ الگ بات ہے کہ خواص بھی اسے پسند کرتے رہے۔ وہ اس عجمی ماحول میں عیاشی کیا کرتے۔ اس نے ان کو اتنی چوٹیں اور اتنے گھاؤ بخشے کہ ان کا رواں رواں پھوڑے کی طرح پکتا رہا۔ انھوں نے کبھی تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیا۔ صاف گوئی اور حقیقت پسندی نے ان کو بد دماغ تک مشہور کر دیا اور ان کی تنک مزاجی کے چرچے ہر گلی کوچے تک پھیل گئے مگر انھوں نے جو روش رکھی تھی اس پر آخر دم تک چلتے رہے کبھی دست طمع دراز نہیں کیا اس لئے کہ وہ ہاتھ سرہانے دھرے دھرے ہی سو گیا تھا۔ کسی کی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ حق پسند تھے بقول صاحب "جواہر سخن" "وہ شیشے کا دل اور فولاد کا جگر رکھتے تھے بڑی بڑی کڑیاں جھیل سکتے تھے مگر کڑی بات اٹھا نہ سکتے تھے۔" ایک ایسے شاعر کے کلام بلند کو اگر الہامی کتاب کا درجہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی عظمت آج اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ اردو شعر و ادب پر بدیسی مزاج

سکے خیلوں کی شکایت عام ہو۔ اس کے اشعار کی شعریت کا لوہا تو اب تک سبھی مانتے ہیں اب اس کے لہجے کی نغمگیت اور اس کے اشعار کی وطنی فضا کی عظمت کو تسلیم کرکے "بلندش" کو گنگوتے الہام سمجھنا چاہیئے۔ میر جیسے عظیم ہندستانی شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں ہی آج وطن میں اردو کے سمجھنے اور اس کے وقار کو بلند کرنے میں مدد معاون ہو سکیں گی۔

بلاشبہ عظیم اور آفاقی شاعر کی پہلی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ اس نے حیات و کائنات اور فرد و اجتماع کے تعلق کو کیسے سمجھا اور کیونکر برتا ہے، اور اسے فن کی حسین ترین صناعی کے ساتھ دلوں میں کس حد تک جاگزیں کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ اس کے افکار و خیالات کی صحتمندی نے زندگی، سماج اور ادب پر کہاں تک اثر ڈالا ہے۔ اس نے شعر میں جو سلیقہ برتا اور جو راہ اپنائی قطع نظر اس سے کہ لوگ اس کی پیروی کر سکے یا نہیں اس کو حاصل حسن اور راہ نجات سمجھا جاتا رہا کہ نہیں۔ اس کسوٹی پر اگر ہم دیکھیں تو میر اور غالب دونوں نے حیات و کائنات پر اظہار خیال کیا مگر ان کے یہاں کوئی منضبط فکر نہیں ہے۔ برعکس اس کے منتشر اور متضاد خیالات ان کی پریشان فکری کے گواہ بن گئے ہیں۔ انھوں نے زندگی اور سماج کی کوئی رہنمائی نہیں کی مگر ادب میں اپنا اپنا راستہ تراش گئے ہیں۔ اس ادبی شاہراہ کو بھی کسی نے بذلہ سنجی اور بلند خیالی کے رنگ برنگے قمقموں سے سجایا ہے اور کسی نے خون دل کے چراغ جلائے ہیں۔ ان میں روشنی بھی ہے اور گرمی بھی مگر یہ الاؤ پہلے کے جلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اس کی روشنی کو نکھارا اور گرمی میں تیزی پیدا کی مگر ان راہوں میں نئے آتشکدے تعمیر نہ کر سکے۔ اس معیار پر صرف اقبال پورے اترتے ہیں اور اسی لئے وہ آفاقی شاعر ہیں۔ جہاں تک افکار و خیالات کی بلندی اور پاکیزگی، شعریت، اثر انداز، شگفتگی اور تازگی اور حسن و رعنائی کا تعلق ہے غالب اور میر کی عظمت کی لکیریں متوازی نظر آتی ہیں۔ حالی نے غالب کی شاعری کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ میر کے یہاں بھی کم و بیش ملتے ہیں۔ طرفگی خیالات، جدت مضامین، نئی تشبیہیں، استعارات و تمثیلات کا نیاپن، شوخی و ظرافت، اشعار کا پہلودار ہونا یہ ساری باتیں میر کے "بلندش" میں پائی جاتی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے بھی اگر مرزا غالب نے اخلاق و تصوف، توحید، شکوۂ اہل وطن، مجبوریٔ انسانی، رندی و سرمستی، توکل و درویشی، پاکیزگی و انسانیت کو مہذب پیرائے میں شعر و نغمہ

کا انتخاب [illegible] کیا ہے تو میر کے منتخب کلام میں بھی انھیں سارے مضامین پر اچھوتے اور دلنشیں انداز بیان ہوا اظہار
خیال ملتا ہے۔ اثر انگیزی میں میر غالب سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہیں۔ اس لئے کہ غالب کا شعری آہنگ نشاطیہ
ہے اور جو غم ہے بھی اس کا بھی لہجہ مسرت آمیز ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں طنز و تعریض اور شوخی و ظرافت کا انداز
زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ برعکس اس کے میر کے نغموں کا لہجہ غم انگیز اور دلسوزی کا ہے اور ان کے غم میں بھی بڑی
پاکیزگی اور تاثیر ہے۔ ان کا غم آفاقی ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے بڑی کوئی حقیقت نہیں۔ اس
لئے ان کا آہنگ بڑا فطری اور انسانی ہے۔ اس وجہ سے اس کا اثر بھی گہرا اور پائیدار ہے۔ میر کی باتیں کلیجے
کے آرپار ہو جاتی ہیں اسی لئے محبوب ہیں۔ غالب کی بعض باتوں میں تصنع جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے
اشعار کی فضا عجمی ہے۔ ان سے اجنبیت ٹپکتی ہے۔ مگر میر کے اشعار میں ہندوستانیت رچی بسی ہے۔ اس لئے
ان کا کلام اپنا کلام معلوم ہوتا ہے اور غالب ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ایرانی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ فرق بڑا
ظاہر اور بہت واضح ہے۔ خود ان کے شاگرد عزیز اور ان کی سیرت اور کلام کے زبردست نباض مولانا
حالی کو بھی اس چیز کا احساس تھا اس کو انھوں نے مختلف طریقوں سے مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے۔
ایک جگہ لکھتے ہیں "مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے گراں قدر ہے وہ ان کی فارسی نظم و نثر ہے۔ لیکن
اول تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں
ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں" جن خصوصیتوں سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا
ہیں وہ یہی عجمیت ہے جو ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ اسی طرح ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "شعر کی
بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا ادھر سامع کے دل میں اتر گیا مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں
یہ بات بالکل نہ تھی جیسے خیالات اجنبی تھے ویسے ہی زبان نا مانوس تھی" ۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں "جو
محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص ان کو کبھی نہیں بولتے تا بمقدور وہ
(یعنی مرزا غالب) ان کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان
کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے وہ فوت
ہو جاتا ہے" اس کے برعکس میر کے فارسی آمیز اشعار بھی ہندوستانیت لئے ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار

میں [illegible] کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے میر کو لوگ ہمیشہ سمجھتے ہے۔ [illegible] کو سمجھنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ خود وہ غزلیں جن پر غالب کی عوامی شہرت کا انحصار ہے میر کے تتبع میں کہی گئی ہیں اس لیے مقبول ہوئیں۔ غالب عوام الناس کے محاورے اور الفاظ سے بچ کر رہے مگر میر کا مسلک بقول ان کے یہ تھا کہ "خاقانی اور سعدی کا کلام سمجھنے کے لئے فرہنگ کی ضرورت ہے۔ لیکن میرا کلام صرف اس شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے جو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کی زبان سے آشنا ہو" اسی لئے وہ ہمیشہ کہتے رہے کہ

شعر میرے ہیں سب خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس کے باوجود انھوں نے کبھی وہ زبان استعمال نہیں کی جو نظیر اکبر آبادی نے کی۔ میر نے جیسے ہلکے پھلکے فارسی اور ہندی الفاظ استعمال کئے وہ زبان کی ارتقائی ساخت کے لحاظ سے نہایت مناسب ہیں۔ اسی لئے ان کے الفاظ کی موزونیت اور ان کے سلیقہ شاعرانہ نے ان کی شاعری میں [illegible] پیدا کر دی جو ان کی عظمت کی ضامن بن گئی ہے۔

جہاں تک ہندوستانی [illegible] کا تعلق ہے نظیر اکبر آبادی کے یہاں یہ فضا [illegible] پر چھائی ہوئی ہے، مگر شاعری صرف عوام کی زبان میں گفتگو کرنے کا نام نہیں ہے۔ شاعری کے لئے سلیقہ شاعرانہ ضروری ہے اور یہی چیز نظیر کے یہاں نہیں ہے۔ ان کے یہاں [illegible] رچاؤ نہیں۔ ان کے یہاں کوئی بات دل کی بات نہیں محض تفنن طبع کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ان میں الہامی اثر نہیں۔ زبردستی یا ضرورتاً کہی ہوئی شے کا احساس ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ اس معنی میں عوامی شاعر ہیں کہ انھوں نے عوام کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ عوام کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے غم کو سمجھا اور اپنایا ہے۔ مگر شاعری محض عوام کو خوش اور مطمئن کرنے کا نام نہیں۔ شاعری پوری انسانیت کے درد کو سمجھنے کا نام ہے یہی چیز نظیر کے یہاں نہیں اور اسی شے نے میر کو عظیم بنا دیا ہے۔ نظیر کو الفاظ کے انتخاب کا بھی سلیقہ نہیں۔ انھوں نے شاعری کو عوامی بنانے کے لئے عوام کے ہر الٹے سیدھے لفظ کو استعمال کر ڈالا ہے جس سے شعر کی عظمت [illegible] اور [illegible] اور انداز ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری میں جو ہمہ گیریت [illegible] اور وہ [illegible] عوامی [illegible] اور [illegible] کر [illegible] وقتی چیز ہو کے رہ گئی

ہے۔ اس میں شعری شرافت اور فنی شائستگی نہیں اس لئے اس میں ابتذال اور سوقیت آگئی ہے اور وہ ذوق شائستہ پر گراں گذرتی ہے۔ عوامی گفتگو کرنا اور چیز ہے عوام سے گفتگو کرنا کچھ اور ہی ہے۔ نظیر عوامی بولی بولنے کی وجہ سے مرتبۂ عظمت سے گر گئے ہیں اور میر عوام سے گفتگو کرنے کے سبب عظیم ہو گئے ہیں۔ غالب اور نظیر سے میر کا موازنہ کرنا مقصود نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کو بلندیٔ تخیل اور فلسفیانہ افکار کے ناطے اور دوسرے کو عوامی تعلق اور شاعر عوام ہونے کے سبب سے جو عظمت ملی (یہی نہیں بلکہ اس میں بھی غلو کیا گیا اور کسی کے کلام کو وید مقدس کی طرح الہامی مان لیا گیا اور کسی کو اپنی ذات میں مستقل اسکول اور ایک الگ "دور شاعری" بنا دیا گیا) ممکن ہے کھینچ تان کر وہ صحیح ہو مگر شعر کے اثر و تاثیر اور اشعار میں ہندوستانی تہذیب و ماحول کے مہذب رچاؤ کے لحاظ سے میر کے منتخب کلام سے مقدس کوئی کلام نہیں نظر آتا اور حقیقتاً وہی صرف ایسے شاعر ہیں جو اپنی ذات سے ایک مستقل انجمن شعر و نغمہ ہیں اور اسی لئے میں انھیں ایک عظیم ہندوستانی شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ میر عظیم شاعر بھی ہیں اور عظیم ہندوستانی بھی۔

میر کے کلام میں جو فنی سلیقہ اور اس میں جو زود اثری اور نشتریت ہے وہ مسلمہ حقیقت ہے مگر ان کے کلام کے ہندوستانی عناصر اور ہندی کے خوبصورت الفاظ کے خوبصورت استعمال نے جو لطف و عظمت پیدا کر دی ہے اس کو کچھ اور اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ میر نے اگرچہ فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں بھی استعمال کیں مگر بقول ایک نقاد کے " ان کا کلام فارسی کی کاربن کاپی" نہیں ہے۔ اگر انھیں فارسی کی شیرینی عزیز ہے تو انھوں نے ہندی کی نمکینی سے بھی اپنا دستر خوان آراستہ کیا ہے"۔ میر نے اصلاح زبان میں بھی حصہ لیا اور بہت سے ایسے الفاظ اور ترکیبیں ترک کر دیں جو بزبان دکنی "لچر" سی معلوم ہوئیں مگر فارسی اور ہندی کے خوبصورت الفاظ کو کسی قیمت پر بھی ترک نہیں کیا۔ اس سے جہاں ان کی لسانی واقفیت اور گہری علمیت کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو کو ہندوستانی ہی رہنے دینا چاہتے تھے اس لئے وہ سارے الفاظ جن سے ہندوستانی تہذیب کی عکاسی ہوتی تھی اس کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا اور یہی چیز ان کی شاعری کو بلند بنا گئی۔ وہ الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں ایک خاص سلیقہ شاعرانہ رکھتے تھے۔ الفاظ و تراکیب پر گفتگو کرتے ہوئے ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں کہ "چہارم آنکہ

ترکیبات فارسی می آمد۔ اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آں جائزاست و ایں را غیر شاعر نمی داند ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف بسلیقہ شاعری است۔ مختار فقیر ہمیں است۔ اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد" (نکات الشعراء) نواب جعفر علی خاں اثر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "فارسی کی بہت سی ترکیبیں جن کے وضع کرنے کا سہرا غالبؔ کے سر باندھا جاتا ہے میرؔ کی دست نگر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ طرز جو غالبؔ سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی بھی داغ بیل میرؔ ڈال گئے تھے" اسی طرح دکنی اردو کی بہت سی وہ ترکیبیں اور الفاظ جو ان کے پیشرو بڑے دھڑلے سے استعمال کرتے رہے میرؔ نے ان کو ترک کر دیا اور ان کی جگہ خوبصورت الفاظ استعمال کئے۔ اس کے باوجود چونکہ زبان ارتقائی مرحلے میں تھی ان کے یہاں بھی کچھ ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو بعد میں ترک کر دیئے گئے۔ مگر ان کے وہ ہندی الفاظ جو آج بھی مقبول و مطبوع ہیں اور جن کو غالبؔ و ناسخؔ نے ترک کر کے مردود قرار دیا تھا ان کا ترک ہی اردو کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس چیز کا احساس آج شدت سے ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے میرؔ کو یاد کیا جا رہا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے جن میں ہندی الفاظ اپنی پوری شان بے تکلفی اور معصوم سادگی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ پھر فیصلہ کیجئے کہ ان کا ترک اولیٰ تھا یا عدم ترک :۔

۱۔ کچھ ٹھور بھی تھی اس کی کچھ اس کا ٹھکانا تھا

۲۔ دوں کس کو دوش دشمن جانی تھی دوستی

۳۔ اس سمے میں دیکھنے ہم کو بہت آیا کرو

۴۔ تنکے سے ہم پربت ہوئے

۵۔ رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا

۶۔ انچھر ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

۷۔ موند کر آنکھیں اگر تو دل کی طرف ٹک دھیان کرے

۸۔ جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

۹۔ دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں

۱۰۔ چتون کے کب ڈھب تھے ایسے

۱۱۔ چلتا پھرتا ہے پر اداس اداس

۱۲۔ کھڑے ہے کس کے تو نے اے میر دل لگایا

۱۳۔ محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

اس کے علاوہ بوگ، بجنا، سنسار، سمرن، بھسم، اچرج اور ہنکار وغیرہ ہزاروں الفاظ خوبصورت طریقے سے استعمال کئے گئے ہیں۔ بعض اشعار ایسے ہیں جن میں ہندی الفاظ ہی سب کچھ ہیں۔ اس سے بہتر اداس سے خوبصورت استعمال ممکن نہ تھا کوئی اور مترادف لفظ اس جگہ وہ اثر اور وہ حسن پیدا نہ کرسکتا جو ان الفاظ نے کیا۔ کاش یہ روایت اسی طرح ارتقا پذیر رہتی تو آج اردو کو وہ دقتیں پیش نہ آتیں جو اس وقت پیش آرہی ہیں۔ چند شعر دیکھئے ؎

اب تو دفا و مہر کا مذکور ہی نہیں	تم کس سمے کی کہتے ہو ہے یہ کہاں کی بات
آنکھوں سے پوچھا حال دل کا	اک بوند ٹپک پڑی لہو کی
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں	داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے	پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے
کیا حال ہوگیا ہے ترے غم میں میر کا	دیکھا گیا نہ ہم سے ٹک اس جواں کی اور
پھاڑ ا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر	کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں
تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی	ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

جہاں تک اشعار کی ہندوستانی فضا کا تعلق ہے زیادہ تر اشعار اسی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بعض اشعار کی تلمیحیں اور استعارے بھی یہیں کی خاک کی خمیر سے بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ساون، رام، لنکا، یہاں کی برسات، دیوالی، ہولی سب کا ذکر اشعار کے پردے میں اس طرح کیا ہے کہ یہ چیزیں اپنی معلوم ہوتی ہیں چند شعر دیکھئے ؎

عجب نہیں ہے نہ جانے جو میر چاہ کی ریت ۔۔۔ سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت

آتش عشق میں راون کو جلا کر مارا ۔۔۔ گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے ۔۔۔ پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا ۔۔۔ داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

میر کے یہاں ہندی اور فارسی کے امتزاج سے جو تراکیب مستعمل ہوئی ہیں ان کے حسن میں شبہ کوئی سخت کافر ہی کرے گا ۔ مگر اس کو بھی قواعد کے ٹھیکیداروں نے پسند نہ فرمایا ۔ مثلاً میر نے 'بیڑۂ پان'، 'جام نین'، 'غنچۂ مکھ'، 'کم گھیر' اور 'شیریں بچن' جیسی تراکیب استعمال کیں مگر انھیں اعتراضات کے بھاڑ میں جھونک دیا گیا ۔ میر نے قیام لکھنؤ کے دوران جو شکارنامے اور مثنویاں تصنیف کیں ان میں ہندوستان کے موسموں، پھلوں، جانوروں اور ہندوستانی معاشرت کی بڑی خوبصورت عکاسی ملتی ہے ۔ اس سے ان کی ہندوستانیت سے شیفتگی اور ہندوستانی تہذیب سے واقفیت اور محبت کا پتہ چلتا ہے ۔ اپنی مشہور مثنوی 'شعلۂ عشق' میں انھوں نے پرسرام اور اس کی بیوی کی داستان میں ہندوستانی زندگی کی خوبصورت تصویریں اتاری ہیں ۔ 'شدت باراں' اور 'گھر کا حال' میں جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہندوستانی آب و ہوا اور یہاں کے طرز بود و باند کی کامیاب نقش گری ہے ۔ 'مثنوی در جشن ہولی' میں ہولی کے لوازمات اور جذبات کی بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے اور یہ ترجمانی وہی کر سکتا ہے جسے محض اس معاشرت سے واقفیت ہی نہ ہو بلکہ اس کے انگ انگ میں اس کی خوشبوئیں رچی بسی ہوں ۔ میر کے اشعار کا عام لہجہ بالکل عام بول چال اور محاورے کا ہے لیکن چونکہ اس میں خون جگر کی آمیزش ہو گئی ہے اس لئے اس میں بلا کی تاثیر ہے اس بول چال میں بھی بڑا سلیقہ اور حسن انتخاب کا بہترین ذوق پایا جاتا ہے ۔ خواجہ احمد فاروقی نے غلط نہیں کہا ہے کہ " ان کی زبان کھڑی بولی کی نکھری شکل ہے ۔ اس میں ہندوستانی عناصر ہیں ۔ اس کا تعلق عوام سے بہت گہرا ہے، لیکن اسے خوش مذاقی اور سلیقہ کی چھلنی میں چھانا گیا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کسی ایسے لفظ کی آمیزش نہیں جو غیر فصیح ہو یا غزل کے لئے گراں بار ہو ۔ میر جس چیز کو سلیقہ اور مذاق کہتے ہیں اس میں لسانیات اور فصاحت کے اصولوں کی واقفیت شامل ہے ۔ ان کا نظریۂ فن بے شک

اور سخت گیر نہیں ہے۔ اس میں زبان کی فطری صلاحیتوں کا احترام شامل ہے۔ زبان کے معاملے میں میر کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی۔ وہ کھرے کھوٹے کو پہچانتے تھے لیکن اپنا رشتہ عوام سے منقطع نہ کرتے تھے۔ ایسے عظیم ہندوستانی شاعر کی بارگاہ عقیدت میں تحسین و آفریں کے جتنے بھی پھول نچھاور کئے جائیں کم ہیں۔

چاہئے اہل ہنر میر کو استاد کریں

بہت دن ہوئے میں نے درخواست کی تھی کہ جن اصحاب کے پاس مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے خطوط ہوں، وہ انھیں (اصل یا ان کی نقل) میرے پاس بھیج دیں، تاکہ انھیں "مکاتیب مولانا آزاد" میں شامل کیا جاسکے، جو زیر ترتیب ہے۔ میری اس درخواست پر بہت سے احباب نے لبیک کہا اور خطوط بھیج دیئے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک بہت سے اصحاب نے معاملے کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور خطوط نہیں بھیجے۔ میں دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ مولانا کے خطوط جلد از جلد بھیج دیئے جائیں۔ یوں وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے، اور افراد کے پاس پڑے رہنے سے ان کا تلف ہو جانا یقینی ہے۔ اصل خطوط کام ختم ہو جانے پر واپس کر دیئے جائیں گے

مالک رام

(ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی)

سید احتشام احمد ندوی

تدوین احادیث کا ایک تاریخی جائزہ

احادیث کی تدوین مرتب طور پر حضورؐ کے دور میں نہیں ہوئی بلکہ احادیث صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ تھیں، پھر بھی اتنی بات یقینی ہے کہ بہت سے صحابہ کرام آنحضرتؐ ہی کے زمانہ میں نجی طور پر احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور ذاتی طور پر ان کے پاس احادیث کے مجموعے موجود تھے[1]، بیہقی نے "المدخل" میں عروہ بن زبیر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر نے احادیث کو جمع کرنے کا خیال کیا اور مشورہ کے بعد یہ کام شروع کر دیا مگر اس بارے میں ایک ماہ تک سوچتے رہے بالآخر ایک دن انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ مجھ کو یہ خیال آتا ہے کہ میں حضورؐ کی احادیث کو جمع کر دوں لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امت کی توجہ کتاب اللہ سے ہٹ جائے اور اس طرف ہو جائے جیسا کہ گذشتہ قوموں میں ہو چکا ہے لہٰذا میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو ملانا نہیں چاہتا۔

حضرت عمر کے زمانہ کے لحاظ سے یہ اقدام صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس دور میں لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے تھے اور قرآن مجید ہی ان کا محور فکر تھا اور ان کے عقیدہ کی بنیاد بھی، ایسی صورت میں حضرت عمر نے مناسب سمجھا کہ لوگوں کی توجہ براہ راست قرآن ہی کی جانب رہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس کا خیال آیا کہ احادیث نبوی جمع کی جائیں انھوں نے ابوبکر

۱۔ اردو میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے صحابہ کرام کے مرتب کردہ احادیث کے تمام مجموعوں کو اپنی کتاب "احادیث نبوی کے اولین صحیفے" میں جمع کر دیا ہے۔

بن حزم کو جو کہ مدینہ کے حاکم اور قاضی تھے بلوایا اور ان سے فرمایا کہ دیکھو حضور کی جتنی احادیث تم کو ملیں انھیں لکھ لو۔ مجھ کو ڈر ہے کہ علم علماء کے ساتھ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے محض ایک ہی حاکم کو نہیں بلکہ بقول ابونعیم کے تمام صوبوں کے گورنروں کو فرامین بھیجے کہ حضور کی احادیث جمع کی جائیں۔ ابن حزم نے قاسم بن محمد بن ابی بکر (متوفی ۱۰۲ھ) اور عمرہ بنت عبدالرحمان انصاریہ (متوفی ۹۸ھ) کی احادیث جمع کیں۔ مدینہ کی دوسری احادیث محمد بن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) نے جمع کیں جن کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز لوگوں سے ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ زہری کے پاس جاؤ کیونکہ اب روئے زمین پر اتنا بڑا عالم سنت اور کوئی موجود نہیں۔ امام مسلم نے فرمایا کہ امام زہری کے پاس ۹۰ احادیث ایسی ہیں جن کا دوسروں کو علم نہیں۔ امام زہری کے زمانہ میں اکثر اہل علم نے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر امام زہری نہ ہوتے تو بے شمار احادیث رسول ضائع ہو جاتیں۔ امام زہری نے جس انداز سے احادیث کی تدوین کی وہ اس طرز کی نہ تھی جس طرح امام مسلم اور امام بخاری نے کی بلکہ امام زہری اقوال صحابہ، فتاویٰ اور احادیث سب غیر مرتب انداز میں لکھتے تھے اور بیان فرماتے تھے، یہ اس وجہ سے تھا کہ ان کا دور بالکل ابتدائی تھا جو طلبائے حدیث ان کی خدمت میں آتے ان کو اکثر وہ لکھے ہوئے احادیث کے اجزاء دیتے۔ اس طرح تدوین کی ابتداء میں امام زہری کو غیر معمولی عظمت حاصل ہے۔

امام زہری کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں احادیث پر تیار ہوئیں جو خود مؤلفین کے ناموں سے معروف ہیں:

مکہ: ابن جریج (متوفی ۱۵۰ھ)، ابن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ)

مدینہ: سعید بن ابی عروبہ (۱۵۶ھ)، ربیع بن صبیح (۱۶۰ھ)، امام مالک (۱۷۹ھ)

بصرہ: حماد بن سلمہ (۱۷۶ھ)

کوفہ: سفیان ثوری (۱۶۱ھ)

شام: ابوعمرو الاوزاعی (۱۵۶ھ)، بواسطہ ہشیم (۱۸۸ھ)

خراسان: عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ھ)، یمین بن معمر (۱۵۳ھ)

۲۳ : جریر بن عبدالحمید (۱۸۸ھ)

اس سے یہ بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ تدوین حدیث عالم اسلامی میں ایک تحریک کی شکل میں شروع ہوئی اور مکہ سے شام و خراسان تک کے دور و دراز علاقوں میں یہ کام پوری سرگرمی کے ساتھ جاری تھا۔ اسی عہد میں سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) لیث بن سعد (۱۷۵ھ) اور شعبہ بن حجاج (۱۶۰ھ) نے بھی احادیث پر کام کیے۔ مذکورہ تمام حضرات معاصرین تھے اور اس کا اندازہ دشوار ہے کہ پہلے کس نے کام کیا۔ ان تمام حضرات نے تابعین کے فتاویٰ، صحابہ کے اقوال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سب ایک ساتھ جمع کردیں البتہ شعبی نے ابواب کو تقسیم کرکے ہر باب کی حدیث اسی باب میں رکھی

تیسری صدی ہجری احادیث کی منظم طور سے تدوین کا زمانہ ہے جس میں عظیم محدثین پیدا ہوئے اور اسی دور میں "مسانید" کے طریقہ پر احادیث کو مرتب کیا گیا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ ہر صحابی سے جتنی مرویات تھیں ان کو ان کے موضوع کے اختلاف کے باوجود ایک باب میں جمع کردیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے یہ طرز عبداللہ بن موسیٰ، مسدد بصری، اسد بن موسیٰ اور نعیم بن حماد خزاعی نے اختیار کیا۔ اسی طریقہ کو "حفاظ حدیث" نے بھی ترجیح دی۔ امام احمد بن حنبل نے "مسند احمد" اسی طرز پر مرتب کی۔ امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ نے یہ اچھا کیا کہ فتاوی اور صحابہ کے اقوال الگ کردیئے اور صرف حضورؐ کی احادیث کو اپنی کتابوں میں شامل کیا۔ مگر ان حضرات نے صحیح و ضعیف، دونوں طرز کی احادیث جمع کیں اس لئے طالب حدیث کے لئے صحیح حدیث کی شناخت ایک مسئلہ بن جاتا تھا۔

اس کے بعد امام محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ) کا دور آتا ہے انھوں نے یہ کوشش کی کہ احادیث کو جمع کرنے میں ایک نئی راہ اختیار کریں چنانچہ انھوں نے صرف صحیح احادیث کا انتخاب کیا اور ضعیف احادیث کے قریب بھی نہ گئے۔ ان کی کتاب "الجامع الصحیح" مشہور و متداول ہے۔ امام بخاری کی پیروی ان کے معاصر اور شاگرد امام مسلم (۲۶۱ھ) نے بھی کی۔ ان دونوں محدثین کے بعد پھر صحیح احادیث کا انتخاب اور جمع کرنے کا رواج عام ہوگیا اور سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ) نسائی (۳۰۳ھ) جامع ترمذی (۲۷۹ھ) اور سنن ابن ماجہ (۲۷۳ھ) وغیرہ صحیح کتب احادیث

مرتب کی گئیں ان کتابوں میں گذشتہ تمام احادیث آگئی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں درحقیقت اسی نہج پر کام جاری رہا جو تیسری صدی میں شروع ہوا تھا۔ امام سلیمان بن احمد طبرانی (۳۶۰ھ) نے تین کتابیں تالیف کیں "معجم الکبیر" میں انھوں نے صحابہ کے نام کو حروف کی ترتیب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پھر "اوسط" اور "اصغر" معجم ہیں جن میں شیوخ کا ذکر حروف کی ترتیب سے کیا ہے۔ دارقطنی (۳۸۵ھ) نے اسی دور میں اپنی "سنن" تالیف کی۔ ابن حبان بستی (۳۵۴ھ) ابن خزیمہ (۳۱۱ھ) اور طحاوی بھی اس دور کے ممتاز محدثین میں سے ہیں۔ اس کے بعد پھر احادیث کی تدوین تکمیل کو پہونچ گئی اور سوا استدراک کے اور کوئی کام باقی نہ رہا مثلاً ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری نے "المستدرک" مرتب کی اس میں انھوں نے بتایا کہ بخاری و مسلم نے احادیث صحیحہ کے انتخاب کے جو شرائط مقرر کئے تھے ان پر بعض احادیث پوری اترتی ہیں مگر ان کو وہ لینا بھول گئے۔

(ملخص از "السنۃ" مصنفہ ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی، دار العروبۃ (مصر)، ص ۱۲۱-۱۲۵)

تبصرہ و تعارف

"نذرِ عرشی"

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام اور کام محتاجِ تعارف نہیں۔ ۲۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو ان کی اکسٹھویں سالگرہ کے سلسلہ میں سپرو ہاؤس، نئی دہلی میں ایک تقریب ہوئی اور اس موقع پر ان کے دوستوں اور قدرشناسوں نے ایک مجموعۂ مضامین ان کی نذر کیا، اس مجموعے کا نام "نذرِ عرشی" ہے، یہ گویا ان کے علمی کارناموں کا اعتراف اور اس حقیقت کا اثبات ہے کہ شوق اور لگن سے کام کرنے والوں کی بہرحال قدر ہوتی ہے .... اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کے بغیر جو کام کیا جاتا ہے وہ خود اپنا انعام ہوتا ہے۔

"نذرِ عرشی" کے مرتب مالک رام اور مختار الدین احمد آرزو ہیں۔ مجلسِ نذرِ عرشی جس میں ملک کے مشہور دانشور، عالم اور ادیب شامل تھے، اس کی ناشر ہے اور قیمت اس کی چالیس روپے ہے، یہ مجموعۂ مضامین اس قدر دیدہ زیب، اس کی کتابت و طباعت اتنی خوشنما اور پروف ریڈنگ اس قدر صحیح ہے کہ بے ساختہ زبان سے 'واہ' نکل جاتی ہے، اردو میں بہت کم کتابیں ہیں جو اس قدر اہتمام سے چھاپی گئی ہیں، عرشی صاحب کا تحقیقی و تنقیدی کام اتنا وقیع اور معیاری ہے کہ ہماری زبان بجا طور پر اس پر فخر کر سکتی ہے اور "نذرِ عرشی" میں جس معیار کے مضامین ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں ہر قسم کے موضوعات کا حق ادا کرنے کی صلاحیت ہے، شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا مختصر مگر بلیغ مقدمہ ہے، اس کے بعد "تذکرہ" کے عنوان کے تحت چار مضمون ہیں جن سے عرشی صاحب کی شخصیت، خاندان، حالات اور نگارشات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مالک رام صاحب کا مضمون "ذکرِ عرشی" اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس سے عرشی صاحب کے فیملی پس منظر اور ان کے ذہنی نشو و نما کو سمجھنے میں بڑی مدد

ملتی ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین کے مضمون "عرشی ـــ شمع علم ولقین، دلیل سحر" ایک عالم کا ایک عالم کو خراج تحسین ہے، اکبر علی خاں کا مضمون "نگارشات عرشی" گویا تفصیل ہے عرشی صاحب کی ان تمام تحریروں اور علمی کاموں کی جن کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور علمی کام کرنے والوں کو حوصلہ ملتا رہے گا۔

مقالات کے تحت اردو میں انیس اور انگریزی میں آٹھ مقالے ہیں، مقالہ نگاروں میں قاضی عبدالودود، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر حمید اللہ، عندلیب شادانی، محمد زبیر صدیقی، آل احمد سرور، سید عبداللہ، مسعود حسن رضوی ادیب، شوکت سبزواری اور خلیق احمد نظامی جیسی شخصیتیں ہیں، مستشرقین میں آربری، مونٹ گمری واٹ، جولیس جرمانوس وغیرہ ہیں جنھوں نے مقالات لکھ کر اردو زبان کے اس محقق کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ موضوعات میں فن تعمیر، فارسی ادب، فقہ، تصوف اور فلسفہ، اردو شاعری اور لسانیات وغیرہ سبھی کچھ ہے ـــ الغرض یہ وہ حسین گلدستہ ہے جس کی رنگارنگی اور دلآویزی عرصہ تک علمی حلقوں میں موضوع گفتگو رہے گی۔

کم وبیش سبھی مقالے معیاری اور ٹھوس ہیں اور اپنے موضوع سے متعلق فکر انگیز اشارے کرتے ہیں جن کی روشنی میں مزید کام کیا جا سکتا ہے، پروفیسر محمد مجیب کا مضمون "قطب کی عمارتوں کا مجموعہ" زبان، ادب اور فن تعمیر کی باریکیوں کے اعتبار سے اردو زبان کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہے، اردو میں اس موضوع پر اس طرح نہ تو لکھا گیا ہے اور نہ عرصہ تک لکھا جا سکے گا، قطب کی عمارتوں کے چپہ چپہ کو انھوں نے برسوں پڑھا اور اس پر غور کیا ہے، پتھر اور چونے کے ان منتشر کھنڈرات میں اپنی نظر، تصور اور ذہن رسا سے انھوں نے ماضی کی بازآفرینی کی ہے، اور اس کا رشتہ حال سے جوڑ دیا ہے، یہاں کی ٹوٹی محرابوں اور بوسیدہ ستونوں میں، انھوں نے اپنی Imaginative understanding سے ایک غیر فانی حسن اور پر وقار سکون محسوس کیا ہے جو اسی مورخ کا حصہ ہوتا ہے جسے تاریخ کے تہذیبی کارناموں میں ایک تسلسل اور انسانی ذہن کی رنگا رنگ جولانیاں نظر آتی ہیں۔ فن تعمیر ایک ٹکنیکل موضوع ہے، مجیب صاحب نے تاریخ اور ادب کی آمیزش سے اس فن کی اصطلاحوں میں جان ڈال دی ہے جو بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اس مقصورے (مسجد قوت الاسلام کے) کی اونچی اور چار بغلی محرابوں میں سے تین اب تک موجود ہیں، جب اونچی محراب بنی تھی، تو اس میں سے مسجد کا نیم تاریک اندرونی حصہ نظر آتا ہوگا اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا ہوگا کہ اس کے اندر جاکر وہ ایسی جگہ پہونچے گا جہاں سکون ہوگا، روحانیت کا کیف ہوگا، طبیعت پر عبادت کا ذوق طاری ہوگا۔ اب ہمیں اس محراب کے اندر سے آسمان نظر آتا ہے، لیکن تنہائی اور زمانے کے دستبرد نے اس کے حسن میں نئے اور شاید زیادہ گہرے معنی پیدا کر دیئے ہیں...... اور واقعی اگر ہم اس محراب کے حسن کو اپنے اندر سرایت کرنے دیں، تو ہم محسوس کریں گے کہ وہ بہت سی شکلوں اور کیفیتوں کی ترجمانی کرتی ہے، اس میں وہ کامل سکون ہے جو گوتم بدھ کے مجموں کی شان ہے، اس میں ایلی فینٹا کے غاروں کی ترموتی کا ابدی مراقبہ ہے، اس میں صوفی کا وجد ہے، عاشق کامل کا صبر، اور وہ دلآویزی جسے بیان کرنے کی آرزو شاعروں کے دل کو حسرت سے آباد رکھتی ہے، یہ محراب فن تعمیر اور سنگ تراشی سے بالاتر کوئی چیز ہے ـــــ ایک دروازہ جس سے گذر کر ہم تصورات اور احساسات کی ایک لامحدود فضا میں پہونچ جاتے ہیں۔"

عندلیب شادانی کے اصلی نام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے، ان کا نام وجاہت حسین ہے اور اردو اور فارسی ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں، ان کے مقالے کا عنوان ہے: "رباعیات شیخ ابوسعید ابوالخیر کا مصنف" یہ عنوان بذات خود چونکا دینے والا ہے، لیکن اس مضمون کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح شیخ موصوف کی طرف، جنھوں نے بقول شادانی "اپنی زندگی میں ایک شعر اور رباعی کے علاوہ کبھی ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا" سیکڑوں رباعیوں کی تخلیق منسوب کر دی گئی، مزید حیرت اس پر ہے کہ اس پر یقین رکھنے والوں میں نامور فضلاء، محققین اور مصنفین شامل ہیں۔ شادانی نے تحقیق و تنقید، روایت و درایت اور معتبر تذکروں اور دواوین کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ شیخ ابوسعید پر "شاعری" کا الزام لگانا درست نہیں۔ اس تحقیق

آل احمد سرور نے اپنے مقالے "نظم کی زبان" میں بڑے بلیغ اشارے کئے ہیں، لیکن بعض جگہ یہ اشارے واضح نہیں ہیں۔ سرور صاحب کو اس کا پورا احساس ہے کہ اردو کے عام شاعر کی تہذیبی فضا محدود ہے، یہ بات صحیح ہے، لیکن مقالہ نگار نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ اردو کے عام شاعر کا علم بھی محدود ہے، ہمارا سماج سیاسی تبدیلیوں سے گزرتا رہا ہے، معاشی تغیرات بھی ہوتے رہے ہیں، اور ان سب کا اثر فرد اور طبقوں پر پڑا ہے، لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شاعروں اور دانشوروں کو کبھی خیالات اور نظریات کی ایسی کسی جنگ سے نہیں گذرنا پڑا جو صدیوں کے مسلمہ معتقدات کی بنیادیں ہلا دیتی ہے اور جس کی گود میں سماجی اور معاشی انقلابوں کی پرورش ہوتی ہے۔ ہمارے جن شاعروں کو ذہنی غذا کی جو تھوڑی بہت ضرورت ہوتی ہے، وہ اسے مغرب سے حاصل کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے کئی ضروری اجزاء وہیں رہ جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس ناقص غذا کو وہ ہضم نہیں کر پاتے اور ان کی ذہنی صحت پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔

ہمارے عام شاعر کی ایک محرومی اور ہے اور وہ یہ کہ اُسے اپنے تہذیبی سرمایے سے بھی پوری واقفیت نہیں، ایسی صورت میں جدید نظموں کے نت نئے تجربے اکثر ایک محدود طبقے کے لئے وقف ہو کر رہ جاتے ہیں، یا وہ ایک چیستاں بن جاتے ہیں جنھیں نہ تو دھرتی کا کسان سمجھ سکتا ہے اور نہ خلا کے سیاح۔

اقبال اور دو ایک ترقی پسند شاعروں کو چھوڑ کر جن کے یہاں کائنات اور علم کے متعلق ایک واضح نظریہ ملتا ہے۔ عام طور پر ہمارے شاعر نہ تو کوئی واضح مقصد رکھتے ہیں اور نہ یہ صلاحیت کہ ان محرکات کی اساس کو سمجھ سکیں جو نت نئی تبدیلیوں کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں اور جن کا اثر نہ صرف سماج پر بلکہ فرد کے نفسیاتی اور ذہنی عمل پر بھی پڑتا ہے۔

اس مجموعۂ مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپ مضمون "فنون اور تذکرۂ اسلام" ہے۔ اس کے مصنف عبدالرحمن چغتائی ہیں۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بڑی روا روی میں لکھا گیا ہے، دوسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس میں دعوے زیادہ ہیں اور ان کے حق میں

دلیلیں بہت کم۔ مثلاً یہ دعویٰ کہ "آرٹ میں اسلام کا ترکہ اسلام کے جمالیاتی نظریوں کے عین مطابق ہے" صحیح ہو سکتا ہے لیکن اسلام کا جمالیاتی نظریہ کیا ہے؟ اس سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، یا یہ جملہ "غرض فنون میں اسلام کا ترکہ وہ عالمگیر جذبہ ہے جس سے ہر تہذیب متاثر ہوئی ہے" فنون میں اسلام کے پیدا کئے ہوئے "عالمگیر جذبے" کی کیا کارفرمائی رہی، اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ دراصل یہ وہ ذہن ہے جو مذہبی طرز کی رومانیت سے سرشار رہتا ہے اور حقائق سے بچتا ہے۔

"ندر عرشی" کے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ ، قیمت: چالیس روپے

مضامین رشید مصنفہ: پروفیسر رشید احمد صدیقی

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ، مجلد مع گرد پوش ، صفحات ۲۷۹ ۔سن اشاعت: ۱۹۶۴ء ، قیمت: چھ روپے

عرصہ ہوا مکتبہ جامعہ دہلی سے رشید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تھا، اب انجمن نے اسے نئی ترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے، پہلے مجموعہ کے مضامین "چند امامون"، "مضمون" اور "لڑ" نکال دیے گئے ہیں، ان کے بجائے "دعوت" اور "سرگزشت عہد گل" شامل کئے گئے ہیں۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے اور رشید صاحب نے "کچھ اپنے اور کچھ ان مضامین کے بارے میں" جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ایک اضافہ ہے اور یہ "اضافہ" اگرچہ مختصر ہے مگر طرز انشار اور بعض بے ساختہ، پر لطف لیکن ایک گہری حقیقت لئے ہوئے فقروں کے لحاظ سے دلچسپ ہے، رشید صاحب نے اپنی طبیعت کے خلاف ارباب انجمن کے اصرار پر اپنے مضامین پر نظر ثانی کی، وہ لکھتے ہیں کہ "لکھنے کے بعد ان کو آج تک پڑھا نہیں تھا، نہ چھپنے کے دوران میں نہ اس کے بعد، اب جو دیکھتا ہوں تو بڑا کام رفو کا نکلا جس پر شرمندگی ہوئی، اس سے زیادہ پچھتاوا، تھوڑی سی ہنسی بھی آئی ..... جہاں تک ہو سکا زیادہ سے زیادہ کانٹ چھانٹ سے کام لیا۔"

نقادوں نے اکثر یہ کہا ہے کہ رشید صاحب کی تحریروں میں "علی گڑھ" کا دخل بہت ہوتا ہے،

میرے خیال میں یہ اعتراض کچھ مناسب نہیں، اس لئے کہ رشید صاحب کی شخصیت، ان کی زندگی اور ان کے کالج' علی گڑھ' جو ایک مدت سے انجمنِ فکر و نشاط رہا ہے، اس طرح سے رچ بس گیا ہے کہ ایک دوسرے کو الگ کرنا دونوں کے ساتھ زیادتی ہے، رشید صاحب ایک فنکار ہیں، فنکار سے اُس کی شخصیت اور اس کے سرمایۂ فکر کو چھین لینا ظلم ہے، کوئی فنکار اگر تنقید نگاروں کی برہمی کے خوف سے خود اس کی کوشش کرے تو وہ نہ اپنا وفادار رہے گا اور نہ معاشرے کا۔ رشید صاحب کے اشارے، تلمیحیں اور استعارے علی گڑھ ہی کی بزم ہائے وہو سے سٹے اور ان کی مدد سے انھوں نے اُن اقدارِ عالیہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جن سے عبارت ہے زندگی کا وہ حسن جسے ہم کبھی شرافت، کبھی تہذیب اور کبھی بلند حوصلگی اور جذبۂ نصرت کہتے ہیں، دیکھنا یہ چاہئے کہ رشید صاحب کے مضامین میں یہ باتیں ہیں یا نہیں، طنز و مزاح اور نشاط انگیز طرزِ انشار سے کام لے کر انھوں نے اسلوب اور فن دونوں کا حق ادا کیا ہے۔

کلام سودا مرتبہ: ڈاکٹر خورشید الاسلام

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۸،

کتابت و طباعت اچھی، سن اشاعت: ۱۹۶۴ء، قیمت: چھ روپے

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اپنی ذکاوت، ژرف بینی، متوازن طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر کی وجہ سے تنقید نگاروں میں ایک باوقار حیثیت حاصل کر لی ہے، اپنے قیامِ لندن کے زمانے میں (۱۹۵۳ء) انھوں نے سودا کے کلام کا انتخاب کیا اور واپسی پر اسے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے ترتیب دے کر چھپنے کے لائق بنایا، نولکشور ایڈیشن اور جونسن والے نسخہ میں جو اختلاف ہو آ سے انھوں نے کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا ہے اور اس سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی لفظوں کے معمولی الٹ پھیر سے اشعار پر کیا گذر جاتی ہے۔

خورشید الاسلام صاحب کو یہ شکایت ہو کہ سودا کے کلام سے بے اعتنائی برتی گئی ہے، یہ صحیح ہے لیکن سودا کو کم از کم وہی مرتبہ دینے کی کوشش کرنا جو میر کا ہے مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ سودا کی شاعری میں، خواہ وہ غزل ہو یا قصیدے کی تشبیبیں، وہ آفاقیت نہیں جو امتدادِ زمانہ کے باوجود اپنی نشتریت باقی اور شاعر کی وجاہت قائم رکھتی ہے، سودا کے قصیدے، ان کے طنزیے اور ہجویں وغیرہ یقیناً اس لحاظ سے کار آمد

ہیں کہ ان سے اس عہد کی سماجی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مزید براں ان کے اکثر قصائد پر زور اور ان کی بیشتر تشبیہیں خیال آفریں ہیں، ان کی زباندانی اور قادر الکلامی میں بھی شبہ نہیں، لیکن ان سب کے باوجود میر جیسی بات کہاں؟ خورشید صاحب کی یہ کاوش لائق ستائش ہے کہ انھوں نے سودا کے کلام کا بہت اچھا اور صحیح انتخاب شائع کیا ہے، مطبوعہ کلیات پر معقول تبصرہ کیا ہے، ان کی خامیاں مثالیں دے کر بتائی ہیں اور زبان اور ہجوں کی غلطیاں درست کی ہیں، اس انتخاب میں ہر صنف کی نمایندگی ملحوظ رکھی گئی ہے، نظموں کے رائج عنوانات میں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور ان میں زیادہ اور مناسب وسعت پیدا کی گئی ہے۔ غزلوں کے قطعہ بند اشعار کو علاحدہ علاحدہ عنوان دے کر مرتب نے نظموں کی شکل دے دی ہے، یہ وہ بدعتیں ہیں جو احسن ہیں اور سودا کے کلام کو لائق مطالعہ بنانے کے لئے ضروری بھی۔

دارالعلوم دیوبند

مرتبہ: مولانا محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند

ناشر: دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند (یو۔پی)، صفحات ۱۲۸، مجلد مع گرد پوش،
سن طباعت: ۱۹۶۵ء، کتابت و طباعت بہت اچھی، قیمت: دو روپے آٹھ آنے

دارالعلوم دیوبند کو مسلمانان ہند کی تعلیمی، مذہبی اور سیاسی زندگی میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے، اس ادارہ کو قائم ہوئے سو سال ہو رہے ہیں، اس کتاب میں اس مدرسہ کی تاسیس، وجہ تاسیس، تعلیمی، تبلیغی، انتظامی اور عام افادی کوائف و احوال کا مختصر مگر جامع مرقع ملتا ہے۔ مولوی عزیز احمد قاسمی بی اے (جامعہ) کے تیار کئے ہوئے وہ اعداد و شمار اور بیش قیمت چارٹ بھی اس میں شامل ہیں جنھیں انھوں نے کئی سال کی محنت سے تیار کیا ہے، درحقیقت یہ رسالہ، جیسا کہ مرتب نے اپنے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے، ایک لحاظ سے مولوی عزیز احمد صاحب ہی کی رسا طبیعت اور شبانہ روز محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رسالہ دارالعلوم کے صد سالہ کاموں کی ایک مختصر تاریخ ہے، اسے ملک کی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی شائع کرنا چاہیئے تاکہ اس کا اندازہ ہو سکے کہ مدرسہ کے بوریہ نشینوں نے کتنا عظیم الشان کام انجام دیا ہے۔

(ضیاء الحسن فاروقی)

کتب موصولہ

فن کی جانچ : تنقیدی مضامین کا مجموعہ ، از ڈاکٹر سیدہ جعفر ، ملنے کا پتہ : نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد (دکن) ، صفحات ۲۸۴ ، مجلد مع گرد پوش ، سن طباعت : ۱۹۶۵ء ، قیمت چار روپے

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے تنقید اور تحقیق کے میدان میں اچھا کام کیا ہے ، ان کی فکر متوازن ہے اور اُن کے طرز نگارش میں ہمواری ہے ، اس مجموعہ میں جو مضامین ہیں اُن میں اکثر تشریحی اور تاثراتی ہیں لیکن دلچسپی اور خیال آفرینی سے خالی نہیں ، اور اس سے ان کے شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

آئین وفا : از پرنسپل صفدر حسین ، ناشر : مکتبۂ دانش افروز ، کرشن نگر ، لاہور ، مجلد مع گرد پوش ، صفحات ۱۰۴ ، کتابت و طباعت بہت اچھی ، سال طبع : ۱۹۶۵ء ، قیمت : تین روپے

یہ مرثیہ ہے اور حضرت عباس علمدار رضؓ کی سیرت و حیات کے بیان میں ہے ، مرثیہ اچھا ہے اور مرثیہ نگاری کے فن میں ایک نئے راستہ کا پتہ دیتا ہے ۔ صفدر صاحب کو واقعہ نگاری ، جدید ترکیبوں کے استعمال اور قافیہ و ردیف کو سلیقے سے برتنے کا ہنر آتا ہے ۔

امیر خسرو (بحیثیت ہندی شاعر) : از صفدر آہ ، ناشر : علوی بک ڈپو ، محمد علی روڈ ، بمبئی ۳ ، صفحات ۱۰۸ ، سن طباعت : ۱۹۶۶ء ، قیمت : دو روپے ، مجلد مع گرد پوش

امیر خسرو کا اپنی پہیلیوں ، گیتوں ، دوہے وغیرہ کی وجہ سے ہندوستانی عوام سے جو گہرا رشتہ ہے وہ اٹوٹ ہے ، اس کتاب میں ان کی ہندی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

آغوش خیال : مجموعہ کلام از آزاد گلاٹی ، مجلد مع گرد پوش ، سن طباعت : ۱۹۶۴ء ، صفحات ۱۵۹ ، ملنے کا پتہ : مکتبۂ اردو ادب ، کچی چھاؤنی ، جموں ، قیمت : تین روپے

جناب آزاد گلاٹی کا کلام کئی سال سے اردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہو رہا ہے ۔ یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے ۔ ان کے یہاں تازگی خیال اور لطف بیان ملتا ہے ، ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جذبہ میں شدت اور مشاہدہ میں گہرائی ہے ۔

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ : یونین پریس دہلی　　ٹائٹل : جمال پریس دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۴	بابت ماہ اگست ۱۹۶۶ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر سید عابد حسین

سائنس کا اثر مذہب و اخلاق پر

پہلے سائنس کا لفظ انگریزی زبان میں علم یعنی جاننے کے عام مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ علم صحیح یعنی مرتب اور منظم علم کے مخصوص معنی میں استعمال ہونے لگا۔ سائنس یا علم صحیح کے دائرے میں نہ صرف ریاضی اور طبیعی علوم بلکہ انسانی اور سماجی علوم بھی داخل ہیں۔ لیکن عام تقریر و تحریر میں سائنس سے صرف علوم طبیعی (نیچرل سائنسز) مراد لیتے ہیں۔ آج کی بات چیت میں ہم لفظ سائنس اسی معنی میں استعمال کریں گے۔

آئے دن سنتے رہتے ہیں کہ سائنس کی ترقی نے مذہب اور اخلاق پر برا اثر ڈالا ہے اور ہم میں سے اکثر اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس نے مذہبی عقیدوں کی تردید کر دی ہے اس لئے آج کل کے پڑھے لکھے لوگ مذہب کو نہیں مانتے اور جب مذہب کو نہیں مانتے تو اخلاق کو کیا مانیں گے۔ اس لئے کہ اخلاق کی بنیاد تو مذہب ہی پر قائم تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بات تو اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ سائنس کی ترقی کا مذہب اور اخلاق پر برا اثر پڑا ہے لیکن اس کے جو معنی سمجھے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ سائنس نے دراصل کسی مذہبی عقیدے کی تردید نہیں کی ہے اور نہ وہ کر سکتی ہے۔ اس قسم کے تصورات جنھیں سائنس نے غلط ثابت کر دیا ہے، جیسے یہ کہ زمین و آسمان خدا کے حکم سے دم بھر میں یا چھ روز میں بن گئے یا سورج زمین کے آس پاس گھومتا ہے یا بیماری نظر لگنے سے ہو جاتی ہے اور چھو منتر سے جاتی رہتی ہے مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ محض کم نظری یا اپنی غفلت کی وجہ سے انھیں مذہبی عقیدے کا ایک جز سمجھ لیا گیا تھا۔ ان کے غلط ثابت ہونے کا مذہب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب رہا اخلاق کا معاملہ تو اول یہ کہنا صحیح نہیں کہ اخلاق کی بنیاد صرف مذہب پر قائم تھی۔ جتنے بڑے

بڑے اخلاقی اصول ہیں وہ صحت و سلامتی اور امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے اس قدر ضروری ہیں کہ قریب قریب سبھی لوگوں کو چاہے کہ وہ مذہب کے قائل ہوں یا نہ ہوں انہیں عقل اور تجربہ کی بنا پر ماننا ہی پڑتا ہے۔ دوسرے سائنس نے جب کسی مذہبی عقیدے کی تردید نہیں کی تو کسی اخلاقی اصول کی تردید کا کیا سوال ہے۔

تو پھر اس کے کیا معنی ہیں کہ سائنس کی ترقی کا مذہب اور اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے ؟

آیئے پہلے ہم یہ سمجھ لیں کہ مذہب اور اخلاق پر پچھلے چار ساڑھے چار سو سال میں جو سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے کس قسم کا برا اثر پڑا ہے اور کس طرح پڑا ہے۔ دراصل صورت حال یہ نہیں ہے کہ لوگ عام طور پر مذہب اور اخلاق کے منکر ہیں، خود مغربی ملکوں میں عوام کے علاوہ دانش ور طبقے میں بھی شاید اسی فی صدی افراد مذہب اور اخلاق کے قائل ہوں گے یعنی زبان سے اقرار کرتے ہوں گے اور ہمارے ملک میں تو ایسے لوگوں کا تناسب اور بھی زیادہ ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان کے دلوں میں مذہبی عقیدوں اور اخلاقی اصولوں کے نقش ہلکے پڑ گئے ہیں اور عملی زندگی پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سائنس کا سیدھا اثر نہیں بلکہ آڑا اثر ہے، یعنی خود سائنس کو مذہب و اخلاق کی تردید یا تائید سے کوئی تعلق نہیں اس لئے کہ اس کا میدان اِن دونوں سے بالکل الگ ہے اور اُسے اِن کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت ہے اور نہ حق ہے۔ البتہ سائنس نے علمی تحقیق کا جو نیا انداز اور نیا طریقہ اختیار کیا تھا اسے حد سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے لوگوں نے اُن بنیادی تصورات سے جو مذہب اور اخلاق کی جان ہیں انکار کر دیا یا کم سے کم ان کے بارے میں شک کرنے لگے اور اس طرح مذہبی عقیدے اور اور اخلاقی اصول کا جو گہرا اثر ان کے دلوں پر تھا وہ کم ہو گیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پرانے زمانے اور بیچ کے زمانے میں بلکہ سترھویں صدی عیسوی کے شروع تک عام طور پر فلسفہ دنیا کے بارے میں تین بنیادی تصورات رکھتے تھے۔ ایک یہ کہ کارگاہِ عالم میں کوئی دانا و بینا ہستی یا قوت کام فرما ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ سارا کارخانہ کسی مقصد کے ماتحت چل رہا ہے۔ تیسرا یہ کہ نظامِ عالم ایک اخلاقی نظام ہے اور یہی دنیا میں نیک و بد کا معیار ہے۔ ہر عمل جو عالمی مقصد کے موافق ہو نیکی اور جو

اس کے مخالف بدی کہلاتا ہے۔ نیکی کا دیوتا ہمیشہ بول بالا ہوکر رہتا ہے اور بدی کو کبھی نہ کبھی نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ تینوں تصورات ہمیشہ سے مذہب کے بنیادی عقائد میں داخل ہیں اسی لئے اس زمانے میں فلسفہ اور مذہب و اخلاق میں جزوی اختلافات کے باوجود مجموعی طور پر ہم آہنگی تھی۔ اب رہی سائنس تو وہ اس وقت تک نہ تو آزاد تھی اور نہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے مذہب کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر فلسفے کے سہارے چلنا پڑتا تھا۔

اس صورت حال میں تبدیلی یورپ میں ایک ذہنی انقلاب کے ذریعے ہوئی جو سولھویں صدی میں رونما ہوا۔ یونان کی مشرقی رومی سلطنت کا ترکوں کے ہاتھوں برباد ہونا، یونانی علوم کا اٹلی اور مغربی یورپ پہنچنا اور وہاں ایک نئے ذہنی ولولے اور ایک نئی علمی زندگی کا پیدا ہونا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ رومی کلیسا نے جو تسلط سائنس پر بٹھا رکھا تھا وہ نئی ذہنی فضا میں قائم نہ رہ سکا اور سائنس داں کلیسائی احتساب کی سختیوں کے باوجود اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں علمی تحقیقات کا کام کرتے رہے۔ سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے شروع تک چار سو سال میں کوپرنکیس، کیپلر، گلیلیو، نیوٹن اور لاپلاس کی تحقیقات نے ہیئت کا ایک مربوط اور مضبوط نظام مرتب کر دیا۔ اس میں خاص طور پر قابل لحاظ یہ بات تھی کہ نیوٹن کے زمانے میں ان سائنس دانوں نے اپنا کام مذہب اور فلسفے سے قریب قریب بے نیاز ہوکر کیا تھا پھر بھی پوری طرح بے نیاز نہیں ہوئے تھے۔ وہ مشاہدے، تجربے اور عقل کی رہنمائی میں آگے بڑھتے تھے مگر خدا کے تصور سے بھی کام لیتے تھے۔ نیوٹن کو سیاروں کی چال میں کچھ بے قاعدگیاں نظر آئیں جن کی توجیہہ وہ اپنے دریافت کئے ہوئے کشش ثقل کے قانون سے نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ تاویل کی کہ کبھی کبھی خدا نظام عالم میں دخل دے کر ان بے قاعدگیوں کو جو سیاروں کی چال میں ہیں درست کرتا رہتا ہے۔ ورنہ رفتہ رفتہ یہ سیارے آپس میں ٹکرا تے اور نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ مگر نیوٹن کے بعد سو سال کے عرصے میں سائنس دانوں کا سائنسی طریقے کا تصور مکمل ہو چکا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ سائنس کی تحقیقات میں مشاہدے، تجربے اور عقل کے سوا اور کسی چیز سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لاپلاس

سے نپولین کا ہم عصر تھا یہ ثابت کر دیا تھا کہ ستاروں کی چال میں بظاہر جو بے قاعدگیاں نظر آتی ہیں وہ ایک مدت کے بعد ایک قاعدے کے ماتحت خود بخود درست ہو جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار نپولین نے لاپلاس سے پوچھا "میں نے سنا ہے تم نے نظامِ عالم کے بارے میں ایک بہت بڑی کتاب لکھی ہے اور اس میں خالقِ کائنات کا کہیں نام تک نہیں آیا؟" لاپلاس نے جواب دیا "مجھے اس فرضیے سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔"

غرض نئے طریقِ تحقیق کی بدولت سائنس نے علت و معلول کے قانون اور کششِ ثقل اور حرکت کے قوانین کی بنا پر نظامِ عالم کا ایک مکمل ذہنی خاکہ بنا لیا اور اس کے دائرے کے اندر کائنات کے بنانے والے یا چلانے والے یا کسی اخلاقی مقصد کے تصور کی گنجائش نہیں رہی۔

اگر یہ بات یہیں تک رہتی تو مذہب و اخلاق کے نقطۂ نظر سے کوئی بہت بڑا نقصان نہ ہوتا۔ سائنس کے دائرے میں ان کا سکہ بدستور چلتا رہتا مگر اس پر طرہ یہ ہوا کہ نئے طریقِ تحقیق کے ذریعے سائنس نے قوانینِ قدرت کے سلسلے میں اتنے بڑے بڑے حیرت انگیز انکشافات کئے اور علم صنعت کی مدد سے ایسی ایسی عجیب و غریب مفید اور آرام دہ چیزیں ایجاد کیں کہ انسان کی نظر خیرہ اور اس کا ذہن مسحور ہو کر رہ گیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ سائنسی طریقِ تحقیق ایک ایسا جادو ہے جس سے قوانینِ قدرت کا پتہ چلنے کے علاوہ کائنات کی حقیقت اور بھید بھی کھل سکتا ہے۔ اور انسان کے لئے ایک معیارِ عمل بھی قائم ہو سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں سائنس دان مذہبی عقائد اور ان پر مبنی اخلاقی اصول کو اس بنا پر کہ وہ سائنسی طریقِ تحقیق کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے رد کرتے رہے اور یہ دعوے کرتے رہے کہ وہ سائنسی طریق کے ذریعے سے کائنات کی حقیقت بھی دریافت کریں گے اور انسان کے لئے راہِ عمل بھی معین کر لیں گے۔ مگر سوڈیڑھ سو سال میں ان میں سے اکثر کو یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ ان مسئلوں سے نبٹنا سائنس کے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ آج کل مغربی ملکوں میں اور ایک حد تک خود ہمارے ملک میں بھی دانش ور یعنی پڑھے لکھے طبقے کا کچھ عجیب حال ہے۔ وہ سائنسی طریق کو حقیقت کی تلاش کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ چونکہ یہ طریق مذہبی عقائد اور اخلاقی اصول کی تردید نہیں

کر سکتا۔ اس لئے دانش ور حضرات اِن عقائد اور اصول سے انکار نہیں کرتے بلکہ پرانی روایات کے اثر سے انھیں کم سے کم زبان سے اِن کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ مگر دوسری طرف چونکہ سائنسی طریق سے مذہب اور اخلاق کی تائید نہیں ہوتی اس لئے وہ انھیں دل سے نہیں مانتے اور اپنی عملی زندگی میں اُن کا کچھ زیادہ اثر قبول نہیں کرتے۔ غرض وہ ایک عجیب کش مکش کے عالم میں ہیں۔ نہ انھیں مجالِ انکار ہے نہ تابِ اقرار۔ نہ وہ اطمینانِ قلب حاصل ہے جو لوگوں کو اٹھارھویں صدی تک خدا پرستی کی بدولت نصیب تھا نہ وہ سکونِ خاطر جو انیسویں صدی میں دہریت کی بنا پر میسر تھا ؎

دُگدھا میں دونوں گئے نہ مایا ملی نہ رام

شاید ایک دن آئے جب انھیں یہ محسوس ہو کہ سائنسی طریق کے علاوہ تلاشِ حق کا ایک رُوحانی طریقہ بھی ہے اور اس میں خالقِ کائنات، مقصدِ کائنات اور نظامِ اخلاق کے تصورات، فرضیوں کی حیثیت نہیں رکھتے جنھیں لاپلاس جیسے سائنس دانوں نے غیر ضروری سمجھ کر رد کر دیا تھا بلکہ بدیہی حقیقتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں دنیا کے سارے پیمبروں، صوفیوں اور سنتوں نے ناگزیر سمجھ کر دل و جان سے قبول کیا تھا۔

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)

روشن صدیقی

بقولِ روشن

نکہتِ زلف کو سر رشتۂ جاں کہتا ہوں
ہوش آتا ہے تو خوابِ گزراں کہتا ہوں

درد کو دولتِ صاحب نظراں کہتا ہوں
غم کو سرمایۂ عیسیٰ نفساں کہتا ہوں

کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے مگر اے شمعِ حرم
میں تجھے شعلۂ رخسارِ بتاں کہتا ہوں

قطرہ دریا ہے تو کیوں شورشِ دریا طلبی
ہر تمنا کو محبت کا زیاں کہتا ہوں

ہے وہ آوازِ شکستِ دلِ گیتی جس کو
جرسِ قافلۂ عمرِ رواں کہتا ہوں

تہمتِ سبزۂ بیگانہ ہے سنگ بیداد
میں تو کانٹوں کو بھی پھولوں کی زباں کہتا ہوں

کون سمجھے گا مرے حسنِ یقیں کا عالم
عرش و طوبیٰ کو حجاباتِ گماں کہتا ہوں

بندۂ خاک نشینانِ محبت ہوں روشن
خاک کو مسندِ آشفتہ سراں کہتا ہوں

سید غلام ربانی

سکّے اور شاعری

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا ملک تو نہیں ہے مگر جتنے راجا اور بادشاہ یہاں گزرے ہیں، اتنے کسی اور ملک میں نہیں ہوئے، چنانچہ یہاں مختلف قسم کے سکوں کی وہ کثرت ہے کہ ان کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ قدیم سکوں کا مطالعہ بڑی دیدہ ریزی اور پتّہ ماری کا کام ہے مگر یہ کام ہے بہت دلچسپ اور جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی مفید بھی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے سکوں کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں جا بجا خلا موجود تھے اور اب بھی ہیں، ان کو سکوں اور کتبوں کی مدد سے پُر کیا جا رہا ہے۔ کتابوں میں قدیم راجاؤں کی جو تصویریں نظر آتی ہیں وہ سب سکوں سے لی گئی ہیں، ان سکوں پر ہاتھی، بیل، سور، درخت، پھل، پھول سانپ، بچھو، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، دیوی، دیوتا غرض دنیا بھر کی چیزیں نقش ہیں مگر ان پر دارالضرب کا نام کندہ نہیں، دوسری کمی یہ ہے کہ کسی سکّے پر سن بھی درج نہیں ہے۔

مسلمان فرمانرواؤں کے سکوں پر دارالضرب اور سن دونوں موجود ہیں بلکہ بعض سکوں پر دو دو سن بھی ہوتے ہیں، ایک سن ہجری اور دوسرا سن جلوس۔ اکثر سکوں پر بادشاہ کے باپ کا نام بھی ہوتا ہے اور ایسے سکّے بھی ہیں جن پر ان کی پانچ پشتوں کے نام درج ہیں مثلاً گجرات کے سلطان محمود کے سکوں پر ایک طرف محمود شاہ ابن محمد شاہ، ابن احمد شاہ، ابن محمود شاہ ابن ظفر شاہ درج ہے۔ یہ سکہ کیا ہے خاصا شجرہ نسب ہے۔

مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے ایک ہزار برس سے زیادہ ہوئے لیکن پہلا مسلمان فرمانروا جس کے نام کا سکہ یہاں جاری ہوا، محمد بن سام تھا، یہ سکہ بارہویں صدی

میں جاری ہوا، اس پر لکشمی دیوی کی تصویر تھی۔ اس کے بعد جب دلی میں مستقل اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو مسلمان فرمانرواؤں کے سکے باقاعدہ جاری ہونے لگے۔ شروع میں ترکوں اور پٹھانوں کے سکوں پر ایک طرف کلمۂ طیب یا کلمۂ شہادت درج ہوتا تھا، کلمہ کا سنسکرت ترجمہ ناگری حروف میں درج ہوتا تھا، دوسری طرف بادشاہ کا نام، لقب اور سن وغیرہ درج ہوتے تھے۔ ان بادشاہوں کے لقب بڑے لمبے چوڑے ہوتے تھے جو خلفائے بنی عباس کے نام سے ملتے جلتے تھے۔ بعد کے سکوں پر خلفائے راشدین کے نام بھی نقش ہونے تھے۔ سکوں کی عبارت خط نسخ میں ہوتی تھی۔ مغلوں کے عہد میں سکوں کی تحریر نستعلیق میں ہونے لگی اور عبارت شعر سے بدل گئی یعنی سکوں پر بجائے نثر کے شعر نقش ہونے لگے۔ یہ اشعار شاعری کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

اکبر کی مہروں پر مختلف شعر درج ہوتے تھے ان کے نمونے یہ ہیں :-

مہر مہر شاہ اکبر آبروی این زر است

تا زمین و آسماں را مہر انور زیور است

(آفتاب اور اکبر کی مہر اس سونے کی آبرو ہے،

جب تک زمین و آسماں مہر انور سے روشن ہیں)

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد

بہ شرق و غرب جہاں سکہ الہ آباد

(مشرق سے مغرب تک الہ آباد کا یہ سکہ

ہمیشہ چاند سورج کی طرح روشن رہے)

اس اشرفی پر کسی بادشاہ کا نام درج نہیں ہے۔ بعض ماہرین مسکوکات کا خیال ہے کہ یہ سکہ جہانگیر نے اپنی بغاوت کے زمانہ میں الہ آباد سے جاری کیا تھا۔

جہانگیر : جہانگیر کے سکوں پر عموماً اس کے باپ کا نام بھی درج ہوتا ہے

مالک الملک سکہ زد بزر

شاہ سلطان سلیم شاہ اکبر

روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ

شاہ نورالدیں جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

(اکبر بادشاہ کے بیٹے نورالدیں جہانگیر نے سونے

کے چہرے کو چاند سورج کی طرح روشن کر دیا)

سکہ زد در شہر آگرہ خسرو گیتی پناہ

شاہ نورالدیں جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

زد بزر ایں سکہ در اجمیر شاہ دیں پناہ

شاہ نورالدیں جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

از شاہ جہانگیر بود دور زماں

در آگرہ ز نام اوست زر نورفشاں

تا ہست نشاں ز پنج نوبت بجہاں

ایں سکہ پنج مہریش باد رواں

(دور زماں کا تعلق جہانگیر سے ہے

آگرہ میں سونا اس کے نام سے روشنی پھیلاتا ہے

جب تک دنیا میں پانچ وقت کی نماز جاری ہے

اس کا یہ پنج مہری سکہ جاری رہے)

چھوٹے سے سکہ پر چار مصرعوں کے لئے جگہ نکالنا بہت مشکل ہے۔ یہ عربی رسم الخط کی کرامت ہے جو کسی دوسرے خط کو نصیب نہیں۔ یہی رسم الخط اردو کو ورثہ میں ملا ہے۔ اشرفیوں کے یہ اشعار نستعلیق خط میں ہیں اور آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

حروف جہانگیر و اللہ اکبر

ز روز ازل در عدد شد برابر

ابجد کے حساب سے جہانگیر اور اللہ اکبر کے اعداد برابر ہوتے ہیں یعنی "جہانگیر" کے عدد ۲۸۹ ہیں اور "اللہ اکبر" کے بھی ۲۸۹۔

کسی بادشاہ نے سکوں پر اپنی ملکہ کا نام درج نہیں کرایا مگر جہانگیر کی اشرفیوں پر نورجہاں کا نام بھی نقش تھا۔

زحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور

ز نام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

(جہانگیر کے حکم اور نورجہاں کے نام سے

سونے میں سو خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں)

شاہ جہاں

سکہ شاہ جہاں آباد رائج در جہاں

جاوداں بادا بنام ثانی صاحب قراں

مراد

مراد نے بھی اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں سکہ جاری کیا تھا:

گرفت ارث ز صاحب قراں شاہ جہانی

مراد بخش محمد سکندر ثانی

اورنگ زیب

سکوں کے لئے جو شعر پسند کیا جاتا تھا اس کا انعام شاعر کو ایک لاکھ روپیہ ملتا تھا، اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو اس نے خود شعر کہا اور اس طرح حکومت کا ایک لاکھ روپیہ بچا لیا۔ شعر یہ ہے:

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالم گیر

اعظم شاہ

سکہ زد در جہاں بدولت وجاہ
بادشاہ ممالک اعظم جاہ

کام بخش

اورنگ زیب کا بیٹا کام بخش جب دکن کی صوبہ داری پر مامور ہوا تو اس نے بھی سکہ جاری کیا۔

سکہ زد بر خورشید و ماہ
شاہ دکن کام بخش بادشاہ

جہاں دار

در آفاق زد سکہ چوں مہر و ماہ
ابوالفتح غازی جہاں دار شاہ

فرخ سیر

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

محمد شاہ

سکہ زد در جہاں بلطف الہ
بادشاہ زماں محمد شاہ[1]

سکوں پر شعر نقش کرانا دنیائے مسکوکات میں ایک جدت تھی جس کو مغل بادشاہ اخیر دم تک نباہتے رہے۔ اٹھارویں صدی کے اخیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ملک پر ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی عالمگیر ثانی کے سکّہ پر یہ شعر موجود تھا۔

سکہ زد بر ہفت کشور ہچو تاباں مہر و ماہ
شاہ عزیز الدین عالمگیر غازی بادشاہ

گجرات اور دکن کے سکوں پر بھی کہیں کہیں اشعار نظر آتے ہیں۔ گجرات کے سلطان بہادر شاہ کے سکہ پر یہ شعر تھا

ہر کرا روی ورو اجے ہست بر سطح زمیں
سکہ اقبال شاہ ہند دارد بر جبیں

(زمین کے پردہ پر جو شخص نام اور شہرت کا مالک ہے
وہ اپنی پیشانی پر شاہ ہند کا سکہ اقبال رکھتا ہے)

عادل شاہیوں میں محمد عادل شاہ نے یہ شعر نقش کرایا تھا۔

جہاں از یں دو محمد گرفت زینت و جاہ
یکے محمد مرسل دوم محمد شاہ

(دنیا کی زینت اور مرتبہ دو محمدوں سے ہے
ان میں سے ایک محمدؐ پیغمبر ہیں دوسرا محمد شاہ ہے)

---

[1] حیدرآباد میں ڈاکٹر تارا پور والا کے پاس مغلئ سکوں کا بہت اچھا ذخیرہ موجود تھا، راقم نے ان کے پاس ان اشرفیوں کو دیکھا ہے جن پر اشعار درج تھے معلوم نہیں، ڈاکٹر موصوف کے بعد اس ذخیرہ کا کیا ہوا۔

سلطان محمد قلی بانی حیدرآباد کے تانبے کے سکے پر یہ شعر تھا۔

تغیر دہ ملوس شاہی
پیوستہ بہ لعنت الہٰی
(جو شخص ملوس شاہی میں جعل سازی کرے
اس پر ہمیشہ خدا کی لعنت رہے)

مغل شہنشاہ جب کسی مہم پر جاتے تھے تو ان کے لشکر کے ساتھ دارالضرب بھی ہوا کرتا تھا چنانچہ جب کسی مقام کو فتح کرتے تو وہیں سے اپنے نام کا سکہ جاری کرتے تھے۔ اس لشکری دارالضرب کا نام "اردو" تھا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ فخر "اردو" کو حاصل ہے کہ اس کے نام کا سکہ سارے ہندوستان میں چل چکا ہے۔ اردو کا ایک شعر یہ ہے:

بادرواں تاکہ بود مہر و ماہ
سکۂ اردوئے جہانگیر شاہ

ضیاء الحسن فاروقی

یحییٰ کمال ـــــ ایک تعارف

مشہور ترک شاعر اور عالم یحییٰ کمال بیتلی ۱۸۸۴ء میں اسکپ میں پیدا ہوئے جو آج یوگوسلاویہ کا ایک قصبہ ہے، اُن کا تعلق ترک امیروں کے ایک قدیم خانوادہ سے تھا، انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اسکپ، سالونیکا اور استنبول میں حاصل کی، ۱۹۰۲ء میں جب ہر ترک نوجوان پر سلطنت حمیدیہ کو باغی ہونے کا شبہ ہوتا تھا، وہ پیرس چلے گئے جہاں انھوں نے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لیا، وہاں اُس وقت پروفیسر البرٹ سورتے تاریخ پر اپنے لکچر دے رہے تھے، اس بین الاقوامی شہرت کے حامل پروفیسر نے ان میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا کیا اور انھوں نے اپنے مطالعہ سے تاریخ فہمی کی نئی راہیں پیدا کیں۔

یحییٰ کمال فطرتاً شاعر تھے اور طالب علمی کے ابتدائی زمانے سے ہی نظمیں کہنے لگے تھے، ۱۹۰۸ء میں وہ استنبول واپس آئے اور ادبی جرائد میں اپنی نظمیں چھپوانے لگے۔ شروع میں معاش کی یہ صورت نکلی کہ ثانوی مدرسوں میں معلم ہوئے اور بعد میں استنبول یونیورسٹی میں تاریخ اور ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں لوزانِ امن کانفرنس میں شرکت کے لئے جب ترک وفد گیا تو یہ اس کے مشیر کی حیثیت سے اس میں شامل تھے۔ ترکی میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی تو وہ وارسا (پولینڈ) میں ترکی کے سفیر بنا کر بھیجے گئے، بعد میں وہ میڈرڈ (اسپین) گئے، کہا جاتا ہے کہ وہ اسپین کے شاہ الفانسو کے گہرے دوست تھے، ۱۹۴۸ء میں انھیں ادبی خدمات کے صلہ میں قومی انعام دیا گیا، اسی سال وہ پاکستان میں ترکی کے سفیر ہو کر آئے جہاں سے وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد ریٹائر ہو کر استنبول چلے گئے۔

حکومت ترکیہ کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے اپنے آخری ایام استنبول کے پارک ہوٹل میں گذارے جہاں ۱۹۵۸ء میں چوہتر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کی وصیت تھی کہ انھیں باسفورس کے کنارے رومیلی حصار میں دفن کیا جائے، ان کے قدردانوں نے اُن کی وصیت پوری کی۔ انھوں نے شادی نہیں کی، ساری عمر تنہا رہے اور اب تنہا باسفورس کے خوابناک ساحل پر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ استنبول سے انھیں بے پناہ محبت تھی، اسی لئے انھیں 'استنبول کا شاعر' کہا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ استنبول بہت خوبصورت ہے، پہاڑیوں پر بسے ہوئے اس شہر کو گولڈن ہارن اور باسفورس نے ایک لازوال حسن سے نوازا ہے، یہاں کی ہواؤں میں قلب کو گرمانے والی خنکی اور فضاؤں میں دل کو تڑپانے والا سکون ہے، یہاں کی مسجدوں کے مینار اٹھ اٹھ کر اشارہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے

یہاں کے چشموں کا پانی شیریں اور ٹھنڈا ہے، یہاں کے لوگوں میں حُسنِ سیرت اور علوئے اخلاق ہے، یہاں صدیوں کی مختلف تہذیبی روایات آپس میں گھل مل کر شائستگی اور خوش سلیقگی کا ایسا منظر پیش کرتی ہیں کہ چاہے کسی مرد سے ملئے یا عورت سے، کہیں سے آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ

"کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"

میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اس خوبصورت شہر کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ یحییٰ کمال تو شاعر تھے اور ان کے عہدِ شباب کا بہترین حصہ یہاں گذرا، ان سے زیادہ اس شہر کے بے پناہ حسن پر مرمٹنے والا اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی نگاہ تصور سے وہ ماضی کے وہ واقعات اور ترکوں کا وہ جاہ و حشم دیکھ سکتے تھے جن کے نقش یہاں کی پہاڑیوں کے ہر ہر سل پر کندہ ہیں۔

یحییٰ کمال ترکی کے اور خاص طور سے استنبول کے پڑھے لکھے طبقہ میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے، وہ تنہا رہتے ہوئے بھی تنہا نہیں تھے، وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھے۔ انہیں گفتگو کا سلیقہ آتا تھا اور جہاں کہیں ہوتے تھے محفل کو باغ و بہار بنا دیتے تھے، تاریخ اور ادب پر ان کی نظر گہری اور مطالعہ وسیع تھا، عام طور پر آن کے گرد ان کے قدر دانوں کا مجمع رہتا تھا، غالب نے کہا تھا ؎

پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

یہی حال اس بڈھے شاعر کا تھا جیاروں کی محفل میں کبھی اپنی نظمیں سناتا ہوا ملتا تھا اور کبھی تاریخ و ادب پر بصیرت افروز گفتگو کرتا ہوا۔ وہ بہت ذہین تھے، مزاح و ظرافت کا اچھا معیار رکھتے تھے، اور اپنے مہذب پیرایۂ بیان اور کبھی کبھی جذباتیت سے بھرپور انداز گفتگو سے اپنے حلقہ بگوشوں کو رلاتے بھی تھے اور ہنساتے بھی، وہ جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم مہذب ترک کا ایک دلنواز نمونہ تھے،

یحییٰ کمال صحیح معنوں میں فنکار تھے، ان کے مذاق اور مزاج میں بڑی نزاکت تھی، انہیں ہر چیز میں "کمال" کی تلاش رہتی تھی، وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ ہفتوں اور مہینوں مناسب اور موثر "لفظ" کی تلاش میں سرگرداں رہے اور نظم مکمل نہیں ہوئی، الفاظ و تراکیب میں بھی حسن آفرینی کرتے تھے، یہ اس لئے تھا کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک "مہذب" انسان بھی تھے، دوسری تہذیبی دولت جو ان کے پاس تھی وہ یہ تھی کہ وہ روپے پیسے کو محض ایک وسیلہ تصور کرتے تھے، اسے مقصد نہیں سمجھتے تھے، ترکی میں ایسے پبلشر تھے جو آن کے کمال فن اور مقبولیت کی وجہ سے آن کی نظموں کا حق اشاعت بھاری قیمت پر خریدنا چاہتے تھے، اتنی بھاری قیمت جو ترکی کی ادبی تاریخ میں کسی شاعر کے کلام کے لئے کبھی نہیں پیش کی گئی، لیکن انھوں نے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آن کی نظموں کا مجموعہ آن کی وفات کے بعد

یحییٰ کمال کی شاعری

شاعری کی حیثیت سے ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا فکر نغمے میں ڈھلا ہوا ہے، وزن اور آہنگ کا بڑا خوشگوار امتزاج ملتا ہے ان کے یہاں، وہ لفظوں کے مزاج شناس تھے، اور لفظوں کی "موسیقیت" کو بڑی اہمیت دیتے تھے، یہ اس لئے بھی تھا کہ وہ موسیقی کے شیدا بھی تھے اور اس سلسلے میں کلاسیکی ذوق رکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ جو بات نثر میں موثر طریقے سے نہیں کہی جاسکتی اس کا اظہار نظم میں ہوسکنا چاہئے۔ شاعر ایک مطرب ہے جسے خدا کی طرف سے یہ صلاحیت عطا ہوئی ہے کہ وہ لفظوں کو اس سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ ان کی سحر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ یحییٰ کمال نے ترکی زبان کو بڑی خوبصورت ترکیبیں اور حسین استعارے تشبیہیں دیں، یہ خصوصیت ان کے یہاں اس لئے نمایاں ہے کہ وہ اپنے قیام پیرس کے زمانے میں پارناسی مسلک کے پیروؤں اور رمزنگاری (سمبولزم) کے حامیوں سے بہت متاثر ہوئے۔ پارناسی مسلک کی شاعری میں ہیئت اور تکنیک پر بہت زور دیا گیا تھا اور رمزنگاری کے مسلک کی یہ خصوصیت تھی کہ ہیئت اور موضوع غیر معین اور موسیقی کی لے اور آہنگ کی طرح اشارتی اور علامتی ہوتے تھے، لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ یحییٰ کمال ہیئت پرستی اور رمزیت ہی کو شاعری سمجھتے تھے، اور پارناسیوں اور علامتیوں سے یہی ان کا اختلاف تھا، انھوں نے ان کی تکنیک کو تو اپنایا لیکن ان کی اس بات سے انکار کیا کہ شعریت اور ہیئت ہی اصل شاعری ہے۔

وہ آفاقی مزاج رکھتے تھے اس لئے اُن کی نظر عارضی اور مخصوص مناظر سے گذر کر عمومی اور دائمی حقائق تک پہونچتی تھی، اس سلسلہ میں ان کی نظم "سلیمانیہ[1] میں عید" بڑے معرکہ کی نظم ہے جس میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں ملتی ہیں، وجود کی وہ ساری لطافتیں جو زندگی کا حسن ہیں، اس نظم کا تاثر بن گئی ہیں،

---

[1] سلیمانیہ استنبول کی قدیم اور مشہور مسجد اور فن تعمیر کا ایک حسین نمونہ ہے۔

یحیٰ کمال تاریخ کے عالم تھے اور شاید اسی لئے ماضی کے منکر نہیں تھے، وہ ایک مشترک ماضی کا احترام کرتے تھے، اور انقلاب کے بجائے ارتقار کے قائل تھے، شاعری میں انھوں نے متقدمین شعرائے ترکی کی بہت سی خصوصیتیں باقی رکھیں اور اس طرح جدید اور قدیم کا ایک خوشگوار امتزاج پیش کیا۔ جدید ترکی میں یہ باتیں کسی اور کے یہاں مشکل سے ملیں گی۔ نہ معلوم اس وجہ سے کہ انھوں نے شادی نہیں کی، عمر بھر تنہا اور ازدواجی زندگی کی لذت وراحت سے محروم رہے، یا کسی اور سبب سے اُن کے کلام میں ایک حزنیہ لے ملتی ہے، عمر کے آخری دنوں میں یہ لے تیز ہوگئی تھی اور ایک طویل تھکی ہوئی زندگی کی آہ سرد معلوم ہوتی تھی، انھوں نے لکھا تھا:

خدا رحم فرمائے

اور یہ ویران موسم خزاں ختم ہوجائے

لیکن میرا خیال ہے کہ اسی حزنیہ لے کی وجہ سے ان کی شاعری میں تاثیر ہے، اس تاثیر میں ماضی کی یاد سے اور بھی گھلاوٹ پیدا ہوگئی ہے جو لفظوں کی موسیقیت، وزن و آہنگ کی ہم آہنگی اور خوبصورت ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں میں ڈھل کر اُن کی شاعری کی عظمت کی ضامن بن گئی ہے۔ اُن کی لوحِ مزار پر جو مصرعے کندہ ہیں وہ انھیں کے ہیں اور انھیں کی خواہش کے مطابق ہیں، ان کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہے:

ایک زندہ دل کے لئے موت پُرسکون بہار ہے

اس کے دل کے داغ مہکتے رہتے ہیں

ہر صبح مولسری کے ٹھنڈے سایے میں

اس کے مزار پر گلاب کھلتا ہے

اور ہر شام بلبل نغمہ سنج ہوتی ہے۔

جمال الدین شاہجہانپوری

ہند کی قدیم برآمدی تجارت

ہندوستان سے براہ راست تجارت کی کوشش دنیا کی تقریباً تمام قابل ذکر قوموں نے کی ہے اگر ایک طرف عربوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو دوسری طرف مصر و یونان ایران و روما، روس و چین غیر عرب یہودیوں اور مغرب کی دوسری متعدد قوموں نے اس سلسلہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مغل دور میں تو سارا یورپ ہندی تجارت پر قابو پانے کے لئے آپس میں دست وگریباں رہ چکا ہے۔

مصر و ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات کی بنیاد دھات کے ابتدائی دور سے ہندی لوہے کی برآمد سے قائم ہوئی، حجریاتی دور کے ختم پر لوہا سب سے پہلے جنوبی ہند میں دریافت ہوا تھا اور سندھ کے راستہ بیرون ہند منتقل بھی ہونے لگا تھا چنانچہ اسی راستہ سے وہ ایران وعراق اور شام ہوتا ہوا مصر و افریقہ کے دوسرے حصوں میں پہونچا، تورات کی شہادت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح سے ڈھائی ہزار سال پہلے ہندی فولاد کی تلواریں مصر پہنچتی تھیں، علامہ سلیمان ندوی کی تحقیق کے بموجب اس تجارتی قافلہ کے پاس جس نے حضرت یوسف کو کنویں سے نکالا تھا خوشبودار چیزوں کے علاوہ ہندی فولاد کی تلواریں بھی تھیں، لوہے کی برآمد کے بعد مصر میں ہندی کپاس اور سوتی کپڑے کی درآمد کا نمبر آتا ہے۔ اس درآمد کے زمانہ کا تعین وثوق سے نہیں کیا جا سکتا لیکن ہندوستان میں تین ہزار سال قبل مسیح کپاس کی کاشت کی جاتی تھی اور غالباً فینیقیوں کے تجارتی توسل سے ہندی کپاس کا بیج مصر پہونچا تھا، مصر کے ایک بادشاہ اماسس نے سات سو قبل مسیح ایک شخص کو ہندی کپاس کے دھاگے سے تیار کی ہوئی دو خلعتیں خاص انعام کے

لہ اقتباس از اردو بہاری، عہد قدیم مشرق و مغرب از سید سراج الاسلام،

طور پر دی تھیں، ہندی کپڑے کی درآمدی قدامت کا سرسری اندازہ ڈھائی ہزار قبل مسیح کے فراعنہ مصر کی ان لاشوں سے لگایا جاسکتا ہے جو ہندی ساخت کی نفیس ترین ململوں میں لپٹی ہوئی پائی گئی ہیں، کیونکہ ہندوستان اس وقت اپنے باریک گرار زناں ترین کپڑوں، دھاتوں، قیمتی پتھروں، عطریات اور دیگر چیزوں کے لحاظ سے مشہور ہو چکا تھا[1]۔

تقریباً سولہ سو قبل مسیح بہ عہد توطس سوم ہندی سامان کی تجارت سے جس میں آبنوس، عود، ہاتھی دانت کی خوشنما مصنوعات، قیمتی پتھر، آبدار موتی، خوشبودار گوند، عطریات، منقش ظروف وزیورات، سوتی ریشمی کپڑے اور تلواریں وغیرہ شامل تھیں، مصر میں کافی دولت جمع ہو گئی تھی۔ مصری حکمرانوں کے انیسویں خاندان کے سب سے پہلے فرعون رعمیس اول متوفی تیرہ سو قبل مسیح کے عہد میں یہ سلسلہ اور آگے بڑھا اور مصری تاجروں نے ہندی سامان کی تجارت سے خوب دولت کمائی، غرض شہنشاہیت مصر کے آخری دور یعنی پندرہ سے گیارہ سو صدی قبل مسیح تک مصر و ہند کی تجارت میں مسلسل ترقی نظر آتی ہے اور مصر، ہندی سامان تجارت کی ایک بڑی منڈی دکھائی دیتا ہے، کریٹ مصری تاجروں کی بیرونی تجارت کا ایک خاص مرکز تھا اور یہیں سے ہندی سامان یورپ کے ساحلوں تک[2] پہونچا کرتا تھا۔ مصریوں کے تہذیبی اور تجارتی زوال کے بعد بابل کی تجارت پیشہ قبائل کا ہندوستان سے تجارتی رابطہ قائم ہوا، بابلی مصریوں کی نسبت تجارت کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے جو تحریری دستاویزیں ان کے متعلق اب تک ملی ہیں وہ زیادہ تر کاروباری قسم کی ہیں جن میں تجارتی قرضوں، تبادلۂ مال، شراکت اور دیگر تجارتی معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ بابل میں ہندی مصنوعات کے مقابلہ میں ہند کی خام اشیاء زیادہ درآمد کی جاتی تھیں جن میں خام لوہا، فولاد، سیسہ، مرچ، توتیہ، کافور، لوبان اور مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں شامل تھیں۔ کپاس کی کاشت کا طریقہ بھی اہل بابل نے ہندوستان ہی سے معلوم کیا تھا، چھ سو قبل مسیح بخت نصر نے جو بابل کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا۔

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات و قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب و ہندوستان کی پولیٹیکل اکانومی از امرناتھ بالی۔
[2] عرب ہندوستان از مولوی ولی حسن [3] عہد قدیم مشرق وسطیٰ

[illegible] کی آسائش کے لئے قیام گاہیں تعمیر کرائیں جن سے اس تجارت میں ترقی ہوئی، بابل سے ہندوستانی تجارت آبی راستوں کے علاوہ خشکی کے راستے بھی ہوتی تھی اور اس تجارت میں ہندی تاجروں کے قافلے بھی رواں دواں نظر آتے ہیں، عہد قدیم مشرق و مغرب کے مصنف نے افغانستان ہوتے ہوئے ہندی تاجروں کے قافلوں کا بابل کی سرحد تک پہنچنا ثابت کیا ہے[1] اور قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب کے مصنف کے نزدیک پانچ پانچ سو بیل گاڑیوں کے قافلے ہندی سامان تجارت لے کر ایران کے راستے بابل تک پہونچا کرتے تھے۔ ہندی تاجروں کے قافلوں کے پہونچنے کا ثبوت جسٹس دھون آف الہ آباد ہائی کورٹ کے اس بیان سے بھی ملتا ہے جس میں موصوف نے بڑی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ "اہل فینیقیہ کے ممکنہ استثنا کے سوا ہندی تاجروں اور بیوپاریوں کی تاجرانہ قدامت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا"

ایران سے ہندوستان کا تجارتی اور تہذیبی تعلق سرحدی قربت کی بنا پر بغیر کسی واسطے کے عرصۂ دراز سے قائم رہا ہے، موجودہ بلوچستان کا بڑا حصہ کسی زمانہ میں ایرانی سلاطین کے زیر اثر رہ چکا ہے، نشیبی بلوچستان کے علاقے میں ایرانی نسل کے باشندے کثرت سے آباد تھے، سکندر کو ایران پر حملہ کرتے وقت ایرانی فوج میں شامل ہندوستانی سپاہیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا[1]۔ اور اس حملہ سے تقریباً سو برس پہلے بھی یونانیوں کو ان ہندوستانی سپاہیوں سے سابقہ پڑ چکا تھا جو یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس کے بیان کے مطابق ایرانی فوج کا ایک خاص حصہ تھے، ایران و ہند کے ثقافتی اور تہذیبی روابط کے متعدد واقعات اور مثالیں ملتی ہیں لیکن یہاں اس سے بحث نہیں جہاں تک تجارتی روابط کا تعلق ہے ایرانی تاجر، ہندی سامان تجارت کبھی بلوچستان و افغانستان اور کبھی خلیج فارس کے راستے لے جاتے تھے خلیج فارس کے راستے ایرانی تاجروں کی آمد و رفت کا سلسلہ قدیم زمانہ سے قائم تھا دونوں ملکوں کی سرحدی قربت نے باہمی تجارت میں ایک سازگار فضا قائم کر رکھی تھی۔ پانچویں صدی عیسوی تک گجرات، کاٹھیا واڑ اور جنوبی ہند کے ساحلوں سے ایرانی تاجر بغیر کسی واسطے کے ہندی مصنوعات وغیرہ اندرون ملک پہونچاتے رہے لیکن اس کے بعد عربوں کی وساطت بھی داخل ہوگئی، عرب خلیج فارس کے راستے جنوبی ہند کی مختلف اشیاء کے علاوہ وادیٔ سندھ میں کاشت کردہ کپاس اور چاول تک ایران لے جاتے تھے اور ایرانی سوداگر اس درآمد شدہ مال کو ایران کے اندرونی

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

علاقوں میں پہونچایا کرتے تھے ۔ ہندی قافلوں کے ذریعہ بھی اس تجارت کا جو سلسلہ قبل مسیح سے جاری ہوا تھا
وہ اورنگ زیب عہد حکومت کے بہت عرصہ بعد تک قائم رہا، چنانچہ سرجادو ناتھ سرکار کی تحقیق کے بموجب
چوبیس ہزار اشتران بارکش کے ساتھ ہندی تاجروں کا ایک زبردست قافلہ اورنگ زیب کے آخری دور حکومت
میں درۂ بولان کے راستے ایران پہونچا تھا[1]۔

ہند کے بعض قدیم راجاؤں نے اندرونی اور بیرونی تجارتی توسیع کے لئے وسیع وطویل سڑکیں تعمیر کرائی
تھیں، سولہ سو میل کی ایک طویل شاہ راہ ۳۰۰ء میں ساحل کارومنڈل سے راس کماری تک تعمیر ہوئی تھی اور
دوسری اس سے بہت پہلے یعنی موریہ عہد کے وسط میں پاٹلی پتر سے افغانستان تک تعمیر کی گئی تھی، ایک بیان کے
مطابق ہندی تاجروں کے قافلے موریہ عہد کی اسی گیارہ سو میل طویل سڑک کے ذریعہ افغانستان ہوتے ہوئے
سرزمین رستم وسہراب پہنچا کرتے تھے[2]۔ نویں صدی کے مشہور عرب تاجر اور سیاح ابن حوقل کے بیان سے بھی ایران و
ہند کے مابین کابل اور غزنی کے راستے تجارت کا پتہ چلتا ہے۔ ہندی تاجروں کے لئے کابل اور غزنی میں بڑی بڑی
قیام گاہوں کی موجودگی سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ۔

روس اور ہندی تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ملتی لیکن کچھ پرانے عرب سیاحوں
کے جستہ جستہ بیانات اور حالیہ تحقیقات سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔ چنانچہ ابن خردادبہ[3] کی تحقیق کے بموجب
روسی تاجر مغربی دنیا کا چکر لگا کر شام، بغداد، بصرہ، اہواز، فارس، کرمان، بلوچستان، سندھ اور ہندوستان
خاص ہوتے ہوئے چین تک پہنچا کرتے تھے اور واپسی پر ہندی سامان تجارت مغرب تک پہونچاتے تھے
روسی مصنف توی کوف کے نزدیک ہندی روسی تعلقات کا سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے قائم ہوا
جب روسی سیاح اناتاسی نکیتن نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تھا، کارام زین پہلا شخص ہے جس نے اناتاسی نکیتن

---

[1] ہندوستان کی پولٹیکل اکانومی از امرناتھ بالی
[2] دی پولٹیکل انسٹی ٹیوشنز اینڈ تھیوریز آف ہندوز، از ونے کمار سرکار ۔
[3] خلیفہ معتمد عباسی کے زمانہ کا ایک بڑا افسر اور عرب کا مشہور سیاح اور جغرافیہ نویس

[illegible] روایات ذکر کرکے اس پر ایک تنقیدی اور تحقیقی نظر بھی ڈالی۔ کا لام زین کے نزدیک بھی ہندوستانی
بیوپاری وسطی ایشیا اور انگریزوں کو جانے سے پہلے روسیوں سے واقف ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ [illegible]
جنوبی روس میں ایک ہندوستانی تاجر کی ایک پرانی دستاویز برآمد ہوئی ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں [illegible]
کے ساتھ تجارت کرتا تھا، اس دستاویز کی برآمد کا تعلق اورن برگ مہم سے ہے جسے روسی حکومت نے ہندوستان
تک تجارتی راستے قائم کرنے کے لئے مقرر کیا تھا، اس ہندوستانی کا نام روسیوں نے کسی مصلحت سے [illegible]
رکھا گیا تھا۔ ۱۷۳۵ء میں برائف نے اورن برگ مہم کے سامنے ہند سے روس تک خشکی کے چار راستے پیش
کئے تھے ان میں سب سے بہتر راستہ بخارا ہو کر تھا اس کے نزدیک قافلوں کی صحیح حفاظت ہونے پر ہندوستان
سے تجارت بڑھ سکتی تھی، برائف کی تجاویز ملکہ روس تابوتورتا کو پسند آئی ہو یا ناپسند لیکن قرائن اس بات کے گواہ
ہیں کہ خشکی کے راستے ہندی مصنوعات وغیرہ روسی علاقہ میں برابر پہونچا کرتی تھیں، تاشقند، سمرقند اور بخارا
تک ہندی تاجروں کے قافلوں کا پہونچنا بھی تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے، خود ہندوستانی تاجر مصنف
نے خشکی کے ذریعہ جن چار راستوں کی نشاندہی کی تھی ان میں بخارا کا راستہ سب سے بہتر بتایا ہے۔

چین سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات میں اگرچہ عربوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن اسرائیلی اور
روسی قبائل کی تجارتی سرگرمیاں بھی کچھ کم نہیں رہیں۔ یہ لوگ ہندوستان ہو کر چین تک دھاوا مارا کرتے
تھے اور واپسی پر چین کی نفع بخش اشیاء لے کر ہند کے مشرقی ساحلوں سے گذرتے ہوئے یمن، فلسطین
اور شام و مصر تک چلے جاتے تھے مشرقی بندرگاہوں میں بنگال کی قدیم ترین تملک نامی بندرگاہ مشرقی
ایشیائی تجارت کا اہم ذریعہ تھی[۳]۔ اسرائیلی اور روسی قبائل کے تجارتی جہاز ہند کے مغربی ساحل پر لنگر انداز
ہونے کے بعد جب مشرقی ساحلوں پر پہونچتے تو یہاں بھی ان کو بہت سی ایسی چیزیں ملتی تھیں جن کی چین میں
بہت کھپت تھی مثلاً ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگوں کی چین میں بڑی مانگ رہا کرتی تھی۔ اہل چین ان
سینگوں کو تراش کر اپنے اسلاف کی تصاویر ان پر کندہ کیا کرتے تھے اور مختلف سائز کی پیٹیاں بھی بناتے

تھے غرضکہ قبائلی تاجروں کے علاوہ خود ہندی تاجر بھی بری اور بحری راستوں سے ہندی سامان تجارت چین تک پہونچاتے تھے۔ چین سے خشکی کے ذریعہ تجارت کے کئی راستے تھے ایک راستہ آسام اور برما کے ذریعہ اور دوسرا خراسان ہوکر تھا۔ مشہور عرب سیاح اور جغرافیہ نویس مسعودی جو تقریباً نویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان آتے ہوئے خراسان گزرا تھا اپنے چشم دید بیان کے مطابق لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت خراسان تک جاری تھی اور چونکہ خراسانی سرحدوں سے چین خاص کو راستہ جاتا تھا اس لئے اس راستے سے بھی ہندی سامانِ تجارت چینی سرحدوں تک پہونچا کرتا تھا"۔ بحری تجارت کے سلسلہ میں اہل ہند کے بیرونی سفروں کا ذکر کتابوں میں بہت کم ملتا ہے بلیشتر مورخین ہندی جہاز رانوں کی ان کوششوں کے سلسلہ میں کوتاہ نظر آتے ہیں جو انھوں نے بحری راستوں کے ذریعہ ہندی تجارت کو مشرق و مغرب میں فروغ دینے کے لئے کی ہیں لیکن یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے کہ خود اہل ہند اپنے ہی جہازوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں ملکی مال تجارت پہنچاتے رہے ہیں[1]۔ "قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب" کے مصنف کی تحقیق کے بموجب ہندوستان کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے عرب و فارس، مصر و یونان، روم، چین اور جاوا سماٹرا سے قائم تھے اور ہندی جہاز ران آبی راستوں سے ان ممالک سے تجارتی فرائض انجام دیا کرتے تھے جس کے لئے انھوں نے بڑے بڑے تجارتی جہاز تیار کرائے تھے، ہندی جہاز رانی اور جہاز سازی کی شہرت قرب و جوار ہی میں نہ تھی بلکہ یورپ کے ملکوں تک پہنچ چکی تھی چنانچہ ڈاکٹر مکرجی نے اپنی مشہور تصنیف "اے ہسٹری آف انڈین شپنگ" میں یونانی مورخ آرین Arrian کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "دارا اور سکندر نے ہندوستان میں سینکڑوں جہاز تیار کرائے تھے"۔ نویں صدی کے مشہور عرب سیاح سلیمان تاجر نے ہندی دماغ کی اختراعی صلاحیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اہل ہند بڑے صناع اور مخترع ہیں، خصوصاً جہاز سازی کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور اعلیٰ درجے کے جہاز بناتے ہیں"۔ اسی سیاح نے جنوبی ہند کی ایک قدیم بندرگاہ کولم ملی میں جہازوں کی تعمیر اور مرمت کے ایک کارخانے کا بھی ذکر کیا ہے

---

[1] تاریخ البرامکہ، از مولانا عبدالرزاق کانپوری۔

ابن بطوطہ کے سفر نامہ سے بھی مالابار کے بوشن نامی بندرگاہ میں جہاز سازی کے کارخانے کا پتہ چلتا ہے، عرب جہازراں بھی اپنے جہاز یہاں تیار کراتے تھے چنانچہ عمان کے اسحاق نامی ایک یہودی تاجر نے اپنے جہاز ہندوستان میں تعمیر کرائے تھے۔[1]

ہندی جہاز سازی کی قدامت کے لحاظ سے یہ ذکر اعمی قریب کی بات ہے، ڈراوڑیوں کا ذوق جہازرانی اور جہاز سازی اب پردۂ خفا سے نکل کر منظر عام پر آگیا ہے کھدائیوں کے دوران کشتیوں کے کچھ ایسے نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ان کے فن جہازرانی اور جہاز سازی میں ماہر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس دھون نے یونی ورسٹی ایسوسی ایشن کے گزشتہ سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک بہت بڑی گودی کی تصویر حاضرین جلسہ کو دکھائی تھی جو حال ہی میں لوتھل (سوراشٹر) میں کھدائیوں کے دوران برآمد ہوئی ہے، ان تاریخی حوالوں کی موجودگی میں ہندی تاجروں کا اپنے جہازوں کے ذریعہ ہندی سامان تجارت مشرق بعید کے ساحلوں تک پہنچانا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

اہل رومہ کا ہندوستان سے تجارتی تعلق کا سلسلہ کب شروع ہوا، اس کا تعین قدرے مشکل ہے لیکن تقریباً چار سو قبل مسیح میں ہندی سامان فینقیوں کی معرفت فلسطین کی بندرگاہوں میں پہونچتا تھا اس کو رومی تاجر خرید کر رومہ لے جاتے تھے لیکن رومی اس بالواسطہ تجارت سے مطمئن نہ تھے ان کا ذہنی رجحان براہ راست تجارت کی طرف تھا مگر آبی شاہراہوں پر یونانیوں اور عربوں کے ملے جلے تسلط کی وجہ سے ایک صدی قبل مسیح تک اہل رومہ کو براہ راست تجارت کے مواقع فراہم نہ ہوسکے، بہرحال انھوں نے پہلی صدی عیسوی کی ابتدا ہی سے عربوں کو مطیع کرنے اور ہندی تجارت سے بے دخل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں چنانچہ ۱۰۵ء میں شام وفلسطین سے مصر جانے والے راستے کو اپنے اقتدار میں رکھنے کے لئے رومیوں نے عقبہ میں ایک زبردست فوجی چھاؤنی قائم کر لی تھی[2]۔ لیکن مسٹر الفنسٹن کی

---

[1] عرب وہند کے تعلقات [2] عرب وہند کے تعلقات۔

کہا جاتا ہے کہ ان کی یہ کوششیں پورے طور پر بار آور نہ ہو سکیں، قدیم رومی مورخ اسٹرابو کے بیان سے
بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربوں کو اس راستے سے پوری طرح بے دخل نہ کر سکے، ابھی حال میں آمبراپیٹ
کے تاکستاعن نامی گاؤں میں کھدائی کے دوران ایک صدی قبل مسیح کے رومی شہنشاہ آگسٹس کے کچھ سکے برآمد
ہوئے ہیں جن میں روم و ہند کے مابین براہ راست تجارت پر روشنی پڑتی ہے، علاوہ ازیں دکھنی ہندوستان
کے مختلف حصوں سے قیصر اغسطوس متوفی بارہ سال قبل مسیح کے عہد کے جو طلائی و نقرئی سکے دستیاب ہوئے
ہیں ان سے بھی اہل روما کا بحر قلزم کے راستے اپنی دلی آرزو کو عملی جامہ پہنانے کا ثبوت ملتا ہے، خود اہل
ہند کی بھی روما سے براہ راست تجارت کا ثبوت بھی موجود ہے چنانچہ چندرگپت موریہ کے لڑکے بندوسار
نے تقریباً ڈھائی سو قبل مسیح شام کے ایک رومی حاکم انٹیوکس اول کو کچھ تحائف بھیج کر شامی انجیر، رومی
شراب، اور یونانی فلسفیوں کو ہند روانہ کرنے کی فرمائش کی تھی[1]، رومی مورخ پلوٹارک نے بتایا ہے
کہ دکھن کے ایک راجا پنڈیوں نے قیصر روم کو ہند کی مختلف چیزیں جن میں ایک بیش قیمت ہار، ہاتھی دانت
اور خوشبو کی اشیاء شامل تھیں بطور سوغات بھیجی تھیں، بہر حال روم میں ہند کے مختلف سامان کی کھپت
رہا ہے ہندی شالیں، قالین، ظروف و زیورات، تلواریں، گنا، لوبان، سوتی اور ریشمین کپڑے،
کالی مرچیں اور مختلف قسم کی خوشبوئیں زیادہ درآمد ہوتی تھیں، ہند کی باریک اور خوش رنگ ساڑیاں
روما کی فیشن پرست عورتوں کو بہت پسند تھیں، عمدہ قسم کی نفیس مرچیں تقریباً پندرہ روپے سیر کے
حساب سے رومی بازاروں میں فروخت ہوا کرتی تھیں[2]۔ سوتی کپڑوں میں ڈھاکہ کی باریک ترین ململیں جو
گلیکو کے نام سے روما میں مشہور تھیں بہت زیادہ درآمد ہوتی تھیں[3]۔ رومی سلاطین و امرا کے ذوق کا یہ عالم
تھا کہ جب کبھی فلسطین کے راستے ہندی مصنوعات وغیرہ پہنچنے میں تاخیر ہوتی تو وہ ان اشیاء کو مصری
منڈیوں سے حاصل کرتے تھے[4]۔ دوسری صدی عیسوی کے وسط سے روما کے مختلف مقامات پر [illegible]

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب [2] رومۃ الکبریٰ از مولانا عبدالحلیم شرر [3] تاریخ البرامکہ
[4] ہندوستان کی صنعت و تجارت از عبدالصمد بہاری

کر سالانہ تجارتی میلے لگا کرتے تھے جن میں لاکھوں کروڑوں کا سامان تجارت فروخت ہوتا تھا اور یورپ کے
مختلف حصوں کے تاجر خرید و فروخت کے لئے ان جگہوں پر جمع ہو جاتے تھے۔ اس طرح ہندی سامان یورپ کے
تقریباً ہر حصے میں آسانی سے پہنچ جاتا تھا[1]۔ ہندی سامان کی روم میں درآمد اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ سونے
کی دولت تیزی سے ہندوستان کی طرف کھنچنے لگی تھی جس کی بنا پر روم کے ایک معاشی مفکر پلینی کو شکوہ
کناں انداز میں کہنا پڑا تھا کہ روم کی بہت بڑی دولت ہندوستان کی جانب تیزی سے بہتی چلی جا رہی ہے[2]۔
اسی مفکر نے اپنی تصنیف "نیچرل ہسٹری" میں لکھا ہے کہ روم سے نو لاکھ پونڈ ہر سال ہندوستان آیا کرتا
تھا۔ "قرون اولی میں ہندوستانی تہذیب" کے مصنف نے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے حوالے سے لکھا ہے
کہ صرف شہر روما میں چالیس لاکھ کا کپڑا ہندوستان سے درآمد ہوتا تھا۔ اہل یونان کا ابتدا میں ہندوستان
سے براہ راست تجارتی تعلق قائم نہ تھا بلکہ وہ مصر اور میسوپوٹامیہ میں عربوں کے درآمد کردہ مال تجارت سے
ہندی قالین، زیورات، ظروف، ہاتھی دانت کی مورتیاں، قیمتی پتھر، گرم مسالے، اور فولادی سامان خرید کر
یونان لے جاتے تھے لیکن تقریباً سو سال قبل مسیح یونانیوں کے مصر پر قابض و دخیل ہو جانے کے نتیجہ میں اسکندریہ
انطاکیہ اور روڈس بحر روم میں تجارت کے جدید مرکز بن گئے[3]۔ ان تجارتی مرکزوں سے ہندوستان کا مال
تجارت کثرت سے یونان پہونچنے لگا اور اس درآمدی سامان کو ملک کے اندرونی علاقوں میں پہونچانے
کے لئے سڑکیں اور پل وغیرہ تعمیر کئے گئے[4]۔ یونان میں ڈھاکہ کی ململوں کی بڑی قدر و منزلت تھی، ہندی شکر
بھی یونان میں درآمد ہوتی تھی چونکہ یونانیوں کو اس کا صحیح نام معلوم نہ تھا اس لئے وہ اس کو ہندی نمک اور
میٹھا نمک کہتے تھے۔ روما میں بھی یہ اسی نام سے مشہور تھی، یونانیوں نے اس کا ایک اور نام گنے کا شہد بھی
رکھ چھوڑا تھا۔ گنے کی بابت ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کا یہ وہ میٹھا درخت ہے جو مکھیوں کے بغیر
شہد پیدا کرتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی کے شروع میں عرب علاقوں سے بھی کھجور کی بنی ہوئی شکر مصر و یونان

---

[1] تہذیب مشرق و مغرب [2] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب از جے، سی کماریا

وغیرہ چین درآمد ہونے لگی تھی لیکن وہ رنگ اور ذائقہ میں خراب ہوتی تھی اس لئے دوسری صدی عیسوی کے آخر سے عرب تاجر ہندوستان سے سفید شکر خرید کر بحیرہ روم کے ساحلی مقامات پر فروخت کرنے لگے تھے[1] ہندی سامان تجارت کی یونان میں روز افزوں درآمد کی وجہ سے یونان کی دولت ہندوستان کی طرف منتقل ہوتی دیکھ کر قدیم یونانی مورخ پلینی "Pliny" کو کہنا پڑا تھا کہ ملکی محاصل کا معتدبہ حصہ ہندوستان سے تجارت کرنے میں ختم ہو جاتا ہے[2]۔

ابتدا میں اہل یونان نے کاروباری طریقوں میں کوئی جدت پیدا نہ کی بلکہ وہ اس معاملہ میں فینقیوں کے نقش قدم پر چلتے رہے لیکن کاروباری اثرات کی بنا پر ان کی دنیا کے سیاسی اور معاشی میدان میں بڑی طاقت حاصل ہو گئی، یونانی سمندر کے قریب بے شمار جزیروں کی موجودگی بھی اس کی تجارتی ترقی میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔

مصر و یونان اور چین و روما وغیرہ کے ہندوستان سے جو تجارتی تعلقات تھے ان کا مختصراً ذکر ہو چکا ہے لیکن عربوں کو اس معاملہ میں جو تقدیم و برتری حاصل رہی ہے اس میں ان کا کوئی حریف و مقابل نظر نہیں آتا۔ عرب کے قدیم افسانوی ادب کا بڑا حصہ سفری داستانوں سے بھرا پڑا ہے، سفر کی صعوبتیں راستوں کی مشکلات، عجائبات عالم کی سیر، خطۂ عالم میں بسنے والے انسانوں کے مختلف عادات خصائل جغرافیائی تاریخی حالات، تہذیب و تمدن کے دلچسپ تذکرے، ہمت و جرأت کے اسباق، سیر و سیاحت کے اذکار و لطائف اور تجارت کی صدہا باتیں ان افسانوی سفروں سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض دنیا میں جب سے بین الاقوامی تجارت کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے عرب اس کاروباری سلسلہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہندوستان سے عربوں کے ابتدائی تجارتی مرکز حضرموت، یمن، فلسطین اور شام کے علاقے رہے ہیں۔ بعد کو اس سلسلہ میں حجاز بھی شامل نظر آتا ہے۔ جب یہ سلسلۂ تجارت دراز ہوا تو عرب کے تقریباً ہر قبیلہ نے اس میدان میں مسابقت شروع کر دی اسی بنا پر عرب کبھی

---

[1] دنیا کی صنعت شکر سازی از پروفیسر گرلینگس [2] غریب ہندوستان صفحہ ۲۷، از مولوی ولی حسن

فنیقیوں کے نام سے آبی راستوں کو طے کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی قوم سبا کے نام سے ہندی تجارت کو زندگی کا دلچسپ مشغلہ بنائے نظر آتے ہیں اور کبھی بابلی، آشوری، حمیری اور اسرائیلی نام سے تجارت کے میدان میں تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں نام خواہ کچھ ہو لیکن قومیت اور وطنیت کے لحاظ سے یہ سب عربی النسل تھے اور ہندوستان میں ان کی آمد و رفت کا سلسلہ مسیح سے تقریباً تین ہزار سال پہلے سے جاری تھا۔ مسٹر الفنسٹن کے بیان سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ قوم سبا عرب کی ایک تجارت پیشہ قوم تھی جو یمنی علاقوں میں آباد تھی اور ہندوستان کی فولادی اشیا، تلواریں، نیزے اور دوسری مختلف مصنوعات یمن تک لے جاتی تھی اور وہاں سے یہ تمام سامان دست بدست . . . . مصر تک پہونچا کرتا تھا[1] اور علامہ سید سلیمان صاحب کی تحقیق کے بموجب بھی یمنی تاجر چھ سو قبل مسیح ہندی سامان تجارت یمن لے جایا کرتے تھے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم زمانہ سے یمن کی متعدد بندرگاہوں کے ذریعہ ہندی مصنوعات کی درآمد کا سلسلہ جاری تھا، اسلام سے بہت قبل یہ بندرگاہیں ہندی سامان کی بڑی منڈیاں تھیں اور اس تمام علاقہ میں قوم سبا کے علاوہ حمیری اور عاد قوم کے قبائل بھی آباد تھے، قرآن مجید کی سورۃ سبا میں ان قدیم اقوام کا ذکر تمثیلی اور تاریخی حیثیت سے مذکور ہے ان تمام قوموں کا ہندوستان سے تجارتی تعلق کسی نہ کسی نوع سے قائم رہا ہے، خصوصاً قوم سبا جس کا سیاسی اور معاشی اقتدار صدہا برس تک یمن پر قائم رہا۔ تجارتی تگ و دو میں دوسری دونوں قوموں سے بہت آگے تھی اور اسی تجارت پیشہ قوم کے ذریعہ ہندی سامان تجارت افریقی علاقوں تک پہونچا کرتا تھا۔ حضرت یوسف کو کنویں سے نکالنے والا وہ تجارتی قافلہ جس کے پاس ہندی بخورات کے علاوہ ہندی تلواریں بھی تھیں یمن میں بسنے والی قوموں میں سے غالباً قوم سبا ہی سے تعلق رکھتا تھا[2]۔ فجر الاسلام کے مصنف نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

---

[1] تاریخ الفنسٹن صفحہ ۱۸۳

[2] قصص القرآن صفحہ ۲۶۰ از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم

"وكان لسكان اليمن قديماً علاقات بالهند والشرق الادنى"[1]

زمانۂ قدیم کی تاریخ سے متعلق جو مواد موجود ہے اس سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہے کہ اس زمانہ میں ہند و چین اور اسی طرح مشرقی افریقہ، مصر و شام، ایشیائے کوچک، اور یونان و روم کے مابین تجارت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک عربوں کے واسطے سے ہوتی تھی ہندوستان سے تجارت کے تین بڑے راستے تھے ایک ایران سے خشکی کا راستہ جو عراق و شام تک جاتا تھا دوسرا خلیج فارس کا راستہ جس سے تمام سامان عرب کے مشرقی ساحل پر اترتا تھا اور دومۃ الجندل یا تدمر Palmyra ہوتا ہوا آگے جاتا تھا تیسرا راستہ بحر ہند کا تھا جس سے جانے والا مال حضرموت اور یمن سے گزرتا تھا۔ یہ تینوں راستے وہ تھے جن پر عرب آباد تھے عرب ایک طرف مال خریدتے اور دوسری طرف اسے فروخت کرتے تھے اور تجارتی نقل و حمل کا کاروبار بھی کرتے تھے اس کے علاوہ اپنے علاقوں سے گزرنے والے قافلوں سے بھاری ٹیکس لے کر انھیں بحفاظت طے کرانے کا ذمہ بھی لیتے تھے ان تینوں صورتوں میں بین الاقوامی تجارت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق قائم رہا ہے۔

خاص قلب عرب (حجاز) کی تجارت کا سلسلہ بھی بہت قدیم ہے، شمال حجاز میں مدین اور ددان کی تجارت مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا کے مختلف سامان تجارت کے ساتھ ہندی مال تجارت پر بہت کچھ منحصر تھی، حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے قریب کے زمانہ میں فلسطین کے یہودی، یثرب، وادی القریٰ، تیمار اور تبوک میں آکر آباد ہو گئے تھے ان کے مذہبی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات شام و فلسطین کے عربی النسل یہودیوں سے قائم ہوئے اور یہاں کے یہودی دوسرے ملکوں کے سامان کے ساتھ ہندی مال تجارت ان نو آباد شدہ یہودیوں کی معرفت مذکورہ مقامات پر پہنچاتے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں قبیلہ قریش نے بھی عرب کی بیرونی تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور پیغمبر اسلامؐ کے عہد مبارک تک ایک طرف یمن و حبش دوسری جانب مصر و شام سے ان کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ خود پیغمبر اسلامؐ شرف نبوت سے قبل جناب خدیجہؓ کا مال تجارت

---

[1] فجر الاسلام جلد اول صفحہ ۳

ملک شام تشریف لے گئے تھے اور چونکہ شام کا علاقہ اس وقت ہندی سامان کی ایک بڑی منڈی تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ آں حضرتؐ نے بھی کسی ہندی سامان کو پسند فرمایا ہو۔ بیروت کے روزنامہ المنار نے ۶ جنوری ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں حجازی قبائل کی اس تجارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عظیم ہندوستان عرب دنیا سے کبھی بھی علاحدہ نہیں رہا۔ حضرت عیسیٰ سے بہت ہی قبل مال سے لدے جہازوں نے بحرِ ہند کو عبور کرکے برصغیر ہند کا عرب ممالک سے ناتا جوڑ دیا تھا اور حضرت محمدؐ سے قبل اور ان کے عہد میں عرب قافلے اس مال کی خرید و فروخت کرتے تھے جو ہندوستانی جہاز ہند سے ملک شام لایا کرتے تھے۔ حجاز کا علاقہ معاشی اور صنعتی اعتبار سے بہت ہی پس ماندہ واقع ہوا تھا حتیٰ کہ اشیائے خوردنی کا بھی بڑا حصہ باہر ہی سے درآمد ہوتا تھا حضور اکرمؐ کے زمانہ میں یہ درآمدی تجارت زیادہ تر دو گروہوں کے ہاتھ میں تھی ایک قریش و ثقیف کے قبیلے، دوسرے یہود، یہ قبائل خاندانی طور سے تجارت پیشہ تھے، صحابہ کرامؓ میں بہت سے ایسے نام ملتے ہیں جن کا معاشی پیشہ قبل اور بعد اسلام تجارت ہی نظر آتا ہے بلکہ ان کے تجارتی قافلے حبش، یمن اور مصر تک آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں، ان تجارتی قافلوں کی رہنمائی صحابۂ رسولؐ بذات خود بھی کرتے تھے مگر زیادہ تر کاروبار ایسے ملازمین انجام دیتے تھے جن کی دیانت مسلمہ اور کاروباری صلاحیت مسلمہ ہوتی تھی۔ ان کو جس ملک کا سامان بھی ملتا تھا اس کو وہ عرب کے اندرونی علاقوں تک پہنچاتے تھے، درآمد شدہ مال کی تھوک فروشی ان کا کام تھا۔ اندرون ملک کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبائلی علاقوں میں یہ کام مقامی خوردہ فروش تاجر کیا کرتے تھے چونکہ شمالی حجاز کی تجارت میں مسیح سے کئی صدی بعد تک ہندی سامان کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہوتا تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس عہد میں بھی ہندی سامان کی تجارت سے فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہو۔ ہندوستان سے عربوں کی تجارت کا سارا دروبست ہمیشہ آبی شاہراہوں کے ذریعہ قائم رہا۔ ابتدا میں یہ ایک قسم کی چلتی پھرتی تجارت تھی لیکن اسلام کے کچھ صدیوں پہلے عرب کے یہودی اور عیسائی سوداگروں نے سرزمین ہند کو ہیڈ کوارٹر بنا کر تجارت کی نئی بنیاد ڈالی اور ظہور اسلام سے کچھ صدی بعد مسلمان عربوں نے سندھ، بلوچستان، کچھ، کاٹھیاواڑ اور جنوبی ہند کے ساحلی مقامات پر بود و باش اختیار کرلی۔ یہ لوگ یہیں سے درآمدی و برآمدی تجارت کرتے تھے ان کو ان ساحلی

علاقوں میں ہر قسم کی مصنوعات اور خام سامان آسانی سے میسر آجاتا تھا کچھ سامان تو ان علاقوں میں خود
پیدا اور تیار ہوتا تھا اور کچھ ہندی تاجروں کے قافلوں کے ذریعہ مذکورہ ساحلی علاقوں تک پہونچتا
تھا اور وہاں سے یہ سب سامان عربوں کی تجارتی ایجنسیوں کی معرفت دوسرے ملکوں کو چلا جاتا تھا۔ سندھ
اور بلوچستان کی بندرگاہیں دیبل (موجودہ کراچی) تیز اور واہل خلیج فارس کے علاقوں سے قریب تر تھیں،
ان بندرگاہوں سے بادبانی کشتیوں کے ذریعہ حضرموت، عمان اور عراق کے کنارے تک یہ سامان آسانی
سے پہنچ سکتا تھا اس لئے یہاں عربی تاجروں کی متعدد بستیاں قائم ہوگئی تھیں، ابن حوقل کے بیان کے
مطابق دیبل آباد شدہ عربی تاجروں کا اہم مرکز تھا۔ سندھ اور پنجاب کی جملہ پیداوار اسی بندرگاہ سے
عرب علاقوں میں پہونچ کر دور دراز خطوں تک پہنچتی تھیں، گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہیں تھانہ،
سوپارہ۔ چیمور اور کھمبائت وغیرہ عربوں کی بود و باش اور تجارت کی تجارتی چہل پہل کا مرکز بن گئی
تھیں۔ ابن سعید مغربی کے نزدیک "تھانہ" گجرات کا آخری تجارتی شہر تھا اور تجارتی گرم بازاری کی بناپر
عربی تاجروں کی زبان پر اس کا نام تھا اور اس ہندی ساحل پر بسنے والے ہندوؤں کے ساتھ عربی تاجروں
کی ایک معقول تعداد آباد تھی، کھمبائت کا سارا تجارتی نظم و نسق اور کاروباری اقتدار ان عربی تاجروں اور
جہازرانوں کے ہاتھ میں تھا جو مسلمان فاتحین کی آمد سے بہت پہلے یہاں بسلسلۂ تجارت آباد تھے ابن بطوطہ
کی تحقیق کے بموجب یہاں کے اکثر و بیشتر مقامی تاجر بھی عرب ملکوں سے انفرادی طور پر بھی تجارتی تعلق
رکھتے تھے اس سے کچھ اور آگے بڑھ کر مدراس اور مالابار میں بھی عرب سوداگروں کی معقول تعداد آباد
تھی جن کے ذریعہ بصرہ، عمان اور سیراف وغیرہ کو ہندی سامان تجارت جایا کرتا تھا۔ جنوبی ہند کی
تینوں مشہور بندرگاہوں کالی کٹ، کولم ملی اور جونین میں مقیم عربوں کا بہت اچھا رعب و داب پھیلا ہوا تھا۔ کالی کٹ
میں دنیا بھر کے سرکردہ تاجر جمع ہوا کرتے تھے لیکن تجارتی اجارہ داری یہاں کے مقیم عربوں کے ہاتھوں
میں تھی اس لئے چین، جاوا، ساترا، سیلون اور فارس وغیرہ کے جملہ تاجر انہی مقیم عربی تاجروں کے
پاس قیام کرتے تھے یہاں کا ملک التجار ابراہیم شاہ بندر نامی ایک عرب باشندہ تھا۔ دنیا بھر کے سوداگر
اس کے وسیع دسترخوان پر بیٹھ کر انواع اقسام کے لذیذ کھانوں اور عمدہ قسم کی مشروبات سے لطف

بستے تھے جب کہ ایک اور عرب سوداگر ناخدا اشتمال نامی بھی یہیں رہتا تھا اس کے اپنے تجارتی جہاز تھے جو ہندوستان سے چین، جاوا، فارس اور یمن وغیرہ تک جایا کرتے تھے۔ ان مقیم عربوں کی تجارت کی وجہ کی بدولت یہاں کے راجہ کو بڑی آمدنی ہوتی تھی اس لئے وہ عرب سوداگروں کی خبر گیری اور حفاظت اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ کولم ملی کی بھی ساری رونق اور چہل پہل تجارتی جہازوں پر قائم تھی۔ اس شہر کی تجارت بھی یہاں کے مقیم عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب سوداگر ہندی مال کی تجارت سے اتنے مالدار ہو گئے تھے کہ ہر سوداگر اپنا علاحدہ مال گودام رکھتا تھا اور اس کے ذاتی جہاز بھی ہوتے تھے جو ہندی مال تجارت سے لد کر بیرون ہند جایا کرتے تھے، عمان کا اسحاق نامی ایک عرب یہودی دلال اپنے رفقائے کار سے ناراض ہو کر اس جگہ چلا آیا اور کولم ملی کے جہاز سازی کے کارخانے میں اپنے جہاز تعمیر کرا کر مشرق و مغرب میں اپنے گماشتوں کے ذریعہ سامان درآمد و برآمد کرنے لگا۔ وطن کی واپسی کی بنا پر تمام جہازی اثاثے فروخت کرنے پر اس کو اتنی کثیر دولت ہاتھ لگی کہ عمان پہونچنے پر وہاں کے کسٹم افیسر نے ایک لاکھ درہم بطور رشوت اس سے وصول کئے تھے۔ عربوں کو اتنی کثیر دولت سمیٹتے دیکھ کر جنوبی ہند کے راجاؤں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا چنانچہ ملیبار کے دو راجاؤں چکروتی اور کوئیل نے عربوں کی شرکت میں ایک تجارتی بیڑہ تعمیر کرایا تھا جو جوئین کی بندرگاہ سے فارس و یمن تک ہندی مال تجارت پہونچایا کرتا تھا۔ جوئین کی تجارتی اجارہ داری بھی کلیتہً یہاں کے مقیم عرب تاجروں اور جہاز رانوں کے ہاتھ میں تھی۔ راجہ کوئیل کا مربیانہ برتاؤ ان عرب تاجروں کے ساتھ بھی وہی تھا جو کولم ملی کے عرب تاجروں کے ساتھ تھا اگر کوئی عرب تاجر مر جاتا تو راجہ اس کا تمام مال اس کے وطن مالوف پہونچا دیتا حتیٰ کہ اس کے متروکہ میں سے بطور ٹیکس بھی کچھ وصول نہیں کرتا۔ ساحل مندڑ کا ساحل بھی عرب تاجروں کے قیام کا بڑا مرکز تھا یہاں سے عراق اور عرب کے دیگر حصوں کو کثرت سے ہندی سامان برآمد کیا جاتا تھا۔

اس اقامت اور بود و باش کا نقشہ بعض مورخین نے اس طرح کھینچا ہے کہ ہندی صنعت کار یہ

اور پیداوار سے عربوں کو غیر معمولی دلچسپی تھی اس لئے عرب تاجر مع اہل و عیال کے بحری راستوں سے ہند کے مختلف ساحلوں، خصوصاً جنوبی ہند کے اکثر و بیشتر ساحلوں پر ہندی مصنوعات وغیرہ کی خریداری اور اشیاء کے تبادلہ کے لئے اترا کرتے تھے ان میں سے کچھ لوگ مہینوں اور برسوں قیام کرتے اور کچھ توطن بھی اختیار کر لیتے اور اکثر شادی بیاہ بھی کر لیتے تھے جس کے نتیجہ میں جنوبی ہند کے ساحلی خطوں میں عربی زبان نے بھی اپنا معقول اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہندی مصنوعات اور خام سامان سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور جنوبی ہند کی تمام بندرگاہوں سے انہی مقیم اور غیر مقیم عربوں کی معرفت زیادہ تر یمن کے ساحلوں تک پہونچا کرتا تھا اور یہاں سے اشتران بارکش کے ذریعہ بحر احمر کے کنارے کنارے شام و مصر تک اور وہاں سے بحر روم کے راستے روم اور روما سے پورے یورپ میں درآمد ہوتا تھا۔

غیر عرب یہودیوں کے توسل سے بھی ہندی سامان تجارت مشرق و مغرب میں پہونچ رہا ہے مصر و شام، عراق و ایران، روم و قلزم اور بحر ہند پر مسلمان عربوں کے سیاسی اقتدار ہو جانے کے بعد ہند اور یورپ کی تجارت غیر عرب یہودیوں کی معرفت ہونے لگی تھی، یہ لوگ اسلامی ملکوں اور یورپ دونوں جگہ روشناس تھے اور عرب و عیسائی ملکوں میں آمد و رفت کی بنا پر ان کی زبانوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے اس لئے ان کو تجارت میں نسبتاً زیادہ آسانیاں حاصل تھیں اور عرب و عیسائی تاجروں کے مابین یہ درمیانگی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے[1]۔ مشہور مورخ ابن خرداذبہ کے بیان کے مطابق یہ بری اور بحری راستوں سے دنیا کے کونے کونے میں تجارتی لین دین بھی کرتے پھرتے تھے اور جس جگہ ان کو نفع بخش سامان ملتا اس کو لے کر دوسری جگہ پہنچاتے تھے ہندوستان میں ان کی تجارتی آمد و رفت دو راستوں سے ہوا کرتی تھی، وہ مغرب سے نکل کر بحر روم کے مصری ساحلوں پر اتر کر خرید و فروخت کرتے اور وہاں سے اشتران بارکش کے ذریعہ بحر قلزم

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات

تک آتے پھر جہازوں کے ذریعہ جدہ اور یہاں سے ہندوستان پہونچتے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد ہندی مال تجارت جہازوں پر بار کر کے چین تک لے جاتے تھے پھر اسی راستہ سے مشرق بعید کا سامان سرزمین ہند لاتے اور یہاں کی مصنوعات وغیرہ مغربی ممالک تک پہونچاتے تھے ان کا دوسرا راستہ یہ تھا کہ عرب سے نکل کر بحر روم پار کر کے شام پہنچتے اور خشکی کے ذریعہ بغداد آتے پھر اس راستہ سے اس وقت کی مشہور بندرگاہ آبلہ میں داخل ہوتے اور یہاں سے براہِ عمان ہندوستان آتے اور ہندی سامان جہازوں پر بار کر کے چین تک چلے جاتے تھے ان دونوں سفروں میں ہند کا مصنوعہ اور خام سامان ان کی معرفت ایک طرف چینی سواحل اور دوسری جانب مغربی ممالک تک پہونچا کرتا تھا۔

برآمدی اشیاء:۔ ہند کی برآمدی اشیاء میں سب سے زیادہ قدامت لوہے اور فولاد کو حاصل ہے اس کے بعد روئی، قیمتی پتھر، شکر، گڑ، مسالے اور ہاتھی دانت کا بالترتیب نمبر آتا ہے، تدریجاً اس برآمدی فہرست میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ دنیا کی ضرورت کی تقریباً ہر چیز برآمد ہونے لگی، ابن خردازبہ کی مرتبہ فہرست میں عود، آبنوس، بید، جائفل، جاوتری، الائچی، تیزپات، کباب چینی، لوبان، مشک اور دیگر خوشبودار چیزوں کے علاوہ خوش رنگ قالین، نظر نواز شالیں، ریشمیں اور سوتی اونی کپڑے باریک ململیں، جنوبی ہند کی چھینٹیں، کھمبات کے اعلیٰ قسم کے جوتے، منقش ظروف و زیورات، سیسہ، توتیہ، ناریل اور اس کے ریشوں کی مصنوعات، بانس، شیشے اور کانچ کا مصنوعہ سامان اور مختلف قسم کی ادویہ شامل ہیں، بشاری اور ہمدانی نے اپنی مرتبہ فہرستوں میں ان اشیاء کا اضافہ کیا، گینڈے کے سینگ اور ہاتھی دانت کی مصنوعہ اشیا کے علاوہ کالا نمک، مکھن، رنگ، سنبل، خولنجان، ہڑ بہیڑہ، ساگوان کی لکڑی، قرنفل، سونٹھ، نیل، ادرک، نیلوفر، تلواریں، خنجر، بلم بھالے، آلات جراحی، کالی مرچیں، تلہن، چاول، لیموں، کیلا، شہد، مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں، سونے چاندی کی مورتیاں، اور خوش رنگ و خوش گلو پرندے وغیرہ ان اشیا میں سے جن چیزوں کی جس ملک میں زیادہ کھپت ہوتی تھی دنیا کے تاجر انھیں چیزوں کو لے کر اس ملک میں پہونچتے اور خاطر خواہ نفع حاصل کرتے تھے کسی عرب شاعر نے اس تفصیل کو نظم کا جامہ بڑی خوبی سے پہنایا ہے جس کے چند اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"اے میری جان کی قسم یہ وہ سرزمین ہے کہ جب اس میں پانی برستا ہے تو دودھ، موتی اور یاقوت
اس سے پیدا ہوتے ہیں ان کے لئے جو اس آرائش کے سامان سے خالی ہیں، اس کی خاص
چیزوں میں مشک، کافور، عنبر، عود اور طرح طرح کی خوشبوئیں ہیں جو گندے اور میلے
رہتے ہیں، اور طرح طرح کے عطریات، جائفل، سنبل، ہاتھی دانت، ساگوان اور دوسری
خوشبودار لکڑیاں اور صندل وغیرہ ہیں اس میں توتیا اتنا ہوتا ہے جیسے اس کے بڑے
بڑے پہاڑ کے ٹکڑے ہوں، اس میں شیر ببر، چیتے اور ہاتھی وغیرہ بھی ہیں۔"

آفاق حسین صدیقی

ایک ملاقات، ایک یاد

بوجھل، خار آلود پلکیں، تھکا تھکا سا چہرہ، بے ترتیب پریشان بال، اور کسی سیٹھ کا سا جسم اس پر ایک مخصوص لباس جو قدیم و جدید کا سنگم کہا جا سکتا ہے۔ میرا تصور بکھر کر چور چور ہو گیا۔ وہ شاعر جس کی نظموں میں رومانیت کا رس بھرا ہے۔ جس کے ہر شعر سے رنگینی اور رعنائی پھوٹی پڑتی ہے۔ جو سنگلاخ وادیوں میں بھی شوخیوں سے نہیں چوکتا۔ جو زندگی کو ساغر اور موت کو گلابی پری سمجھتا ہے۔ مشکلات کو ارغوانی شراب سمجھ کر پی جانے کا درس دیتا ہے اس کے متعلق میرے ذہن میں ایک منفرد تصور تھا جو پہلی نظر دیکھنے کے بعد مجروح ہو گیا۔ لیکن سیپ کے اندر موتی ہوتا ہے۔ یہ احساس چند لمحوں کے بعد ہوا اور وہ تصور جو چند لمحوں پہلے مجروح ہو گیا تھا یکایک مسکرا اٹھا۔ اور میں مطمئن ہو گیا کہ سلام صاحب سے متعلق میں نے جو نظریہ قائم کیا تھا وہ ان کے چہرے پر صادق نہ ہو لیکن ان کے اخلاق، عادات و اطوار اور انداز گفتگو پر ضرور صادق آتا ہے۔ سلام صاحب کوئی نیا کردار نہیں وہی ہمارے جانے پہچانے سلام مچھلی شہری ہیں جن کی رنگینیاں بکھیرتی ہوئی نظمیں ہم سنا اور پڑھا کرتے ہیں۔

سلام صاحب سے میری ملاقات توی صاحب کے گھر پر ہوئی جہاں وہ سیفیہ کالج کے مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ توی صاحب نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں سلام صاحب سے تعارف کرایا۔ اور اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ میں اور سلام صاحب۔ اب ہم دونوں تھے۔ نہ جانے کون سی خوبی تھی کہ چند لمحوں کے بعد اجنبیت کے تمام پردے اٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں انھیں برسوں سے جانتا ہوں۔ اور کبھی بھی اجنبیت یا تکلف کی کوئی دیوار ہمارے درمیان نہیں رہی۔ ماحول کے اندر جذب ہو جانا اور اپنے پر لطف انداز گفتگو سے محفل کو

لالہ زار بنا دینا یقیناً ان کی بلند نظری اور شوخ طبیعت کا ہی ثبوت ہے ۔ ہم دونوں کے درمیان گفتگو شروع ہوئی۔ تکلف اور رسمیات سے بے نیاز۔۔ ۔۔۔۔

میں نے پوچھا ۔سلام صاحب، آج ہمارے ادب کے کیا تقاضے ہیں ؟

انھوں نے کہا۔ تمھارا یہ سوال اہم ہے، اس کے لئے طویل بحث مطلوب ہے ۔آج جبکہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور بدل رہا ہے حدتو یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ کل یا چند لمحات کے بعد کیا ہو جائے گا۔ کیا تبدیلیاں رونما ہو جائیں گی ۔ ایسے حالات میں ادب کے بڑے اہم اور وسیع فرائض ہیں۔اور اسے ہر وقت ہر تغیر کے لئے تیار رہنا چاہئے ۔ اب تم ہی دیکھو کون جانتا تھا کہ چین ہم پر حملہ کر دے گا ۔ہم سے اور پاکستان سے جنگ ہوگی۔لیکن یہ ہوا ۔ اسی لئے ادب کو ہر قسم کی تبدیلی اور انقلاب کے لئے تیار رہنا چاہئے ۔ ادب کو پورے طور پر زمانہ سے وابستہ رہ کر کلچر اور تہذیب سے جو بدل رہی ہے تعاون کرنا چاہئے ۔پرانی تہذیب یا قدیم کلچر کی تقلید کرنا یا اس پر چلنا غیر دانشمندی ہے ۔خاص کر نوجوان طبقہ کو تو پوری طرح ہشیار ہونا ہے اور تبھی زندگی آگے بڑھ سکے گی اور ادب ترقی کر سکے گا۔ آج جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان سے ہر ادیب ،مصنف اور شاعر کو واقفیت حاصل کرنا چاہئے اور ان کو ہی اپنے تخیل و فکر کا مرکز منتخب کرنا چاہئے۔

کلچر کی تبدیلی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔تم ہی سوچو، آج دجلہ اور فرات ہم کو بالکل متاثر نہیں کرتے ۔ اسی لئے ہم لوگ شاعری میں دجلہ اور فرات کے بجائے گنگ و جمن جیسی تشبیہات اور قدیم چیزوں کے بجائے ایٹم ، راکٹ ، چاند اور سائنس سے متعلق موضوعات کا استعمال کرتے ہیں۔

سلام صاحب خاموش ہو گئے ۔میں نے پھر ان سے ایک سوال کیا۔۔ ۔ زبان اور ادب کے لئے نوجوانوں کے کیا فرائض ہیں ؟

انھوں نے کہا۔ تمھارا سوال اچھا ہے ۔ اس قسم کی گفتگو فائدہ مند ہوتی ہے ۔اور دوسری باتیں اور مشاعرہ وغیرہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ہاں ۔ تو نوجوانوں کے فرائض ۔۔۔۔ نوجوانوں کے فرائض بڑے اہم اور وسیع ہیں ـــــ خاص طور پر ان نوجوانوں کے ، جو کالجوں میں زیر تعلیم ہیں ،نوجوانوں سے

مقصد صرف لڑکا ہی نہیں ان میں لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ میں مخلوط تعلیم کا طرفدار ہوں، اس سے دونوں
صنفوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور آج جب کہ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے انہیں
کندھے سے کندھا ملا کر چلنا چاہیئے۔ زندگی کا صحیح لطف جبھی آتا ہے۔ ہاں تو کہہ یہ رہا تھا کہ نوجوانوں
کو پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ ادب، زبان اور ملک وقوم سب
کا دارومدار آج کے نوجوانوں پر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ نوجوان اپنی تعلیم سے غافل نہ ہوں۔ اس میں
غور وخوض اور محنت کے ساتھ دلچسپی لیں۔ پڑھنا محض پڑھنا بیکار ہے بلکہ پڑھنا اس لئے چاہیئے کہ
اس سے انھیں دنیا میں کچھ کرنا ہے۔ زندگی کا شعور سیکھنا اور سکھانا ہے۔ آج کا دور ان لوگوں کیلئے
بالکل نہیں جو سست یا کاہل ہیں یا قسمت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ زندگی، قوم اور علم وادب کی
ترقی کے لئے جدوجہد ضروری ہے۔ اور نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ مسلسل جدوجہد کریں علم
ادب کو زندگی کا اہم ترین مقصد سمجھ کر اس کو حاصل کرنے کے لئے اس میں جٹ جائیں۔ جہاں تک
زبان کا تعلق ہے تم سب نوجوانوں کا یہ فرض ہے کہ ادب کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرو۔ سمجھو۔ لیکن صرف
مطالعہ سے ہی کام نہیں چلتا بلکہ مطالعہ کرنے کے بعد ان خیالات کو جو مطالعہ سے حاصل کئے
ہیں اپنی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ جستجو کا شوق بڑھے گا
خود اعتمادی پیدا ہوگی۔

زبان کے لئے قربانی کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا کچھ وقت زبان کے لئے
وقف کردیں۔ زندگی کی اور دوسری اہم ضروریات کی طرح زبان بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ نوجوان جو
اردو جانتے ہیں سب سے پہلے اپنے ان دوستوں کو جو اردو نہیں جانتے اردو پڑھائیں۔ ان میں اردو
پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ ایک تنظیم بنائیں۔ سوسائیٹیاں قائم کریں۔ اور غریب طلبہ کو جو تعلیم سے
محروم ہیں انھیں تعلیم دیں۔ پہلے چھوٹے چھوٹے اسکول قائم کریں۔ پھر ان اسکولوں کو بڑھائیں
ترقی دیں۔ آپ کے شہر میں ایسے اسکول ہونے چاہئیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اسی کے
ساتھ چندہ کرکے، کتابیں جمع کرکے لائبریریاں اور کتب خانے قائم کریں، اردو اخبارات و

رسائل منگائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اور زمانہ سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ سائنسی ریسرچ اور سائنسی تحقیقات سے متعلق کتابوں اور رسائل کا جو بیرونی ممالک سے آتے ہیں اور ان تمام مضامین کا جو ایجادات و انکشافات سے تعلق رکھتے ہیں مطالعہ کریں اور ان کا اردو ترجمہ کریں تاکہ وہ عام ہوسکیں۔ اس طرح جہاں زبان میں ترقی ہوگی وہیں ادب کے خزانہ میں بھی اضافہ ہوگا اور لوگوں میں زندہ رہنے کا شعور پیدا ہوگا۔ میں یہ پھر کہوں گا کہ زبان کا کلچر سے گہرا تعلق ہے جب تک کوئی زبان کلچر سے متعلق نہ ہوگی اس کی ترقی ناممکن ہے۔

زبان اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا اردو کا مستقبل جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں واقعی تاریک ہے ــــ ؟

انھوں نے برجستہ کہا "یہ بے وقوفی کی بات ہے"۔ اردو زبان کوئی محدود و مخصوص زبان نہیں نہ ہی وہ کسی ایک طبقہ کی زبان ہے جو اس کا مستقبل تاریک ہو۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے یہاں کے خاص و عام کی زبان ہے۔ تہذیب کی ترجمان ہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب میں اردو الفاظ شامل ہیں۔ ہندوستان میں یہ واحد زبان ہے جو ملک کے ہر گوشہ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کے درمیان بولی اور سمجھی جاتی ہے، جو لوگ اسے صرف مخصوص طبقہ کی زبان سمجھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ زبانیں اس وقت برباد ہوجاتی ہیں جب وہ حالات کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے کبھی اردو کو مخصوص یا محدود رکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کا دامن حالات کے تقاضوں سے بچایا۔ ہندوستان کی آزادی کی پوری تاریخ میں اردو کا جو نمایاں حصہ رہا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے۔ اور آج بھی وہ پورے طور پر نظام نو کے تقاضوں کو پورا کررہی ہے۔ حالات اور واقعات کا ساتھ دے رہی ہے۔ ہر روز ہونے والے انقلابات اور تبدیلیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ اور کلی طور پر کلچر سے متعلق ہے تو پھر ایسی صورت میں اس کے مستقبل کے بارے میں کسی برے

خیال کا تصور بھی فضول اور غیر دانشمندانہ ہے۔

سلام صاحب۔ کچھ لوگوں پر مایوسی طاری ہے۔ وہ کہتے ہیں " ہم اردو پڑھ کر کیا کریں گے ؟" ان کے اس خیال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

انھوں نے کہا۔ یہ خیال غلط ہے آج ہندوستان آزاد ہے۔ یہاں مکمل جمہوریت ہے۔ جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جو ترقی کے لئے مواقع فراہم کرتا اور راہیں کھولتا ہے۔ آپ خود اپنے میں ہمت وحوصلہ پیدا کیجئے۔ اور اپنے حقوق اپنی لیاقت وقابلیت سے حاصل کیجئے۔ صرف سوچتے رہنے، بیٹھے رہنے یا محض باتیں کرنے سے ہی کام نہیں چلتا۔ جہاں تک زبان کا مسئلہ ہے اردو اسی دور میں پھولی پھلی ہے جب حکومت کی زبان فارسی تھی اور چاروں طرف اسی کا دور دورہ تھا تو پھر آج یہ مایوسی کیوں ؟

سلام صاحب۔ زبان کی ترقی اور اس کے پھیلاؤ کے لئے آج کیا ہونا چاہئے۔

کچھ سوچتے ہوئے سلام صاحب ایک دم سنبھل گئے اور بولے۔ ہوں ۔۔۔ آج زبان کی ترقی و وسعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ جہاں اسے جدید رجحانات سے مرصع کیا جائے۔ جدید ایجادات وانکشافات سے متعارف کرایا جائے اور سائنسی و تحقیقی مضامین کا اس میں ترجمہ کیا جائے وہیں زبان سادہ اور عام فہم بھی ہو۔ سخت الفاظ اور مبہم اشارے زبان کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اور جب کہ آج فارسی و عربی کوئی نہیں سمجھتا ایسی صورت میں ایسے الفاظ لانا، دقیق الفاظ کا استعمال کرنا اچھا نہیں۔ زبان میں اچھے اور دلکش الفاظ کا استعمال ہونا چاہئے۔ اسی کے ساتھ لفظوں کا تناسب اور موزوں استعمال زبان کی شیرینی کو بڑھا دیتا ہے جیسے "گلاب کی خوشبو" "یاسمین کے پھولوں کی مہک" "باد صبا کی مست خرامی" "نسیم صبح کا چلنا" وغیرہ وغیرہ

اور ۔۔۔ اردو ہمیشہ سے دوسروں کے آئینہ میں اپنے کو ڈھالتی رہی ہے۔ پہلے فارسی، عربی اور پھر کھڑی بولی میں اس نے اپنے کو نکھارا اور سنوارا ہے۔ یہی اس کی زندگی اور بقا کا سبب ہے اس لئے ہمیں اردو میں دوسری زبانوں کے اچھے الفاظ استعمال کرنے سے ذرا بھی گریز نہ

کرنا چاہیے۔ بلکہ ہندی کے اچھے لفظوں اور محاوروں کو پوری فراخدلی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے جیسے سحر کے لئے اُوشا۔ خواب کے لئے سپنا۔ تخیل کے لئے کلپنا اور اسی طرح بہت سے دوسرے الفاظ۔

میں نے پوچھا کیا اردو کا رسم الخط تبدیل کر دینا مناسب ہوگا۔

"نہیں — زبان کا رسم الخط تبدیل کر دینے سے اس کے الفاظ کے تلفظ میں نمایاں فرق ہوجاتا ہے جس سے ان کی شیرینی یا اثر آفرینی ختم ہو جاتی ہے۔ لباس ایک ضروری چیز ہے۔ لباس کی تبدیلی سے حسن میں فرق آجاتا ہے۔

ایک "اچھا" شاعر یا ادیب یا مصنف بننے کے لئے کونسی خصوصیات پیدا کرنا چاہیئے ؟

ہاں — ایک اچھا شاعر یا ادیب بننے یا ہونے کے لئے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی وقت فن میں نکھار پیدا ہوتا ہے جب غور و خوض کے ساتھ علم و ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اپنے گرد پھیلی ہوئی تمام چیزوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ایک شاعر جب تک کسی چیز کو اچھی طرح نہ دیکھے مشاہدہ نہ کرے اس وقت تک اس کی تخلیق میں فنکاری اور اثرانگیزی پیدا نہیں ہوگی۔ مشاہدہ ہی تخلیق کا باعث بنتا ہے اور مشاہدہ کے لئے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ تم ہی سوچو جب تک عشق نہ ہوگا حسن کی تعریف کیسے ہو سکے گی اور اگر کوئی کرے گا بھی تو وہ تعریف بے اثر اور سطحی ہوگی۔ حسن کی صحیح، سچی اور موثر تعریف اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی اس کو دیکھے، پرکھے اس سے واقفیت حاصل کرے اور اس سے متاثر ہو کر تڑپے جیسے اگر کوئی تاج محل پر محض تخیل سے نظم لکھتا ہے تو اس میں وہ بات پیدا نہ ہوگی جو تاج محل دیکھنے کے بعد ہو سکتی ہے

وقت کافی ہو چکا تھا۔ گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی۔ اور ہزاروں سامعین سلام صاحب کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے اس لئے ملاقات کو یہیں ختم کرنا پڑا۔

منظر اعظمی

آغا صاحب

لوگ انھیں آغا صاحب کہتے ہیں لیکن ان کا اصل نام عبدالرشید ہے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں، نہ معلوم کیوں وہ "آغا صاحب" مشہور ہو گئے۔ میرے نزدیک ان کا شمار جامعہ کی ممتاز شخصیتوں میں ہونا چاہیے۔ وہ اگرچہ اپنے دائرۂ کار کے محدود ہونے کے سبب کالج ہوسٹل، بلیغ، اسٹور اور اوکھلا گاؤں کے اسکوائر ہی میں نظر آئیں گے مگر ان کو کوئی نہ جانتا ہو یقین نہیں کیا جا سکتا اور کبھی ایسا ہو تو اسے "کم آگاہی" پر محمول کیا جائے گا۔

آغا صاحب کی شخصیت میں صوبہ بہار کی سادگی اور سیدھے پن، فوجی زندگی کی مشقت اور جامعہ کی پہلودار خصوصیات ــــ تینوں کا ایک خوشگوار اور خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے، اُن کی سادگی من موہ لیتی ہے، ان کی محنت و مشقت ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ ایسی کہ پیشانی پر پسینے کے قطرے تو نظر آتے ہیں لیکن کبھی کوئی شکن نہیں دیکھی جا سکتی، وہ ہر شخص کے ہمدرد "اور کارکشا" ہیں اس انداز سے کہ ان کے گرد انسانیت کی نشاط انگیز خوشبو پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دہرا بدن، مناسب قامت تانبے کی طرح دمکتا چہرہ، اس پر سفید مختصر داڑھی جو زیادہ تر بے نیاز آرائش رہتی ہے، کہیں کہیں سیاہ بال جو اس چاندنی میں اڑتے ہوئے "لکۂ ابر" کی طرح نظر آتے ہیں، بے پروائی سے اوڑھی ہوئی گاندھی ٹوپی جو کثرت استعمال اور انتہائے بے نیازی سے چوگوشیہ ہو جاتی ہے۔ گریباں چاک، چوڑی مہری کا کسی قدر بلند و نیچے پست پاجامہ، پیروں میں فوجی یا غیر فوجی سکنڈ ہینڈ جوتا، جھپکاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جب وہ اس ہیئت دلربائی کے ساتھ داہنی طرف کو جھکے ہوئے زاویہ داخلہ بنا کر "نو طرز خرام" سے جلوہ پیرا ہوتے ہیں تو اطمینان و سکون ان کی قدمبوسی کرتے ہیں۔ انسانیت ہاتھ چومتی ہے اور مشقت ہر کام

ہوتی ہے۔ ایسے میں بے ساختہ یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

ان کے ہاتھ وقت اور فاصلے کی پوری یکسانیت سے جھولتے ہیں۔ ان کے پیروں کے چاپ میں ایک خاص آہٹ ہوتی ہے جس سے وہ بلا کسی شبہ کے شناخت کر لئے جاتے ہیں۔ ان کے کھنکھار میں ایسا سونا گھلا ہوا ہوتا ہے کہ جس سے وہ جامعہ کے تمام ملازمین کی ملی جلی آوازوں میں بھی پہچان لئے جاتے ہیں۔ وہ بہت کم گو ہیں اور جب بولتے ہیں تو نطق زبان کے بوسے لیتا ہے۔ کم و بیش پندرہ سال سے جامعہ میں رہنے کی وجہ سے انھیں اردو آتو گئی ہے مگر جب حکایت دراز تر ہو جائے تو جگہ جگہ بہاری پوربی کے بھی پیوند لگاتے جاتے ہیں۔ غصہ آتے کم ہی دیکھا ہے۔ مگر لوگوں کی عزت، محبت اور نفرت کسی چیز کا بھی اظہار وہ نہیں ہونے دیتے۔ ہر شخص کے بارے میں رائے رکھتے ہیں جو بڑی نپی تلی ہوتی ہے۔ مگر کچھ کہتے نہیں مبادا کسی کی دل شکنی ہو، اسی وجہ سے وہ ہر ایک کے محبوب ہیں مگر ان کا کوئی محبوب نہیں۔ "یہ ٹھس پنا" شاید ان کی فطرت میں داخل ہے اس لئے کہ انھیں کسی سے بھی پیار نہیں ملا۔ زمانہ تو خیر ستم ہی ڈھاتا رہا، والدین کی محبت سے بھی محروم رہے اور ستم یہ ہے کہ شباب وجوانی کی ایک لمبی عمر گذار دینے پر بھی انھیں کسی سے محبت نہ ہو سکی۔ آغا صاحب اگر زبان نطق سے نہیں تو زبانِ دل سے ضرور کہتے ہوں گے اور تعجب نہیں کہ آہِ سرد بھر کر کہتے ہوں ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

آغا عبدالرشید پٹھیانہ گاؤں (بہار) میں پیدا ہوئے۔ والدہ بچپن ہی میں سدھار گئیں اور وہ محبت مادری سے قطعی محروم ہو گئے جس نے ان کی زندگی میں خزاں زدگی کی کیفیت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں باپ بھی رخصت ہوئے اور رہی سہی کسر سوتیلی ماں کی موجودگی نے پوری کر دی۔ ظاہر ہے تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ گاؤں کے مولوی صاحب سے معمولی عربی (ناظرہ)

اور اسی وقت پڑھی۔ گاؤں کی پڑھائی (؟) کیا اور اس پر روایتی مولوی صاحب کی۔ جو عقل سے زیادہ ڈنڈا استعمال کرتے ہیں اور پڑھانے سے زیادہ پاؤں دبواتے یا حقہ بھرواتے ہیں۔ جیسے تیسے بڑے ہوئے تو معمولی پرچون کی دوکان کرلی۔ دوکان چلی نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ریزگاری کی مصیبت آئی اس مصیبت نے دوکانداری کی بساط پلٹ کر رکھ دی۔ اعزہ نے بیکاری کا علاج یہ تجویز کیا کہ شادی کرادی۔ ایک نشد دو شد۔ بے چارے پیٹ سے تنگ آکر فوج میں بھرتی ہونے کے لئے گئے اور پٹنہ کے چکر لگاتے رہے۔ ان سفروں میں بقول ان کے بھنے ہوئے چنے ان کے رفیق زندگی اور سفر کا سہارا تھے۔ جب انھوں نے بھنے ہوئے چنوں کا ذکر کیا تو بڑے جوش سے بولے اسے ۶ر کا سیر بھر چنا ٹھاٹ سے پھانکتے تھے۔ اس وقت یقیناً ان کے ذہن میں آج کے بھنے ہوئے چنے ہوں گے جنھوں نے اپنی قیمت اتنی بڑھالی ہے کہ کہیں ذکر کے لائق نہیں۔ دو چار پیسوں کے چنوں میں انھیں حیات تازہ کے مزے ملتے تھے اور وہ اسی سے اپنے لہو کو گرم کرکے کبوتر روزگار کی تلاش میں شاہین وار گھوما کرتے۔ رہین ستم روزگار تو تھے ہی۔ مزید اس پر دیہاتیت او سادہ لوحی چلت پھرت تو تھی نہیں۔ پہلے ٹیسٹ ہی میں جو انھیں لفٹ رائٹ کرنے کو کہا گیا تو ہاتھ جھولنا ہی بھول گئے اور بجائے مارچ کرنے کے وہ بگٹٹ بھاگنے لگے بقول ان کے "پاس" کر دیئے گئے یعنی راستہ دکھادیا گیا۔ ہمت پھر بھی نہیں ہارے، اب پٹنہ پہنچے، اس دفعہ میڈیکل ٹیسٹ میں انھیں اسی طرح "پاس" مل گیا۔ ان کی زبان میں پہلی بار تو "سر ہاتھ ہی نہیں ڈولت رہا" دوسری بار ڈاکٹر نے اَن فٹ کر دیا۔ بہرحال تیسری کوشش میں انھیں لکھنؤ میں سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں جگہ مل گئی اور عرصہ دراز کے بعد ستم ظریف زمانے نے ان کی گود مسرت کے پھولوں سے بھردی ــــــ وہ بہت خوش تھے۔ -/۱۸ تنخواہ ملنے لگی گویا اٹھارہ روپوں نے چالیس سالہ ابن آدم کو اتنے عرصہ بعد انسان کی قیمت عطا کی اور اس نے اپنی قدر و قیمت پہچانی۔ جنگ کے زمانے میں انھوں نے جنگ کی ساری برکتیں اور مصیبتیں دیکھیں۔ سپلائی کے سلسلے میں دشمنوں کے گھیرے میں پھنسے مگر قسمت اچھی تھی۔ خیریت سے نکال لئے گئے۔ اس ملازمت میں انھوں نے حسب دستور دیس دیس کا سفر کیا۔ کوئٹہ، جبلپور، منی پور اور رنگون وغیرہ جگہوں کی سیر

سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ کوئٹہ میں انھوں نے انگور خوب کھائے اور یہ ذکر کرتے وقت ان کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی نفسیاتی احساس غم رہا ہو کہ اب خوشۂ انگور تو کجا خوشۂ گندم ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ جنگ ختم ہوئی تو ان کی خوشی کے دن بھی پورے ہوگئے اور یہ بے چارے پھر بے روزگار ہوگئے۔ کسی کے کہنے سے یا خود ہی کچھ سوچ کر "بائسکوپ" دکھانا شروع کیا۔ جب میں یہ تصور کرتا ہوں کہ آغا عبدالرشید اپنی اس ہیئت کذائی یا پھٹے پرانے فوجی لباس میں "دیکھو لو بھائی تین تین پیسے۔ کلکتے والی دھوبن دیکھو۔ بڑے لاٹ کا محل دیکھو۔ گنگا جمنا کا پانی دیکھو۔ آگرہ کا تاج دیکھو۔ جامع مسجد لال قلعہ دیکھو" کے الفاظ گردانتے ہوئے گھنٹی بجا رہے ہوں گے، بائسکوپ کے اردگرد بچوں کا ہجوم ہوگا اور چند منٹ کی اس تفریح کے عوض انھیں تین تین پیسے مل رہے ہوں گے تو عجب سا احساس ہوتا ہے۔ پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو شکم پری کے لئے کیسے کیسے سوانگ رچانے پڑتے ہیں۔ دوسرا یہ ہوتا ہے کہ اس حال میں بھی یقیناً وہ انسان بلند ہوتا ہے جو دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے بجائے خون پسینے کی کمائی پر روکھی سوکھی کھاکر بھی خدا کا شکر گزار ہوتا ہے۔ تیسرا یہ ہوتا ہے کہ پے بہ پے مصائب اور دشواریوں کے ہجوم کے باوجود کانٹوں میں کھلتے ہوئے پھول کی طرح کسی شخص کا مسکرا مسکرا کر زیست کرتے رہنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسی بلند ہمتی کے ساتھ آغا صاحب نے ماہ و سال کی چند گرہیں اور کاٹ دیں۔ اسی عرصے میں جامعہ کے ایک بزرگ کے مشورے اور کوششوں سے انھیں چوکیداری کی خدمت شب بیداری و ہمہ لمحہ ہشیاری کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ پھر وہ مطبخ میں برتن دھونے کے کام پر لگا دیئے گئے۔ کچھ دنوں محکمہ تعمیرات میں بھی بقدر چپراسی رہے اور بالآخر جامعہ کالج ہوسٹل میں بیرر کی خدمت پر لگا دیئے گئے۔ جہاں سے ان کی زندگی نے اطمینان کی نئی کروٹ لی اور اسی حالت سکون میں انھوں نے "خاندانی منصوبہ بندی" کی عملاً مخالفت شروع کردی۔ اس وقت تک آغا صاحب کی ۶ اولادیں بقید حیات ہیں۔ ۳ لڑکے اور ۳ لڑکیاں۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ خود تعلیم حاصل نہ کرسکے مگر لڑکوں کی تعلیم کی فکر ضرور ہے اسی لئے جیسے تیسے پیٹ کاٹ کر انھیں اچھی سے اچھی تعلیم دلا رہے ہیں اور ان کے طرز بود و ماند اور پوشش و

اس کو تمامی بنکر سکتے ہیں۔ لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں اور اس طرح وہ انسانیت کی ایک بڑی ذمہ داری محسوس کر رہے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خدمت ہے۔ وہ چھوٹے بڑے ہر ایک کی عزت کرتے ہیں۔ کالج کے طالب علم سے لے کر وارڈن اور پرنسپل تک کی طرف سے جو کام بھی ان سے کہا جائے وہ خاموشی سے منزل کی طرف قدم بڑھا دیتے ہیں۔ اپنی ڈیوٹی میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ پورا پورا دن ان کا اسی چکر میں گذر جاتا ہے مگر وہ کام ختم کرکے ہی دم لیتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں انھیں تامل کرتے نہیں دیکھا۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں اور جتنا بھی بن پڑتا ہے کرنے میں کوتاہی نہیں برتتے۔ خدمت سب سے بڑی انسانیت ہے اور یہ انھیں جامعہ نے بخشا ہے۔ کبھی کبھی کیا بلکہ زیادہ تر بطور ایمرجنسی اپنی گرہ سے خرچ کر دیتے ہیں۔ واپس ملا تو لے لیا نہیں تو تقاضا جیسا کرتا بنتے کا حق ہے کبھی نہیں کرتے۔ البتہ فریق ثانی کی طرف سے اگر بے حسی میں غلو کا احساس ہوتا ہے تو کبھی کبھی یاد دہانی کرا دیتے ہیں اس طرح انھوں نے بہت کچھ اپنی شرافت کی نذر کیا مگر ان قربانیوں نے ان کا جذبہ اور بھی بڑھا دیا ہے اور یہ وہ گھاٹا ہے جس میں بہرحال نفع رہتا ہے۔ بقول ان کے دکانداری کا چسکا انھیں بچپن سے پڑا تھا۔ اس لئے وہ اس سے باز نہیں آتے۔ کہیں بھی ہوں دو چار سگریٹ کے پیکیٹ اور ماچس کی دو چار ڈبیاں جیب میں رکھے رہتے ہیں تاکہ جس کو بھی فوری ضرورت ہو اس موبائل شاپ سے مستفید ہو سکے۔ ان کی چھوٹی سی دوکان میں ہر ضروری اور وقت ضرورت طلب کی جانے والی چیز موجود رہتی ہے۔ جیسے وہ بغیر کسی تحریری حساب اور زیادہ فائدہ کے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض شہر یار نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا اور پھر خود ہی "دادا" بٹور کر چلتے بنے۔ اس طرح انھیں شاید ہی کبھی وہ فائدہ حاصل ہوا ہو جو "دوکانداری" سے لوگ حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ کبھی کسی کی شکایت نہیں کرتے اور نہ ان کی پیشانی پر کبھی بل ہی پڑتا ہے۔ میں نے آغا صاحب سے پوچھا آپ جامعہ میں کس شخصیت سے زیادہ متاثر ہیں۔ وہ کہنے لگے سبھی میرے نزدیک بڑے ہیں۔ ہر ایک اچھا ہے۔ کس کو بتاؤں۔ انداز اتنا بے ساختہ اور نیت اتنی پاکیزہ تھی کہ مجھے ان کے حسن اخلاق کا قائل ہونا پڑا۔ یہ رتبۂ بلند کس کو ملا ہے! میں نے پھر پوچھا کیا آپ پہلے کی جامعہ اور اب کی جامعہ

میں کچھ فرق محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا۔ جامعہ اب پہلی جیسی نہیں رہی۔ اور وہ اخلاص
وہ خدمت اور وہ جذبہ نہیں رہا۔ انھوں نے بات ٹھیک کہی مگر ان اسباب و عوامل کو پیش [illegible]
کسی ادارے کی توسیع اور اس کے ارتقا کے سلسلے میں اس کے اندرونی ڈھانچوں میں رونما ہوتا ہے
اور معاشی خوشحالی اور اپنی قدر و قیمت کا معاوضہ طلب کرنے کے رجحان سے جیسا کچھ مزاج اور اخلاق
بنتا ہے۔ یہ تبدیلیاں ضروری ہیں۔ مزاج اور طور طریقوں میں تبدیلی پیدا کرنے میں اور بھی بہت کچھ عناصر
کام کرتا ہے مگر پرانے لوگ اپنا ہی سا جذبہ اور اپنے ہی سے معیار حالات و زمانہ کے اثرات کی پروا
کئے بغیر اپنے بعد آنے والوں میں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ان کی نیت اور ان کے خلوص پر تو شبہ نہیں
کیا جا سکتا مگر ان کے علم و فہم میں اور باتیں ضرور اتاری جا سکتی ہیں۔ بہرحال ان جیسی شخصیتیں مغتنمات
میں سے ہیں۔ یہ موجود ہیں یہی بڑی بات ہے۔ یہ لوگ یادگار زمانہ ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ خدر ہے
تو حسرت سے لوگ ضرور کہیں گے "پھر انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر" ـــــ مجھے آغا صاحب
سے بے حد انس ہے۔ ان کے جذبۂ خدمت سے بہت متاثر ہوں اور ان کی مسلسل سفر کرتی ہوئی
شخصیت سے بڑا درس لیتا ہوں، جنھوں نے انھیں دیکھا ہے کچھ وہی ان کی قدر کرسکیں گے۔ بڑی
اور چھوٹی شخصیتوں کے بارے میں لوگ یقیناً اختلاف رائے کریں گے۔ لیکن میرے نزدیک جو شاخ
جتنی جھکی ہوئی ہوگی پھلوں سے لدی ہوگی۔ چھوٹے ہی مجھے بڑے نظر آتے ہیں اگر ان میں
بڑوں جیسی صفات ہوں اور بڑے بھی اسی وقت بڑے ہوتے ہیں جب ان میں عجز و انکسار، خدمت
و محبت اور ایثار و قربانی جیسی صفتیں موجود ہوں جو اکثر چھوٹوں میں زیادہ اور بڑوں میں کم ہوتی ہیں۔

تعارف و تبصرہ

اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر

مصنف : ڈاکٹر تاراچند
مترجم : چودھری رحم علی الہاشمی

ناشر : آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دہلی ۶، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم، اصل کتاب ۳۱۸، انڈکس ۴۳، ببلیوگرافی (انگریزی) ۱۸، تصاویر ۲۸، کل صفحات ۴۰۷، مجلد مع گرد پوش، سن طباعت: ۱۹۶۰ء، قیمت : ساڑھے سات روپے

ڈاکٹر تاراچند کی پیش نظر کتاب اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے اتنی اہم اور مشہور ہے کہ شاید ہی اس سے کوئی ناواقف ہو، اردو کی کتابوں میں بھی اس کا اس قدر ذکر آیا ہے اور اس کے اتنے حوالے دیئے گئے ہیں کہ وہ لوگ بھی اس سے پوری طرح واقف ہیں جو انگریزی سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔ جناب ہاشمی صاحب اور آزاد کتاب گھر یقیناً ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی توجہ اور کوشش سے امسال یہ کتاب اردو میں بھی شائع ہو گئی۔ رسالوں سے معلوم ہوا تھا کہ پچھلے سال اس کا ترجمہ پاکستان میں شائع ہوا ہے، مگر دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہاشمی صاحب بہت پرانے اور تجربہ کار مترجم ہیں اس لیے امید ہے کہ یہ ترجمہ ہر لحاظ سے اچھا اور قابل اطمینان ہوگا۔

مصنف نے اس کتاب کو ۱۹۲۲ء میں مضمون کی شکل میں لکھا تھا۔ مصنف کے نزدیک یہ مضمون تکمیل اور نظر ثانی کا محتاج تھا، مگر انھیں موقع نہیں ملا اور اسی حالت میں کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا۔ اتنے طویل عرصے میں حالات بہت بدل گئے ہیں، معلومات بڑھی ہیں، اور بقول مصنف "ہندوستانی کلچر کی توضیح میں اضافہ ہوا ہے" اس لیے اس کتاب میں

نظرِ ثانی کی بڑی ضرورت تھی، مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کام کون کرتا۔ ڈاکٹر تارا چند صاحب اس کے لیے بہت موزوں تھے، مگر ایک تو انھیں فرصت نہیں، دوسرے ان کی عمر اور صحت تحقیق و تفتیش کے گراں بار کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے اسی حالت میں اس کا اردو میں شائع ہو جانا ہی غنیمت ہے۔

مصنف نے اردو ترجمے کے مقدمے میں کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کتاب میں قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے ایک ایسے پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کو کم معلومات ہیں، یہ پہلو ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور روابط کا۔ اس پہلو پر مورخوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ہے، لیکن اس پر تحقیق کی ضرورت ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اور قومی اہمیت کے خیال سے بھی۔" اس میں شبہ نہیں کہ اس موضوع پر واقعی تحقیق اور ریسرچ کی ضرورت ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ اسے کرے کون؟ ایک ایسا ہی شخص اس کے لیے موزوں ہو سکتا ہے، جو ڈاکٹر تارا چند کی طرح صاف ذہن اور غیر متعصب کی حیثیت سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں معروف اور ہر دلعزیز ہو۔ آزادی کے بعد پاکستان میں ہندوستان کی مسلم تہذیب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً "مسلم ثقافت ہندوستان میں" (از عبدالمجید سالک مرحوم)، "ثقافتِ پاکستان" (مرتبہ شیخ محمد اکرام)، "پاکستانی کلچر" (از جمیل جالبی)، ان میں معروضی اندازِ فکر کی بڑی کمی ہے اور کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا قلم جذباتیت، بلکہ کہنا چاہیے کہ جارحانہ ذہنیت سے مغلوب ہو گیا ہے، اسی طرح ہندوستان میں بھی ایسی تحریریں اور خیالات سامنے آ رہے ہیں، جن کو پڑھ کر علم اور معقولیت کی گردن جھک جاتی ہے۔ ان حالات میں بڑی مایوسی ہوتی ہے، پاکستان کے بارے میں تو ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، مگر ہندوستان میں اب بھی ایسے ادارے اور اشخاص ہیں، جنھیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا اعتماد حاصل ہے اور وہ بڑی حد تک، جہاں تک انسان کے بس میں ہے، معروضی انداز میں اس دور کی علمی اور تہذیبی تاریخ لکھ سکتے ہیں، جس سے بقول ڈاکٹر تارا چند "ہندوستانی قومیت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔"

اپنے دکھ مجھے دیدو   از راجندر سنگھ بیدی

ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۲۰۰ صفحات، جلد مع گرد پوش، تاریخ طباعت: اگست ۱۹۶۵ء، قیمت چار روپے۔

راجندر سنگھ بیدی اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں سے ہیں۔ پچھلے سال ان کے مختصر ناول پر، جو ان کا پہلا ناول ہے، ساہتیہ اکیڈیمی سے انعام مل چکا ہے۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے پہلے ہی ان کو فن کا تسلیم کر لیا تھا مگر ساہتیہ اکیڈیمی کے انعام نے اہل علم کی طرف سے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

بیدی کم لکھتے ہیں، مگر جو کچھ لکھتے ہیں، وہ خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ سماج کے امراض پر ان کی گہری نگاہ ہے، زندگی کا مشاہدہ وسیع اور تیز ہے، دل کی دھڑکنوں اور نگاہ کی زبان کو خوب سمجھتے ہیں، اگرچہ رہنے والے پنجاب کے ہیں، رہتے بمبئی میں ہیں اور پیدا ہوئے اور تربیت پائی سکھ خاندان میں، مگر ان کی معلومات اور ان کی نظر اس قدر وسیع ہے کہ ذکر مسلمان کا ہو یا ہندو کا، یوپی والوں کا ہو یا جنوبی ہند کے باشندوں کا، اس طرح لکھتے ہیں، جیسے ان ہی کے ایک فرد ہیں، لکھنے کا اسلوب اگرچہ بڑی حد تک پنجابی ہے، مگر سادہ اور پرکیف اور طنز اس قدر برجستہ اور برمحل کرتے ہیں کہ لطف آ جاتا ہے۔ زبان اور محاورے کے معاملے میں وہ اہل زبان کا لحاظ کیے بغیر جو مناسب سمجھتے ہیں لکھتے ہیں، ان کی یہ ادا اس قدر معروف اور معلوم ہے کہ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے بھی ان کی اس خصوصیت کو گویا تسلیم کر لیا ہے، مگر زیر تبصرہ کتاب کو پڑھتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ کبھی کبھی ہندی اور انگریزی کے ایسے نامانوس اور ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، جن کے بجائے اگر اردو کے عام فہم اور سلیس الفاظ استعمال کیے جاتے تو تاثر زیادہ اچھا اور گہرا ہوتا۔ مثلاً ذیل کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:

جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی (صفحہ ۲۰) اس دن سب عورتوں نے ہی کبھی نشست

کر رکھا تھا (ص۲۳۳)"۔ اسکول کے ٹیچر اس بات کے معنی کو کیا سمجھیں۔ کمبھ کے میلے پر جو سنگھم وہاں ہزاروں لوگ اسٹیمپیڈ میں دب گئے" (ص۱۹)۔ لیکن اگر انسان آسمان کو تکلی لگا سکتا ہے (ص۱۱۱)۔ "جو کل ان کا تلہ کیا تھا (ص۲۱۳)۔ وہاں کے ہسپتال کی بیڈز بعض وقت ارجنٹ کیس کے لئے بھی خالی نہ ہوتی تھیں (ص۲۵۶)۔

ابھی حال میں پاکستان کے مشہور مصنف ڈاکٹر سید عبداللہ کا "ٹیلی فون کلچر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ "زمانہ بھی کیا جائے انقلاب ہی، سائنسی علوم کا عذر تو پہلے مان لیا، کیا ہم لوگ ٹیلیفون کے ہندسوں کی گنتی بھی اردو میں نہیں کر سکتے، کیا اردو میں ان ہندسوں کے لئے اردو کے الفاظ نہیں یا یہ کوئی قانون ہے کہ ٹیلیفون پر جو بات بھی کرو اس میں انگریزی ضرور استعمال کرو۔" گفتگو میں انگریزی الفاظ کا استعمال اس قدر طبیعت پر بار نہیں ہوتا جس قدر سنجیدہ اور معیاری عبارتوں میں۔ اردو کے ایک انگریز پروفیسر ہندوستان آئے تو یہ دیکھ کر انھیں بڑا تعجب ہوا کہ اردو کے اچھے سے اچھا ادیب بھی انگریزی الفاظ کے بغیر گفتگو کرنے پر سرے سے قادر ہی نہیں۔ انگریزی یا ہندی الفاظ سے بیر نہیں، اردو اس معاملے میں اس قدر وسیع اور فیاض ہے کہ جس زبان کا لفظ آپ چاہیں استعمال کر سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ صوتی لحاظ سے اردو سے ہم آہنگ ہو اور اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو میں پہلے سے کوئی مناسب لفظ موجود نہ ہو۔

بیدی کے اس مجموعے میں نو افسانے شامل ہیں اور یہ سب کے سب ایسے ہیں جو کسی ترقی یافتہ زبان کے معیاری افسانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ بیدی کے دوسرے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

یوژوکیہ

مصنفہ: ویلا پانووا

مترجمہ: قرۃ العین حیدر

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

زیر تبصرہ کہانی کے پیش لفظ میں اس کی مصنفہ کا تعارف حسب ذیل الفاظ میں کرایا گیا ہے :

" ویرا پانووا ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئیں، انھوں نے چار ناول، متعدد ناولٹ، افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں، سوویٹ یونین میں ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد اشاعت پچاس لاکھ ہے۔ ان کی کتابیں تئیس زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہیں، تین ناولوں کو اسٹیٹ ایوارڈ مل چکا ہے۔"

زیر تبصرہ کہانی ـــــ یودوکیہ ـــــ کا تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا ہے :

"ہماری زندگی ایک رفیع الشان، بڑھتا اور پھیلتا ہوا درخت ہے، اسے نمائشی دکھاوے کے زیوروں سے سجانا حماقت ہے، یہ اپنی قدرتی حالت ہی میں بے انتہا شاندار اور خوبصورت ہے۔" ویرا پانووا کے یہ الفاظ "یودوکیہ" کی سیدھی سادی لیکن دلکش کہانی پر خصوصیت سے صادق آتے ہیں۔ ایک روسی عورت اور اس کے کنبے کی اس نفیس داستان کو قلمبند کرنے کا خیال مصنفہ کو دوران جنگ میں آیا تھا، لیکن کہانی ۱۹۵۹ء ہی میں مکمل ہو کر شائع ہو سکی۔ "یودوکیہ" ایک ایسی ماں کی کہانی ہے جو پانچ یتیم بچوں پر اپنی ممتا نچھاور کرتی ہے۔ یہ مختصر لیکن پر اثر ناول پڑھنے والوں کے دل میں اتر جائے گا۔"

اس مختصر ناول کا ترجمہ اردو کی ایک مشہور اور ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس قرۃ العین حیدر نے کیا ہے، اس لیے زبان اور اسلوب میں طبع زاد ناولوں کا لطف آتا ہے اور ناموں کے علاوہ کسی موقع پر بھی ترجمے کا

بے لطفی پیدا نہیں ہوتی۔

(عبداللطیف اعظمی)
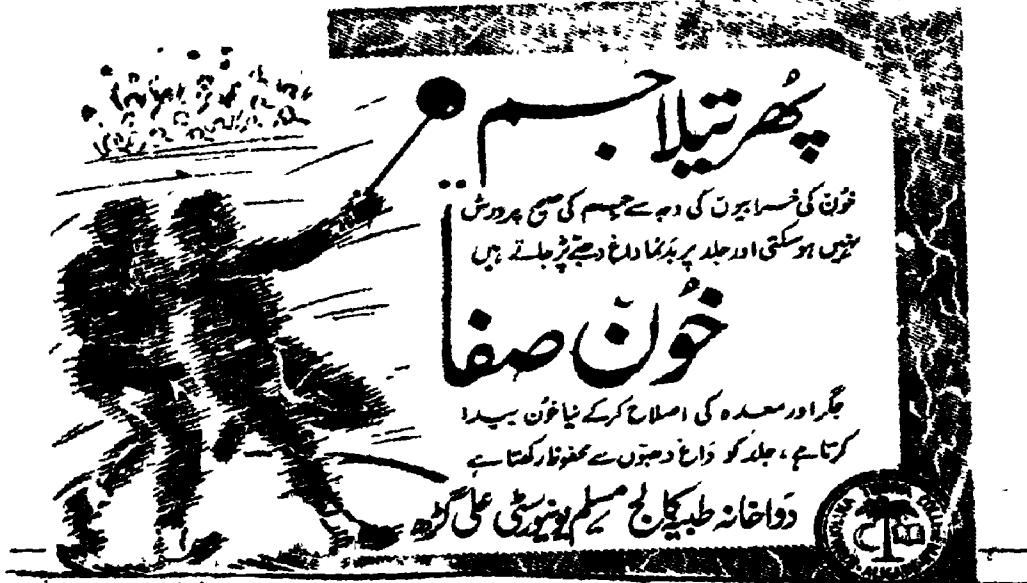
کلکتہ : اک رباب

سید حرمت الاکرام کی طویل نظم "کلکتہ : اک رباب" جس میں کلکتہ کے سماجی، تہذیبی اور تاریخی حالات کی عکاسی انتہائی حسن کاری کے ساتھ کی گئی ہے، کتابی شکل میں شائع ہو گئی۔ یہ نظم اردو کے شعری ادب با مخصوص شہروں سے متعلق نظموں کی فہرست میں ایک بیش بہا، منفرد اور انوکھا اضافہ ہے نفیس کتابت، اعلیٰ طباعت، دلکش گٹ اپ، مجلد مع سہ رنگا گرد پوش، شاعر کی تصویر شامل کتاب ہے۔

قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

ملنے کے پتے : سید حرمت الاکرام رام باغ مرزا پور (یوپی، انڈیا)

دفتر ماہنامہ "شبخون" ۳۱۳، رانی منڈی الہ آباد ۳ (یوپی، انڈیا)

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی مطبوعہ : یونین پریس دہلی ٹائیٹل : ہلال پریس دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۴	بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب　　ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ　　ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پروفیسر محمد مجیب

ترکی پر ایک نظر

شروع سنہ ۶۵ میں میرے پاس وزارت ہند کے کسی مہربان کا خط آیا کہ حکومت ہند ایک
مناسب شخص کو ترکی بھیجنا چاہتی ہے، آپ کی عنایت ہوگی اگر آپ کسی کا نام تجویز کردیں۔ ایسا ہی خط کئی او
لوگوں کے پاس بھیجا گیا تھا، اور شاید انھوں نے بھی میری طرح اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر چند مہینے بع
مجھے خوش خبری دی گئی کہ ترکی جانے کے لئے میرا نام تجویز کیا گیا ہے، مناسب ہے کہ میں بتا دوں کہ میں کب
جاسکوں گا۔ اس کا میں نے جواب دیا کہ میں جون یا دسمبر میں جاسکوں گا، اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ ملک کے با
جانے والوں کو جو ۷۵ روپے دیئے جاتے ہیں وہ ناکافی ہوں گے، مجھے زیادہ رقم لے جانے کی اجازت د
جائے۔ اس کا فوراً جواب آیا کہ اب ۷۵ روپے لے جانے کا قاعدہ بدل گیا ہے، صرف ۴۲ روپے
کی اجازت ہے۔ میں خاموش ہو رہا۔ اگست اور ستمبر سنہ ۶۵ کی ہند اور پاکستان کی جنگ کا قصہ یہاں دہرانے
ضرورت نہیں، میں نے سمجھ لیا کہ اب لڑائی میں حکومت کا روپیہ بہت خرچ ہو چکا ہے اور ادھر ترکوں
پاکستان کی حمایت کی ہے، اس لئے اب میرے ترکی جانے کا سوال نہیں رہا۔ لیکن پھر مجھ سے کہا گ
پاسپورٹ بھیج دیجئے، تاکہ آپ کے جانے کا انتظام کیا جاسکے، اور اسی دوران میں دھرم ویر صاح
جو اس وقت کیبی نٹ سکریٹری تھے مجھے بلا بھیجا اور فرمایا کہ آپ ترکی جارہے ہیں، وہاں ہمارے فائد
بھی کچھ باتیں کر دیجئے گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں جاؤں گا تو اسی غرض سے کہ ہندوستان کے بار
جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کروں اور جن لوگوں یا جماعتوں سے واسطہ پڑے انھیں ہندوستان ک
کی طرف مائل کروں۔ مگر مجھے جو ۴۲ روپے دیئے جانے والے ہیں وہ بہت کم ہیں، مجھے اس کا م
ہونا چاہئے کہ ایک مہمان نواز قوم کے لوگوں کی خود بھی کچھ مہمان نوازی کر سکوں۔ یہ بات دھرم و

کی سمجھ میں آگئی اور ان کی عنایت اور لطیف صاحب کی دوڑ دھوپ نے مجھے اس قابل کر دیا کہ اطمینان کے ساتھ ترکی جا سکوں۔

۳۱ مارچ کی سہ پہر کو میں انکرہ (جسے ع ق پسند کرنے والے عنقرہ کہتے ہیں) پہنچ گیا۔ استقبال کے لئے ہندوستان کے سفیر سعادت علی خاں صاحب اور فرسٹ سکریٹری موہندرا صاحب تشریف لائے تھے۔ مگر میں مال تھا ترکی حکومت کا، اور بہت جلد ایک خوبصورت نوجوان نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ یہ نوجوان جن کا نام اکن بے اِمرے گل، یعنی گلوں کا شیدائی ہے، ترکی کی وزارت خارجہ کے ڈپارٹمنٹ نمبر ۴۳ میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ ان کی صورت، سیرت اور ظرافت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ پہلے دن وہ مجھے ہوٹل میں پہنچا کر چلے گئے اور دوسرے روز صبح نیشنل پارک لے گئے، جو انکرہ سے شاید ۲۵، ۳۰ میل دور ہے۔ راستے میں میں نے ترکی کی سڑکوں کی تعریف کی، انھوں نے کہا کہ یہ وہ سڑکیں ہیں جن پر ہم اپنے مہمانوں کو لے جاتے ہیں، انھیں دیکھ کر دھوکا نہ کھائیے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آخر پاکستان کا ترکی پر کیا احسان تھا اور ہندوستان کا کیا قصور تھا کہ ہماری جنگ میں آپ نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی خارجی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، مگر کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ہندوستان پاکستان میں اختلاف کس بات پر تھا، یہ شاید ہماری سمجھ میں نہیں آیا، ہم تو نیٹو اور سنٹو اور دوسرے سفارتی تعلقات کی بنا پر پاکستان کا ساتھ دینے پر مجبور تھے، اور ہندوستان نے ہماری رائے پر اثر ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پھر انھوں نے شکایت کے انداز میں کہا کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ قبرس (قبرص) کے معاملے میں ہندوستان نے ترکی کی مخالفت کی، اور میں نے پوچھا کہ آپ نے ہندوستان کی حکومت کو معاملہ سمجھانے کی کیا تدبیریں کی تھیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنے خیال میں حق بات کہہ رہے تھے، اس لئے ہمیں یقین تھا کہ ہندوستان ہمارا ساتھ دے گا۔ میں نے کہا کہ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ہم اپنی بات آپ کو سمجھاتے ہیں نہ آپ اپنی بات ہمیں، اور اسی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اب ہم دونوں کو اپنا طریقہ بدلنا چاہئے۔

ترکی کا نیشنل پارک بہت بڑا ہے، اس میں یورپی طریقے کے صاف ستھرے ہوٹل اور

ریسٹوران ہیں، مگر اس کا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جن کے پاس موٹر ہو۔ غالباً یہاں جو انتظامات ہیں وہ غیر ملکی سیاحوں کے لئے ہیں، جن کو ترکی میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت مجھے انکرہ اور استنبول کے علاوہ بروسا، ازمر (سمرنا) اور رازمر کے گرد و پیش کے علاقہ میں ملا۔ جہاں بہت سے نئے ہوٹل اور ریسٹوران سیاحوں کے لئے بنے ہیں اور اب بھی بن رہے ہیں۔ سیاح زیادہ تر جرمن اور امریکن ہوتے ہیں، امریکن اب پسند نہیں کئے جاتے، مگر ترکی کے فوجی محکمے نے طے کر لیا ہے کہ ہر حال میں امریکہ کا ساتھ دینا اور روس کو اپنا دشمن سمجھنا ہے، اسی وجہ سے اس نے مندریس کو معزول کیا اور ان کو اور ان کے چند ساتھیوں کو قانون اور انصاف کا لحاظ کئے بغیر پھانسی دے دی، اس لئے کہ مندریس نے امریکہ کا ساتھ چھوڑ کر روس سے تعلقات پیدا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ معلومات مجھے اکن بے سے نہیں حاصل ہوئیں بلکہ اپنے چند عزیزوں سے جو انکرہ میں رہتے ہیں اور جنھیں اس کا اندازہ ہوا ہے کہ مندریس کی حکومت اپنی مذہبی پالیسی کی وجہ سے عوام اور خاص طور سے دیہاتی عوام میں بہت ہر دلعزیز تھی۔ اکن بے خود اصولاً غیر مذہبی ہیں۔ ان سے مجھے یہی معلوم ہوا کہ پچھلی حکومت نے کسانوں کو خوش کرنے کے لئے ہزاروں ٹریکٹر خرید دئے جن سے زراعتی کام نہیں لئے جاتے ہیں بلکہ کسان ان پر اپنے بیوی بچوں کو سوار کر کے گھومتے پھرتے ہیں، اور اس نے ووٹ حاصل کرنے کے لئے ایسی جگہوں پر کارخانے بنا دئے جہاں ان کی ضرورت نہیں تھی، مثلاً انکرہ کے پاس، جہاں گنا نہیں پیدا ہوتا ہے، ایک شکر کا کارخانہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اصل میں جو باتیں ترکی حکومت چھپانا چاہے ان کا علم سرکاری ملازموں کو بھی نہیں ہوتا، سوا اس کے کہ وہ اس بلندی پر ہوں جہاں صیغۂ راز میں گفتگو اور فیصلہ کرنے والوں کا مقام ہے۔

اکن بے کو سیاسی معاملات سے اتنی ہی کم دلچسپی تھی جتنی کہ مجھے۔ نیشنل پارک میں اور اس کے بعد کھانے پر ہم بے تکلف ہوتے گئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی تنخواہ ۴۲ ڈالر ہے اور مکان کا کرایہ چالیس ڈالر، خرچ اس طرح چلتا ہے کہ ان کی بیوی ایک ہسپتال میں کام کرتی ہیں، اور ان کے بھائی، جو ڈاکٹر ہیں اور جرمنی میں پریکٹس کرتے ہیں ان کی مالی امداد کرتے رہتے ہیں۔ سرکاری

ملازموں اور فوجیوں کے مقابلے میں استادوں کو زیادہ تنخواہ ملتی ہے، ڈاکٹروں، وکیلوں اور کاروباری لوگوں کی آمدنی بھی بہت زیادہ ہے، البتہ سرکاری ملازم کو طاقت اور اختیار رکھنے کا جو مزہ ملتا ہے وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتا۔

آکن بے نے مجھے بتایا کہ انکرہ سے مشرق کی طرف ترکی کا جو پس ماندہ علاقہ ہے وہاں سیاحوں کو جانے میں بڑی دشواری ہوتی ہے اور سرکاری مہمان جانا چاہیں تو کوئی مناسب عذر کردیا جاتا ہے۔ لیکن غربت کا جو اندازہ کرنا چاہے وہ انکرہ شہر کے پرانے حصے یا قلعے یا ان نئی آبادیوں میں جاکر کرسکتا ہے جہاں غریبوں نے حکومت کے فراہم کئے ہوئے مکانوں کو چھوڑ کر اپنے مکان خود بنائے ہیں۔ دو تین پہاڑیوں پر نیچے سے اوپر تک ایسے ہی مکان بنے ہیں، ان میں کوئی ترتیب نہیں ہے، لوگ میونسپلٹی کی عملداری نہیں چاہتے اور میونسپلٹی روشنی، پانی اور صفائی کا انتظام نہیں کرپاتی۔ میں ایسی کسی بستی میں تو نہیں جاسکا۔ مگر آکن بے مجھے پرانے قلعے میں لے گئے، جہاں چپراسی اور ادنٰے درجے کے کلرک وغیرہ رہتے ہیں۔ یہاں غریبی کے تمام آثار تو تھے لیکن شاید اس وجہ سے کہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے اور گندہ پانی کسی نہ کسی طرح سے نیچے بہہ جاتا ہے، یہاں گندگی اور بدبو کا وہ عالم نہیں تھا جو دلی کی "بستیوں" میں نظر آتا ہے۔ میں کسی گاؤں میں نہیں جاسکا، جو گاؤں دیکھے وہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے۔ ان کے تمام مکان پختہ اور خاصے بڑے معلوم ہوئے، اندر کے حال کا مجھے پتہ نہیں، باہر سے وہ صاف ستھرے معلوم ہوتے تھے۔ ترکی کے مغربی علاقے میں، جو کسی زمانے میں ایونیا، یعنی یونان کہلاتا تھا، کسان خاص طور پر خوش حال ہیں۔

معمولی سی تحقیق کرنے پر بھی اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ ترکی کی شہری اور دیہاتی آبادی میں ذہنیت اور خیالات کا بڑا فرق ہے۔ قانون کے ذریعے کسان سوٹ پہننے پر، ان کی عورتیں چہرہ کھلا رکھنے پر اور سب تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کردیئے گئے ہیں۔ لیکن نئی تعلیم دیہات میں کچھ بہت مقبول نہیں ہوئی ہے، حکومت نے ستائیس ہزار اسکول بنوائے ہیں، کسانوں نے چندہ کرکے اکتالیس ہزار مسجدیں بنوالیں، حکومت چاہتی ہے کہ لوگ تعلیم پائیں اور ترقی کریں، کسان سمجھتے ہیں کہ دنیا اور عاقبت کے لئے وہ تعلیم کافی ہے جو مکتبوں میں دی جاتی تھی۔ شاید زراعتی اور معاشی مقاصد میں

بھی ایسی ہی کشمکش ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو اور ملک کی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو بچے وہ غیر ملکوں سے تجارت میں کام آئے مگر کسان صرف اپنی مصلحت دیکھتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ سے گیہوں خریدنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ہر گاؤں کے قہوہ خانے سیاسی بحثوں کے مرکز ہیں، اور اس بات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ آدمی کس پارٹی کا حامی ہے۔

انکرہ اور استنبول کے خاص حلقوں کو چھوڑ کر کہا جاسکتا ہے کہ ترکوں میں مذہبیت بہت ہے۔ حاجی کا، عرب کا، دینی عالم کا بڑا مرتبہ ہے، دینی تعلیم کا جو سلسلہ منڈریس کی حکومت نے شروع کیا تھا وہ جاری ہے، اور دینی علوم کو حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ پروفیسر حمید اللہ جو ہندوستان اور پاکستان کی بیدینی سے برداشتہ خاطر ہوکر سنہ ۴۸ میں یورپ چلے گئے تھے اور اب پیرس میں عربیات کے پروفیسر ہیں ہر سال تین چار مہینے کے لئے استنبول یونیورسٹی میں آکر اسلامی سیاسیات پر لکچر دیتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے لکچر، جو عربی میں دئے جاتے ہیں اور جن کا ترجمہ ساتھ ساتھ ترکی میں ہوتا ہے، سننے کے لئے پانچ سو سے ہزار تک نوجوان آتے ہیں۔ یہ نوجوان ہر شعبے کے طالب علم ہوتے ہیں، انجینر، ڈاکٹر، ادیب، فلسفی، اور ان میں خاصا حصہ لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ جن مسجدوں میں میں گیا، لوگ نماز پڑھتے یا کلام پاک کی تلاوت کرتے ملے، نماز کے وقت مسجد کے اندر جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ ازمر (سمرنا) میں میری تواضع ادیا خانم کے سپرد تھی۔ یہ ازمر کی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لکچرر ہیں، اور دین، دینداری اور خاندانی زندگی کے اصولوں کا بہت احترام کرتی ہیں۔ وہ معمولاً سر نہیں ڈھکتی ہیں لیکن مجھے ایک مسجد میں لے گئیں جسے اتاترک کے زمانے میں ایک رئیس بیوہ نے اپنے شوہر کی یاد میں بنوایا تھا تو اپنے سر پر رومال لپیٹ لیا، جسے وہ خاص اس مقصد کے لئے گھر سے ساتھ لائی تھیں۔ وہ مجھے ازمر سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور ایک مقام پر سیر کرانے لے گئیں اور وہاں کے قائم مقام یعنی نائب حاکم سے مجھے ملایا۔ انھوں نے جیسے ہی سنا کہ میں مسلمان ہوں ویسے ہی اپنے خیالات بیان کرنا شروع کر دئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ترک مسلمان ہیں اور سچے مسلمان ہیں، مگر ہم اپنی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ

یورپی سائنس اور صنعت حاصل کریں، اس لئے ہمارا رخ یورپ کی طرف ہے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کو اور ہمیں ہندوستان میں یورپی سائنس اور صنعت ضرور سیکھنا اور برتنا چاہیئے، مگر اس کے لئے یورپ کی نقل یا تقلید کیوں کی جائے۔ آپ ترک ہیں، مسلمان ہیں، آپ کا اپنا تہذیبی ورثہ ہے، اسے کیوں چھوڑ دیجیئے، آپ کو تو ترکی تہذیب کا نمونہ پیش کرنا چاہیئے۔ اس پر انھوں نے اپنی اور اپنی بیوی کی مذہبیت کے اور ثبوت دیئے۔ مجھے بتایا کہ بیوی اسکول میں استانی ہیں، خود پنج وقتہ نماز پڑھتی ہیں اور بچوں بچیوں میں دینی جذبہ بیدار کرنا چاہتی ہیں۔ پھر وہ مجھے اپنے بڈروم میں لے گئے۔ اور دکھایا کہ ان کے سرہانے قرآن شریف کی دو جلدیں، ایک عربی اور ایک لاطینی رسم خط میں رکھی رہتی ہیں۔ ان کے غسل خانے میں وضو کرنے کا سامان بھی تھا۔

اویا خانم نے شروع ہی سے مذہب کی بات چھیڑ دی تھی، یہ پوچھ کر کہ جبر و اختیار کے مسئلے میں اشعری کے پیرو ہیں یا کوئی اور مسلک رکھتے ہیں۔ میں سوال سن کر کچھ حیران ہوا، اور یہ بتا کر کہ میں اشعری کا پیرو ہوں، ان سے پوچھا کہ خود انھیں اشعری کی تعلیمات کا کیسے علم ہوا۔ انھوں نے کوئی صاف جواب نہیں دیا، مگر مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ ترکی میں مسلمان ہونا کافی نہیں ہے مسلمان کو سنی حنفی بھی ہونا چاہیئے، اور سنی حنفی مذہب کی تعلیم ان نوجوانوں کو جو عربی رسم خط سے واقف نہیں ہیں لسانیات، اخلاقیات، انسانیات، فلسفہ وغیرہ کے ذریعہ بالواسطہ دیدی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو سیکولر ہونے کے دعوے کرتے ہیں سنی اور "قزل باش" کے درمیان تمیز کرنا اور "قزل باش" کو نا قابل اعتبار سمجھنا سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن دین کی جو تعلیم سیکولر علوم کے ذریعہ دی جاتی ہے دینی اصولوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، اور ترکوں کا یہ کہنا کہ وہ مسلمان ہیں ان کی سماجی زندگی کے مسائل کو حل نہیں کر دیتا۔
میں اویا خانم کے والدین سے خاص طور پر اس لئے ملنے گیا کہ ان کی ذہنیت اور زندگی کے اصولوں کا جائزہ لوں۔ ان کے ماں باپ آرمینیا کے ضلع آذربائیجان سے سنہ ۱۹۲۲ میں، جب آرمینیا پر روس کا قبضہ ہو گیا، ہجرت کر کے ازمر آگئے تھے، اور پابند مذہب مسلمانوں کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ اویا خانم کے والد اور نانا انگریزی نہیں جانتے اس لئے ان سے کچھ تبادلۂ خیال نہ ہو سکا۔

والدہ انگریزی جانتی ہیں، وہ مجھے کسی قدر تفصیل سے بتاتی رہیں کہ انھوں نے اپنی دونوں لڑکیوں کی پرورش صحیح طریقے پر کی ہے، جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انھوں نے لڑکیوں میں عصبیت پیدا کی ہے اور انھیں یورپی لڑکیوں کی طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا۔ اویا خانم خود پچیس برس کی ہیں، یونیورسٹی میں تعلیم پا چکی ہیں، میں نے انھیں کسی موقع پر دب کر یا رک رک کر بات کرتے نہیں دیکھا، جو انتظامات انھوں نے میری تواضع کے سلسلے میں کئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں برسوں سے اس کا تجربہ ہے، مگر میری موجودگی میں وہ اپنے ایک سابق استاد کو جو انھیں اور مجھ کو کھانے پر بلانا چاہتے تھے مختلف طریقوں سے ٹالتی رہیں، اور جب وہ چلے گئے تو مجھے بتایا کہ یہ استاد ڈھائی برس سے ان کو اسی طرح اصرار کے ساتھ دعوت دے رہے ہیں اور انھوں نے دعوت کو کبھی قبول نہیں کیا ہے، اس لئے کہ کسی لڑکی کا غیر آدمی کی دعوت کو قبول کرنا مناسب نہیں ہے۔ غیر آدمی میں بھی تھا، اور جب میں نے ان کی طرف ذرا حیرت سے دیکھا تو انھوں نے کہا کہ آپ کا معاملہ اور ہے۔ یونیورسٹی کے رکٹر چاہتے تھے کہ آپ کی تواضع کی ذمہ داری میرے سپرد کریں، انھوں نے پہلے میری رضامندی حاصل کی، پھر میرے والدین سے اجازت لی، اور آپ کے لئے جو کار کرایہ پر لی۔ اس کا ڈرائیور ایسا شخص ہے جو میرے خاندان سے واقف ہے اور جس پر میرے والد کو پورا اعتبار ہے۔ معلوم نہیں اویا خانم کن مرحلوں سے گذر کر اپنی وضع کی پاسداری اور خود اعتمادی کی اس منزل پر پہنچیں، ان کی چھوٹی بہن عذرا جو ہائی اسکول میں پڑھتی ہے جتنی دیر میرے پاس بیٹھی اس کی شکایت کرتی رہی کہ اسے دو متضاد طریقوں پر عمل کرنے کو کہا جاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ اگر سڑک پر اس کی اسکول کے لڑکے سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس سے بات نہیں کرتی تو اسکول میں اس کا چرچا ہوتا ہے اور ساتھی اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اگر وہ بات کرتی ہے تو پڑوسی اور بزرگ اس پر حد سے زیادہ آزاد ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ میں عذرا کو مطمئن نہیں کر سکا۔ ترکی میں نئی اور پرانی وضع، یعنی "مغربیت" اور "اسلام" کی کشمکش جاری ہے اور جاری رہے گی۔

ترکی اور ہندوستان دونوں سیکولر ریاستیں ہیں، مگر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں کا

درمیان یگانگت اور خلوص کے تعلقات صرف ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعے پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ پاکستان نے ہوشیاری سے کام لے کر ترکی سے تہذیبی معاہدے کرنے میں پیش قدمی کی ہے، لیکن ترکوں کو یہ پسند نہیں ہے کہ اسلام کا واسطہ دے کر ان سے مطالبے کئے جائیں۔ ترکی نے پچھلی جنگ میں پاکستان کی جو مدد کی اس سے پاکستانی بالکل خوش نہیں ہوئے، اور ترک اپنی طرف عرب ملکوں کا رویہ دیکھ کر اخوت اسلامی کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں، اور اس کی وجہ سے پاکستانی پروپیگنڈا کا اثر بہت کچھ زائل ہوجاتا ہے۔ ہندوستان نے بین اقوامی سیاست میں جن اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر عمل کرنا اپنا مسلک ٹھہرایا ہے ترک سمجھتے ہیں کہ سیاست کی حقیقتوں سے چشم پوشی ہے، یہ اصول ترکوں کو ہندوستان کی طرف مائل نہ کرسکیں گے۔ لیکن انھیں حالات سے واقف کیا جائے تو انھیں ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کی بدولت ہندوستان سے ہمدردی ہوجائے گی، اور ہندوستان کو اپنی سیکولر پالیسی کا سیاسی اور اخلاقی معاوضہ مل جائے گا۔

ضیاء الحسن فاروقی

"کاروانِ فکر"

۱۹۸ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے چار مضامین کا یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) نے شائع کیا ہے، کتاب مجلد ہے مع گرد پوش، کتابت و طباعت اچھی اور قیمت تین روپے پچھتر پیسے ہے، کتابت کی غلطیاں بمشکل ایک دو ملیں گی، اور اس لحاظ سے بھی مکتبہ نے اپنا روایتی معیار برقرار رکھا ہے۔

اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل چار مضامین ہیں:۔

۱۔ اخلاقی قدریں

۲۔ علم اور زندگی

۳۔ تاریخ میں جبر و اختیار کی دھوپ چھاؤں

۴۔ ادبی قدریں

یوسف صاحب تاریخ و ادب کے عالم ہیں اور زندگی اور کائنات کے متعلق اپنا ایک سوچا سمجھا نظریہ رکھتے ہیں، مذکورہ چاروں مضامین اگر یکجا کر کے پڑھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں تاریخ و ادب اور علم و اخلاق کے مختلف پہلوؤں پر ایک ہی زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک ہی حقیقت ہے جو گفتگو کا موضوع ہے، اپنے دیباچہ میں مصنف نے خود لکھا ہے کہ "ان اوراق میں جو بحث و گفتگو کی گئی ہے اس میں انسانی زندگی کے محرک، یعنی اخلاقی قدروں کو خاص اہمیت دی گئی ہے"

انسان کیا ہے؟ کائنات اور خالق کائنات سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ دوسری مخلوقوں

کے مقابلہ میں اِسے کسی وجہ سے اور کسی درجہ فوقیت حاصل ہے؟ علم کیا ہے؟ اس کا منہاج اور مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ـــــــ یہ وہ بحثیں ہیں جو اس وقت سے جاری ہیں جب انسان کی ذہنی صلاحیتیں اتنی بیدار ہوئیں کہ وہ اسرارِ کائنات کو سمجھنے کا حوصلہ کرنے لگا، کبھی وہ اِس راہ میں سیدھا چلا اور کبھی بھٹک کر دوسری طرف نکل گیا لیکن اس کا یہ ذہنی و فکری سفر جاری رہا اور اس سفر میں بہرحال اُس نے مجموعی طور پر، نشیب و فراز، یمین و یسار کے باوجود ترقی ہی کی ہے۔ علم کے ذریعہ عرفانِ حقیقت کی ایک وہ کوشش ہے جو خالص عقل کے سہارے کی گئی، دوسری وہ ہے جو وجدان و وحی کے ذریعہ پیغمبروں کی طرف سے ہوئی اور جس میں دل کو بھی اہمیت دی گئی کہ گوشت کا یہ لوتھڑا اگر درست ہو جائے تو زندگی سدھر سکتی ہے۔ عقلیت کے علمبرداروں میں ایسے مفکر بھی گذرے ہیں جنھوں نے انسانی سیرت و اخلاق کو کافی اہمیت دی اور اخلاقی قدروں کو صحیح اور اچھی زندگی کے لئے ضروری سمجھا، معاشرہ میں انسان زندگی گذارتا ہے۔ وہ زندگی کے لئے سیکڑوں جتن محض اس لئے نہیں کرتا کہ زندہ رہے بلکہ اس لئے بھی کرتا ہے کہ بہتر طریقے سے زندہ رہے یعنی اچھی زندگی گذارے اور اچھی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرے تاکہ اس کی شخصیت کی تکمیل ہو، شخصیت کی تکمیل بغیر آزادی کے ممکن نہیں، سب انسان ایک سے نہیں ہوتے۔ مزاج اور طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، ذہانت میں فرق ہوتا ہے اور صلاحیتیں جدا جدا ہوتی ہیں، اس لئے اگر انسان کو آزادی سے محروم کر دیا جائے تو اس کی "وہ شخصیت" جو اس کی ذات میں اس طرح خوابیدہ ہے جیسے بیج میں پودا ہوتا ہے، کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔

فاضل مصنف نے علم اور تاریخ کی روشنی میں ان تمام مسائل سے بحث کی ہے اور آج کے انسان کے اُس ذہنی خلجان کی طرف پوری قوتِ استدلال سے واضح اشارہ کیا ہے جس میں وہ زندگی کی فراوانی کے باوجود مبتلا ہے۔ بظاہر زندگی ایک مٹی کے پیکر میں پنہاں ہے، لیکن اس کی اصل قوتِ تسخیر کی وہ خداداد صلاحیت ہے جو اِسے آشکار کرتی ہے، آج یہ قوتِ تسخیر اپنی معراج پر معلوم ہوتی ہے لیکن انسان کی کم آگاہی یہ ہے کہ وہ اس پر نازاں ہو بیٹھا ہے اور اپنی

محدود صلاحیتوں کو لامحدود تصور کرتا ہے، اُس کے سامنے امکانات کی دنیائیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں لیکن اخلاقی ظرف تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے اور یہی اُس کے ذہنی خلجان اور اخلاقی انتشار کا سبب ہے۔ گویا خیر و شر کی ازلی کشمکش نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہے، یوسف حسین خاں نے اِسے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"... لیکن انسان کی اس قوت نے اسے ایک دوسری قسم کے تنازع للبقاء سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ فطرت کے رازوں سے ناواقفیت اور اپنی عقل کی نارسائیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ فطرت پر اپنے اخلاقی ظرف سے زیادہ قابو پالینے کے سبب سے ہے، آج انسان کے سامنے زندگی کی فراوانی اور زندگی کی تباہی و بربادی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، یہ راہیں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے کھلی رہی ہیں۔ انھیں کو قرآن نے "وھدینٰہ النجدین" (اور ہم نے انھیں بتا دیں دونوں گھاٹیاں) کے بلیغ استعارے میں ظاہر کیا ہے۔ خیر و شر کی ان راہوں سے انسان کو قدم قدم پر واسطہ رہتا ہے اور ہر لمحے اسے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ کدھر جائے۔ یہ فیصلے اس کی عقل اور ارادے کی آزمائش بھی ہوتے ہیں اور اس کے مقدر کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ یہ اُس کی تخلیقی آزادی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ عقیدہ اور توفیق الہی اس آزادی کے برتنے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔"

اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان آزاد ہے یا فطرت کا محکوم، عہدِ جدید کے وہ معاشی، معاشرتی، علمی اور تاریخی نظریے جو انسان کو مجبور اور بے بس بتاتے ہیں، در اصل خارجی حالات اور قوانین فطرت کی جبریت ہی کو دیکھتے ہیں، انسانی روح کے اس شدید تقاضے کو نہیں دیکھتے جو انسان کو بلند سے بلند تر مقام عطا کرتا رہا ہے، انسان دوسرے جانوروں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ اس کا سر پستی کی طرف جھکا ہوا نہیں ہے، اُس کا سر اٹھا ہوا ہے اور اس کی اخلاقی حس پیہم سرگوشیاں کرتی رہتی ہے کہ وہ پستی کے بجائے بلندی پر اپنی نظر رکھے، مذہب اس بلندی کا منتہا ذاتِ واجب کو بتاتا ہے جس کی صفات وہ مطلق قدریں ہیں جن کی پرچھائیاں اس کی اپنی ذات

ہے، اُس کے دل پر متواتر پڑتی رہتی ہیں اور اس کے ضمیر کو، نفسانی ظلمتوں کے باوجود، بالکل مُردہ اور سیاہ نہیں ہونے دیتیں، انسان اگر ان مطلق قدروں کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنے علم کا مقصد اسی کو قرار دے تو زندگی میں حُسن پیدا ہو سکتا ہے اور اسی حُسن سے زندگی اور تہذیب سنورتی اور ترقی کرتی ہے، علم نیکی ہے، سقراط نے جب یہ کہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا، یہ علم یا سقراط کی تعریف کے پیش نظر یہ نیکی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب روح انسانی آزاد ہو، اُس کو اخلاقی آزادی حاصل ہو اور وہ اپنے علم کی مدد سے اپنے دل کی دنیا آباد کر سکے۔ یوسف صاحب نے اپنے مضمون "علم اور زندگی" کی ابتدا مولانائے روم کے اس شعر سے کی ہے:-

علم چوں بر دل زند یارے بود
علم چوں بر تن زند مارے بود

اور لکھا ہے کہ "علم سے اگر انسان کی اندرونی اور اخلاقی زندگی کی خدمت ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، لیکن اگر اس کا مقصد فطرت میں تصرف کر کے صرف آسائش کا سامان بہم پہونچانا یا مادی قوت حاصل کرنا ہو تو یہ کوئی بلند مقصد نہیں"۔ جدید انسان کی یہی غلطی ہے کہ وہ علم کے بنیادی مقصد کو بھلا بیٹھا ہے، جسے وہ علم سمجھتا ہے اُسے اقبال نے "فکر گستاخ" سے تعبیر کیا ہے جو فطرت کی طاقتوں کی عریانی کو زندگی اور تہذیب کا زیور تصور کرتا ہے۔

درحقیقت علم اور زندگی میں کوئی تضاد نہیں، یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، دونوں کا مقصد ایک ہے، دونوں میں جو نقطۂ اتحاد ہے اُسے اگر پا لیا جائے تو انسانی روح کی تخلیقی صلاحیتیں بیکراں اور بے پایاں اور زمان و مکاں کی "فضائے بسیط" پر پھیلی نظر آئیں گی۔ انیسویں صدی میں جو سائنسی نظریات مقبول تھے، اُن کی گرفت اس صدی میں کچھ ڈھیلی پڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یوسف صاحب نے ایسے تمام علمی اور سائنسی نظریوں کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ

.... گذشتہ پچاس سال کی تحقیقات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ عالم فطرت کل ہستی کا ایک جزو ہے اور اس کا انحصار کسی ایسے وجود پر ہے جو اس کے قبل سے موجود ہے۔

جمیس جینس اور اڈنگٹن کے یہاں ذات باری کا ذکر آتا ہے۔ پچاس سال قبل جو سائنس کے ماہر تھے وہ یہ سن کر شاید مبہوت ہو جاتے جمیس جینس اور اڈنگٹن جب خدا کا نام لیتے ہیں تو ان کی مراد موضوعی عینیت سے نہیں ہوتی بلکہ ان کے یہاں ایک ایسی ہستی کا تصور ملتا ہے جو قائم و دائم ہے اور جس پر عالم فطرت کا انحصار ہے اور وہ مادہ اور ذہن دونوں سے بالاتر ہے۔

آئن سٹائن نے ایک موقع پر کہا تھا۔ "کائنات پر ایک ذہن حکومت کر رہا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ذہن ریاضی داں کا ہے یا آرٹسٹ کا، شاعر کا ہے یا ان سبھوں کا مل کر۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہماری زندگی کو بامعنی بناتی اور اس کے کاروبار میں جان ڈال دیتی ہے۔ وہ ہماری امیدوں کو ابھارتی اور جہاں علم ناکام رہتا ہے وہاں ہمارے ایمان کو مستحکم کرتی ہے۔"

"علم اور زندگی" کے مصنف کے نزدیک فطرت پرستی کا رجحان جسے دیکارت اور گیلی لیو کے نظریوں سے بڑی تقویت ملی، زندگی کی بنیادی قدروں کی نفی کرتا رہا، لیکن اس رجحان کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے اس تاریخی حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ انسان نے ہمیشہ اپنے فکر کے بل بوتے پر اور اپنی ذہنی و روحانی زندگی کے سہارے فطرت پرستی کی زنجیریں بھی توڑی ہیں، "خود سائنس نے فطرت پرستی پر سب سے بڑی ضرب لگائی ہے، علم، عالم محسوس میں ...ے کی قوت رکھتا ہے اور یہی اس کی بنیاد ہے۔" (کاروانِ فکر، صفحہ ۶۹)

انسان کی یہ خواہش کہ اُسے اپنے وجود کا عرفان حاصل ہو، اسے ہزار پابندیوں میں خیال و عمل کی آزادی کے لئے اُکساتی رہتی ہے، اس طرح وہ تاریخ سازی میں ایک اہم کردار کا حامل ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "انسان اپنی معرفت تاریخ میں پاتا ہے نہ کی فطرت میں"۔ اقبال نے کہا تھا:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

دراصل یہی آزادی انسان کی تقدیر ہے۔ "اندرونی آزادی میں یقین کا یہ مطلب ہے"

انسان ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے جو صداقت کی ضمانت ہے، تخلیقی آزادی کا مقصد مذہبی نوعیت رکھتا ہے۔ غالباً عقلی طور پر اِسے ثابت کرنا مشکل ہے لیکن خود عقل یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنی آزادی اور صداقت کو اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب کہ وہ تخلیقی آزادی کی حقیقت کو تسلیم کرے۔ اسی میں انسانی تقدیر اور تاریخ کی توجیہہ و تعبیر تلاش کرنا چاہیئے۔ جدید تمدن کے بنیادی تصورات عقل کی فضیلت اور فطرت پر انسان کی برتری میں مضمر ہیں۔ انھیں اسی وقت بر روئے کار لایا جا سکتا ہے جب کہ زندگی کے مخفی امکانات کی تخلیقی صلاحیتوں کو مانا جائے۔ بغیر اس بات کو مانے ہوئے ذہن فطرت پر یہ تصرف کیسے حاصل کر سکتا ہے۔" (کاروانِ فکر، صفحہ ۹۸)

یہ عجیب بات ہے کہ آج کا انسان ایک طرف مذہب سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے، مطلق اخلاقی قدروں کو تسلیم نہیں کرتا، لیکن دوسری طرف ایسے تصورات کو مانتا ہے جس کا اثبات مذہب کرتا ہے، مثلاً عدل، آزادی، اخلاقی ارادے اور محبت، انسانیت اور انسان دوستی، اور یہ تصورات بقول ہمارے مصنف "فطرت میں کہاں ہیں؟ ان کی نوعیت خالص روحانی ہے" یہی وہ تضاد ہے جس نے انسان کو ذہنی الجھنوں اور روحانی اذیتوں میں مبتلا کر رکھا ہے، تجربیت، ثبوتیت، نظریۂ ارتقاء، نیچرل ازم، سب اسے ایسی منزل پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں جہاں وہ اپنے علم پر نازاں تو ہوتا ہے لیکن اپنے روحانی کرب کو چھپا نہیں سکتا، میرا خیال ہے کہ یہی روحانی کرب، ضمیر کی یہی چبھن اس کی ترقی کی ضامن ہے۔

تیسرے مقالے کا عنوان "تاریخ میں جبر و اختیار کی دھوپ چھاؤں" ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے تصورِ زماں کو بہت اہمیت دی ہے، "تاریخ، زماں (ٹائم) ہی کی سرگزشت ہے۔" اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف نظریوں سے بحث کی ہے، قرآنی آیتوں سے دلیلیں دی ہیں، اور یہ ثابت کیا ہے کہ "انسانی روح کی تخلیقی آزادی کا تصور جو تاریخ میں ظہور پذیر ہوتا ہے، روحانی نوعیت رکھتا ہے اور تاریخ اور تقدیر کے مسائل کا حل اسی میں مضمر ہے۔" ہیروڈوٹس اور دوسرے یونانی عالموں سے لے کر اسپنگلر اور ٹائن بی تک علوم کی ترقی کے ساتھ تاریخ کے متعلق نظریوں

میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں، اُن میں کبھی انسان کو مجبورِ محض قرار دیا گیا اور کبھی اُسے صاحب اختیار سمجھا گیا، جبر و اختیار کی اس دھوپ چھاؤں میں کبھی انسان فعّال نظر آتا ہے اور کبھی منفعل، درحقیقت اس دھوپ چھاؤں اور روشنی و ظلمت کے طویل سلسلہ کا تعلق اُن علمی نظریات سے رہا ہے جو کائنات اور اس میں انسانی وجود کی حقیقت اور مقصد سے بحث کرتے رہے ہیں، اس میں ایک خاص نظریہ اسلامی نظریہ ہے اور قرآن نے انسان کے تاریخی شعور کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے، تاریخ کے عالموں نے اپنی بے خبری اور کم آگاہی کے سبب اس نظریے کو اہمیت نہیں دی ہے ورنہ حقیقت میں یہی فکر سب سے زیادہ متوازن اور صالح نظر آتا ہے۔ ہمارے مصنف نے اس فکر کی وضاحت جس طرح کی ہے اُسے ہم مختصراً یوں بیان کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے قوموں میں زندگی، عزت اور سلطنت کا سبب اُن اخلاقی اعمال کو بتایا ہے جو روحانیت کا جزو ہیں اور جن کی نسبت حدیث میں ہے: "تخلقوا باخلاق اللہ" ابن خلدون کے اس فکر کا ماخذ قرآنی تعلیمات تھیں۔ قرآن عظیم نے صاف صاف کہا ہے کہ کسی قوم کی حالت میں اُس وقت تک تبدیلی نہیں پیدا ہوتی جب تک کہ وہ خود اپنے نفس میں تبدیلی نہ پیدا کرے، اور یہ منجانب اللہ ہوتا ہے لیکن اسی وقت جب انسان بھی اس کارِ الٰہی میں شریک ہو، اس طرح جدید تمدن و علوم کے برخلاف اسلامی تصور میں خدا اور انسان دونوں کا تاریخ میں مقام تسلیم کیا گیا ہے" تاریخ کو قرآن نے ایام الٰہی سے تعبیر کیا ہے جو انفس و آفاق کے علاوہ انسانی علم کا مستقل ماخذ ہے:

"اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم"

قرآن میں وہ آیتیں بھی ہیں جن میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ زندگی ہر لحظہ نت نئے روپ دھارن کرتی رہتی ہے، کوئی منزل آخری منزل نہیں انسانی زندگی ایک مسافرِ ابدی ہے جس کا انقلابی و تخلیقی سفر جاری رہتا ہے، اس سلسلہ میں تروش صدیقی کے اس شعر کے اور گہرے معنی ہو جاتے ہیں:-

مسافرِ ابدی کی نہیں کوئی منزل
یہاں قیام کیا یا وہاں قیام کیا

قرآن کی سورۂ والعصر میں، جس میں چند سیدھے سادے بول ہیں، زمان اور تاریخ کی نہایت بلیغ توجیہ پیش کی گئی ہے اور انسانی اعمال کے اجتماعی امکانات کی ایک دنیا پوشیدہ ہے، تاریخ انسان کے اعمال کے نتائج اور پھر اسباب و علل کے ایک سلسلہ کے سوا اور کیا ہے اور انسانی اعمال کا سرچشمہ انسان کا ضمیر ہے جس کا کوئی نہ کوئی گوشہ الٰہی صفات کی پرچھائیوں کے نور سے روشن رہتا ہے، یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے خدا خود انسان سے مایوس نہیں ہوتا۔

آخری مقالہ "ادبی قدریں" ہے۔ اس مقالہ میں بہت کچھ ہے اور زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ادب کا بنیادی مقصد اُن تہذیبی قدروں کی تخلیق اور پرورش ہے جن کی نوعیت آفاقی ہوتی ہے کیونکہ انھیں سے زندگی میں حُسن اور خیر کی برکتیں پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا کے بڑے ادیبوں اور فنکاروں کا مطمحِ نظر یہی رہا ہے۔ یوسف صاحب لکھتے ہیں: "اِن ادیبوں اور فنکاروں نے جمالیات سے زیادہ انسانی مقدر پر اپنی نظر رکھی اور روحانی آزادی کی منزلوں کی نشان دہی کی۔ اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے انسان دوستی کے اخلاقی اصول کو ادبی آب و رنگ میں سمو کر پیش کیا جس میں لوگوں کے لئے مسرت بھی تھی اور افادیت بھی، لطف بھی اور رہبری بھی۔ اخلاقی عمل کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی عالمی نظم کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور اس طرح خود اس میں عالمگیریت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے صداقت کا تعین ہوتا ہے جو حُسن و خوبی کے ساتھ ہم کنار ہوتی ہے۔ اگر کسی ادیب کی تخلیق انسان دوستی کے اخلاقی مقصد کو فروغ دینے میں قاصر ہے تو اس میں صداقت باقی نہیں رہ سکتی۔ پیغمبر اور مصلح نیکی اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن ادیب اور فنکار نیکی اور بدی کے پوشیدہ محرکوں کو ہمارے سامنے ظاہر کرتے ہیں تاکہ خود شناسی کا جوہر پیدا ہو۔ ادب کا مقصد اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا جو انسانوں کے لئے باعث برکت ہے۔" اپنے اس مقالہ میں بھی مصنف نے ادب سے متعلق مختلف نظریوں اور تحریکوں پر روشنی ڈالی ہے اور سب کا تجزیہ کرنے کے بعد نتیجہ یہی نکالا ہے کہ ادیب کو، معاشی انسان،

سیاسی انسان یا جمالیاتی انسان کی اصطلاحوں میں نہیں سوچنا چاہیئے۔ اس کا فرض ہے کہ مکمل انسان کی عکاسی کرے نہ کہ اس کے کسی جزو کی"۔ اور مکمل انسان کی عکاسی کے لیئے اخلاق کی ہمہ گیری کا تصور ناگزیر ہے، اس طرح کا ادب کبھی فرسودہ نہیں ہوتا ہے، اُس کا اثر قائم رہتا ہے اور قائم رہے گا جب تک کہ اس کرۂ ارض پر انسان بستے ہیں۔

"ادب اور فن کی تخلیق کبھی فرسودہ نہیں ہوتی۔ یوری پیڈ کے ڈراموں میں آج بھی تازگی محسوس ہوتی ہے، حالانکہ ارسطو کی "حیاتیات" کو آج کوئی نہیں پڑھتا۔ شیکسپیئر کا ہملٹ آج بھی ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے، حالاں کہ بیکن کی "منطق" کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ اس لیئے ہے کہ ادب اور فن کا موضوع زندگی کے بنیادی مسائل ہوتے ہیں جو بدلنے پر بھی بالکل نہیں بدلتے۔ ہر زمانے کا ادب ہماری بصیرت میں گہرائی پیدا کرتا ہے۔ اس میں تعقل، تخیل اور جذبہ سب سموئے ہوتے ہیں۔ اس کا اظہار کبھی عینی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی حقیقی شکل میں۔ دونوں حالتوں میں اس میں انسانی تقدیر کی عکاسی ہوتی ہے جس کی خصوصیت آزادی ہے۔ خیال کے اظہار کی آزادی روحانی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے"۔

(کاروانِ فکر، صفحہ ۱۹۲)

سید حرمت الاکرام

فیض اور اُن کا فن

"حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک، اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا ہی تقاضا نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے"

یہ خیال خود فیض احمد فیض کا ہے جس کا اظہار انھوں نے "دستِ صبا" کے "ابتدائیہ" میں کیا اور اسی ابتدائیہ میں انھوں نے ذیل کی سطور بھی سپردِ قلم کی ہیں:

"شاعر یا ادیب کو قطرہ میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے، یوں کہئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطر قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ہے"

فیض نے اپنے نظریہ کی روشنی میں شاعر یا ادیب کی عملی زندگی کا رخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فنکار کی بینائی اور فنی دسترس کے دوش بدوش اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت کی بھی آزمائش چاہتے ہیں اور اس کی جدوجہد کو محض مشاہدہ تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ مجاہدہ کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اس باب میں وہ اپنی زندگی کے ان شب و روز کو مثال بنا سکتے ہیں جو سلاخوں کے پیچھے گذرے ہیں اور جن کی یادگار "زنداں نامہ" کی شکل میں مردانِ کار کے لہو کو گرماتی رہتی ہے۔

فیض اشتراکی لشکر کے ایک سرفروش سپاہی ہیں اور انھوں نے "محنت و سرمایہ" کی جنگ میں

تیغ و تلوار سے نہ سہی، لیکن جسمانی سختیاں جھیل کر ضرور حصہ لیا ہے جس کی کڑیاں عمل کے مختلف شعبوں سے قید و بند کی حدود تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فیضؔ اپنی سخت کوشی اور صف آرائی پر نازاں ہیں اور اپنے دوسرے ہمنواؤں اور ہم سخنوں سے اس "مجاہدہ" میں شرکت کی توقع بھی رکھتے ہیں جس پر حیرت نہیں کی جا سکتی لیکن فیضؔ کے اس نظریہ کو اہل فن کی ذاتی و عملی زندگی کا جزو کس حد تک بنایا جا سکتا ہے اور بنایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں، یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔

فیضؔ کی شاعری پر ان کی اسیری نے کس حد تک اور کس کس پیرائے میں اثر ڈالا ہے، اس کی صراحت کے لئے "زنداں نامہ" کے صفحات کافی ہیں۔ جیل کی ابتدائی زندگی نے ان کی جن نظموں کو جنم دیا، ان میں اضطراب و ہیجان کی خروش انگیزی بڑی نمایاں ہے اور ہونی بھی چاہئے لیکن میعاد اسیری کی طوالت کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات میں جس قدر ٹھہراؤ آتا گیا، ان کی شاعری کی سطح بھی اسی نسبت سے پرسکون ہوتی گئی، اگرچہ اس کی تہ میں کروٹیں لینے والا تموج اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے بڑھتا گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نگاہیں رفتہ رفتہ زندانِ بلا کے در و بام اور ان کی سانسیں اس کی اندرونی گھٹن سے مانوس ہوتی گئیں اور بعض مواقع پر یہ صورت پیش بھی آتی ہے مگر فیضؔ پر اس کا اطلاق نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذبات کا وہ لاوا جو اول اول احساسات کے جوالا مکھی سے نطق کی وادیوں تک بیک جست پہنچ جاتا تھا، کچھ روز گذرنے کے بعد درمیان کے کئی مراحل کا پابند ہو گیا جہاں تخلیقی عمل کی شعلگی تھم تھم کر چلنا اور سانچے میں ڈھلنا سیکھتی ہے۔

فیضؔ نے "دست صبا" کا آغاز ذیل کے قطعہ سے کیا ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　　کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے　　　ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

لائل پور اور سرگودھا کے جیلوں میں فیضؔ کو جس قید تنہائی سے دوچار ہونا پڑا، اس میں ان کے لئے کاغذ قلم دوات، کتابیں، اخبار اور خطوط وغیرہ تمام چیزیں ممنوع تھیں جس کے پیش نظر اس قید کی صبر آزمائیوں کا تصور بآسانی کیا جا سکتا ہے اور اسے بیرونی دنیا سے ان کے ذہن کا رشتہ

زیادہ سے زیادہ منقطع کرنے کی کوشش اور اس کی نوعیت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعہ اسی قید تنہائی کی یادگار ہے۔ چنانچہ "خون دل میں انگلیاں ڈبونے" اور "حلقۂ زنجیر میں زبان رکھنے" کی واقعہ کو لازماً دی جائے گی لیکن ہماری نظر اس فیض کے چہرہ پر پہلے پڑے گی جو شاعر فیض ہے، مجاہد یا سپاہی فیض کا درجہ اس کے بعد آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ فیض خود اپنی نظر میں بھی شاعر پہلے ہیں، مجاہد سپاہی یا لیڈر بعد میں کیونکہ وہ اپنی شاعرانہ حیثیت کو پس پشت ڈالتے یا اسے ثانوی درجہ دیتے ہوئے نظر آئے تو یہ ہمارے واسطے ایک لمحۂ فکریہ ہوگا، لمحۂ فکریہ اس لئے کہ فیض، فن کی قیمت اور فنکار کے منصب سے آگاہ ہیں کہ نہیں جس کا جواب نفی میں ممکن ہی نہیں۔

وہ اب تک ہمیں اپنی شعری نگارشات کے تین مجموعے دے چکے ہیں، "نقش فریادی"، "دست صبا" اور "زنداں نامہ"۔ "نقش فریادی" ان کا اولین مجموعۂ کلام ہے جس میں وہ "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" کا راگ چھیڑنے کے ساتھ ہی رقیب سے بھی ہمکلام نظر آتے ہیں اور "غم الفت" کے "احسان مشترک" کا فسانہ دہرا کر دل کے زخموں کو کریدتے ہیں۔ گاہ وہ

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

کے مرحلے میں ملتے ہیں اور گاہ "ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط" کی مدہوش کن فضا میں رقصاں و غزلخواں پائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھیں ان موضوعات کو "طبعِ شاعر کا وطن" قرار دینے کا اعلان کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ان کا شاعرانہ شعور آگے بڑھتا ہوا ضرور ملتا ہے لیکن "لغزش مستانہ" ہر حال میں ان کے ساتھ رہتی ہے اور وہ مڑ مڑ کر ان نقوش اور ان مراحل پر نظر ڈالتے جاتے ہیں جو غم جاناں کی دین ہیں۔ کوئے جاناں کی گرد ان کے دامانِ شوق سے پہلے ہی کی طرح لپٹی ہوئی ملتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہر قدم پر مچل اٹھتا ہے اور خوشگوار یادوں کا افسوں انھیں تڑپا دیتا ہے، البتہ یہ اثرات بتدریج مدھم اور ہلکے ہوتے جاتے ہیں اور فیض

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

کا نغمہ الاپتے ہوئے "دست صبا" کی وادیوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے شاعرانہ خدوخال کافی بدلے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان کے دامن پر کوئے محبوب کی گرد کے اکھڑے ہوئے نقوش تو نظر آتے ہیں لیکن گرد کی تہیں نہیں ملتیں۔ "دست صبا" میں وہ "لغزش مستانہ" بھی کم یا بہت کم ملتی ہے جو انھیں بار بار رکنے، مڑ کر پیچھے دیکھنے اور دم لینے پر مجبور کرتی تھی۔ اب ان کے قدموں میں منضبط استحکام ملتا ہے اور عزم راہ نوردی کی چوٹ دور دور تک پڑتی ہے۔ "زنداں نامہ" کی بیشتر چیزیں عالم اسیری ہی میں کہی گئی ہیں جس کے نقوش و اثرات بڑے گہرے ہیں۔ ان نظموں میں شدائد کا احساس بھی پورے طور پر ملتا ہے لیکن لہجہ میں کم حوصلگی یا پسپائی کہیں نہیں آنے پاتی۔

یہ ظاہر ہے کہ ان کے ہونٹوں سے وہی بانسری لگی ہوئی ہے جو کوئے محبوب میں ان کے ساتھ تھی اور ان کی لے بھی وہی ہے مگر نغمے بدل گئے ہیں اور وہ اس بانسری پر پیار کے نہیں، انقلاب کے گیت گاتے ہیں۔ یہ بانسری ان کے خزینۂ شعری کی متاع بے بہا ہے اور وہ اس کی فنکارانہ قدر و قیمت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں، وہ اپنی لے کی مٹھاس یا اپنی آواز کی متانت سے دستکش ہونے پر آمادہ نہیں، غالباً اس لئے کہ یہ ان کی فطرتِ شعری کا جزوِ اول ہے

ترقی پسند تحریک کے ایک دور نے جس کی محفل آرائیاں بڑی ہنگامہ خیز تھیں، انقلابی و سیاسی شاعری کو نعروں سے قریب تر کر دیا تھا اور ہر بات زیادہ سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کہنے کی وضع نے شعر کو نہ صرف لوازم حسن سے معرا کر دیا تھا بلکہ بعض شاعروں کو "بدزبان" بھی بنا دیا تھا لیکن افراط و تفریط کی اس حشر انگیزی میں بھی فیض کی لے نہیں بدلی اور ان کے لہجہ کی گھلاوٹ، نرمی اور لطافت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ فیض کے ہونٹوں سے وہی بانسری چپکی رہی اور پھر رفتہ رفتہ سیاسی تغیرات کا کارواں اس موڑ پر پہنچا جہاں نعرہ بازیوں کو غیر ضروری ہی نہیں غیر مستحسن بھی قرار دیا گیا اور اس فیصلہ کی تشہیر بھی لازمی متصور کی گئی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فیض کے لہجہ کو مثال بنا کر پیش کیا گیا اور کبھی کبھی اسے ضرورت سے زیادہ سراہا بھی گیا جس میں تنقیدی دیانت کم تھی اور ہنگامی مصلحت اندیشیوں کا تناسب بڑھا ہوا تھا۔

فیضؔ، غزل اور نظم دونوں کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں مگر ان کے لہجہ کی رمزیت دونوں صورتوں میں یکساں برقرار رہتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لہجہ کی حلاوت و نشتریت کے ساتھ غزلیہ اصطلاحوں، تلمیحوں اور ترکیبوں کا بانکپن ان کی نظم کو وہی آہنگ و مزاج دیدیتا ہے جو غزل کی اساس ہے۔ ان کے لہجہ کی جدیدیت و جدت کا انحصار ہی غزلیہ روایات و علامات کو نئے معنی اور نیا رنگ دینے پر ہے جس سے ان کی آواز کے تاثر کو معنوی پھیلاؤ اور رچاؤ ملتا ہے، وہ نئے مسائل میں اجنبیت نہیں پیدا ہونے دیتے بلکہ ان کو ذہن کے قریب لانے میں اپنی دھیمی لَے سے بڑا کام لیتے ہیں لیکن بعض اوقات اور بعض معنوں میں یہ ایمائیت ایک متضاد کیفیت پیش کرتی ہے اور ان کی فنکاری کو آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔

فیضؔ کی فنی وضع میں جامہ زیبی و کجکلاہی کے تہذیبی وقار اور ذاتی پندار کی بڑی دلفریب اور نظر نواز جھلکیاں ملتی ہیں لیکن فیضؔ کا شاعرانہ بانکپن ہی اس وقار اور اس پندار کو ٹھیس بھی لگاتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں اپنی ظاہری سج دھج کے باوجود اندرونی طور پر کھوکھلی اور خالی خالی سی ملتی ہیں کیونکہ ان کی معنوی تشکیل و تعمیر کا حق پورے طور پر یا پوری چابکدستی کے ساتھ ادا نہیں ہو پاتا۔ ان نظموں کے تانے بانے میں ایسا الجھاؤ پایا جاتا ہے جس کی گرہ کشائی کے لئے راشدؔ اور میراجی کی نظموں کی طرح "پس منظر" کے جلیبائی معمہ کو حل کرنا ناگزیر ہے۔ کہیں کہیں ان کی لے کچھ اکھڑی اکھڑی سی بھی معلوم ہوتی ہے اور موقع بہ موقع ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو ابہام کے دھندلکوں کو زیادہ دبیز اور تہ در تہ بناتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات ان کے ذہن میں خود بھی اپنے خدوخال کو واضح نہیں کر پاتی اور نہ اس کی فکری صورت گری کا عمل تکمیل کے تدریجی مراحل کو طے کر پاتا ہے۔

ان کی شاعری کا تاثراتی حسن ایک طرف لہجہ کی رمزیت اور زخم خوردہ غمگینی کا ممنون ہے تو دوسری جانب اس کیفیت کے سہارے آگے بڑھتا ہے جسے عموماً از دل خیزد بر دل ریزد کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کیفیت جہاں ڈھلے ڈھلائے مصرعوں اور شعروں کو جنم دیتی ہے وہیں فیضؔ کی

فنی وفکری حیثیت کو نقصان پہنچاتی اور مجروح کرتی ہے۔ بلاشبہ فیض ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دور کے تمام سوز وکرب اور درد واضطراب کو شاعری میں سمیٹ کر اسے گرد وپیش کی نمائندگی کرنے اور حیات انسانی کی عالم گیر کشاکش سے قریب لانے کی پوری سعی کی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی سعی میں ہر مقام پر کامیاب بھی ہوں لیکن یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس ناکامی کا احساس فیض کو ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو یہ فیض جیسے شاعر کے مقصود فن کے منافی ہے اور اس کی پہلی ضرب ان کی مقصدیت ہی پر پڑتی ہے کیونکہ وہ اپنے مشاہدہ کو دوسروں تک پہنچانے کا ادعا رکھتے ہیں اور خود انھیں کے قول کے تحت پیش آمدہ نقوش ومراحل کی منظرکشی کے لئے نطق ولب کی یاوری شرط اول ہے جو بہرحال میں ان کی فنی ہمہ گیری کا تقاضا کرتی ہے۔

باایں ہمہ ان کوتاہیوں کی تلافی فیض کی شاعری کے وہ عناصر ایک حد تک کر دیتے ہیں جن میں نئے شعور کی تابناکی اور کلاسیکی ورثہ کی شائستگی کا بھرپور دخل ہے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت اور مبصرانہ دیانت چٹانوں اور خارزاروں سے حریر وپرنیاں بن کر گذرتی ہے لیکن اپنے اوپر کوئی ضرب یا خراش نہیں آنے دیتی۔ ان کے یہاں انقلابی وسیاسی آوازوں کی گونج کم نہیں ہے لیکن یہ گونج بڑی مختلف نوعیت اور بڑا مختلف انداز رکھتی ہے۔ ان کی شاعری خون کے دریا بہاتی ہے نہ توپوں سے ہولناک شعلے اگلواتی ہے بلکہ نئی زندگی اور نئے نظام کی بشارت نہایت دھیمی لَے میں دیتی ہے جس میں ایک رچی ہوئی دردمندی اور کانٹے میں تلے ہوئے خلوص کا گداز ہے۔

فیض ایک نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" میں کہتے ہیں:

یہ ساغر شیشے، لعل وگہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گذر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کے بعد ان کی نگاہ معاشی و سماجی حالات کا جائزہ لیتی ہے:

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پہ
پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

"درد آئے گا دبے پاؤں"، "دریچہ"، "یہ فصل امیدوں کی ہمدم"، "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" اور "ملاقات" میں ان کی عالی حوصلگی، جواں عزمی اور جگر داری افق فردا کی تابناکیوں کو

آواز دیتی ہے اور اس آواز کی جانب عوامی قافلے کو بلاتی اور لاتی ہے۔ قید و بند کے شعلہ زاروں سے ان کی جو آواز ہم تک پہنچی ہے اس میں حسرت و حرماں اور سوز و درد کی مختلف کیفیات تو وہی ہیں جنھیں ان کی شاعری کے اساسی و علامتی عناصر میں شمار کیا جاتا ہے لیکن ان میں فیض کے مجاہدانہ تیور کا تیکھا پن زیادہ محسوس و نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں — ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ — جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے — مقام ہے اب نہ کوئی منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے
سرے کوئی تیغ کا نظارہ اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا — بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی — جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے — ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے ہیں

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی، برا کیا — ہم سے جہاں میں کشتۂ غم اور کیا نہ تھے
گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم — کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا — ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں — دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں — جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

وہ جواب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھنے والو! کبھی ان کا جگر تو دیکھو
دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ آؤ، اک دن دل پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

"نقش فریادی" کے مقدمہ میں ن۔م۔ راشد نے فیضؔ کی شاعری کے متعلق یہ رائے دی ہے۔

"فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں، صرف احساسات
کا شاعر ہے۔"

احساسات کی سیمابی ہلچل ہر منزل پر فیضؔ کے ساتھ ہے، اس میں کوئی تغیر آ ہی نہیں سکتا لیکن "نقش فریادی" کی حدود سے آگے بڑھنے کے بعد فیضؔ کی شاعری میں نظریہ پسندی کا پرتو اتنا ہی گہرا اور روشن ہو جاتا ہے جتنی احساس کی پرچھائیاں۔ یہ نظریہ کسی چور دروازے سے داخل نہیں ہوا اور نہ چپکے سے در آتا ہے بلکہ بڑے نمایاں اور تیکھے انداز سے اپنی جگہ بناتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے نظریئے کی نمائش اس طور سے نہیں کی جس طرح کوئی تنگ ظرف اپنے کسی ذی حیثیت مہمان کی نمائش، ہمسایوں اور ملنے جلنے والوں میں کرتا ہے بلکہ فیضؔ نے جس قدر وسیع القلبی کے ساتھ اس نظریئے کی میزبانی کی، اتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ دوسروں سے اس کا تعارف بھی کرایا۔ نمائش اور تعارف بھی کرایا۔ نمائش اور تعارف میں بڑا فرق ہوتا ہے، فیضؔ نے نہ صرف اس فرق کو محسوس کیا بلکہ اس کو عملاً برتا بھی، یہ نظریہ ان کے لئے ایک مہمان کی طرح قابلِ تکریم ضرور تھا مگر قابلِ نمائش نہیں چنانچہ اس کو انھوں نے سر آنکھوں پر جگہ دی لیکن اپنی شاعری کو اس کے لئے "خانہ خالی" نہیں بننے دیا جس پر دیو کا قبضہ ہو جایا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی آواز نہ کبھی بے خانماں نہیں ہوئی اور نہ اس پر پناہ گزینی جیسی کوئی افتاد پڑی۔ ان کی آواز آج بھی اپنی جگہ برقرار ہے جبکہ ان کے بعض ہم عصروں کا لہجہ خانہ بدوشی میں مبتلا ہے اور جہاں کہیں دو گھڑی کا سکون ملتا ہے، ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ فیضؔ کے جمالیاتی شعور میں جس قدر بالیدگی ہے اتنی ہی توانائی بھی ہے، چنانچہ ان کی شاعری کے حالات کے پیچ وخم میں نہ راہ بھولتی ہے نہ ماندگی کا شکار ہوتی ہے بلکہ پوری حوصلہ مندی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

فیض کی پوری شاعری پر ایک حزن آمیز کرب کی ٹھنڈی کہر پھیلی ہوئی ہے جس میں غم ذات اور غم دیگراں، غم جاناں اور غم روزگار سبھی سمٹے ہوئے اور اپنے ساتھ ماضی، حال، مستقبل کو سمیٹے ہوئے ملتے ہیں۔ اس حسن آمیز کرب کا جس قدر تعلق ماضی کی راکھ میں دبے ہوئے شراروں سے ہے اتنا ہی رابطہ حال اور مستقبل کے آتشکدوں سے بھی ہے جن میں لمحوں اور ساعتوں کے شعلے بڑی تیزی سے بھڑک رہے ہیں اور پوری زندگی پر اپنا پرتو ڈال رہے ہیں، یہ پرتو کبھی کبھی اس لئے بیحد ہولناک ہو جاتا ہے کہ چہار جانب اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور فیض اسی اندھیرے سے برسرپیکار ہیں۔

کسی شاعر کی کم گوئی کو خامیوں کی فہرست میں جگہ نہیں دی جاسکتی لیکن فیض کی نظموں کا اختصار بعض صورتوں میں قابل گرفت ضرور ٹھہرتا ہے، یہ ان کی شاعری کے تاثر کو بڑھاتا بھی ہے اور ان کی بات کو تکمیل کی حدود تک پہنچنے سے روکتا بھی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں ایک نوع کا باطنی پھیلاؤ ہے جس کی حدیں تا دور پہنچتی ہیں جہاں انھیں "اجنبی صورتیں بھی محرم" دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ان کے جذبہ کی یگانگت اور اس کی اندرونی تہوں میں چھپی ہوئی دلسوزی و خلوص مندی کے خمیر سے اٹھنے اور ابھرنے والی انسانی اخوت کی دلیل ہے جو ان کی فکر میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی ہے۔ اسی لئے فیض کی غزلوں میں بھی وہی توانائی ہے جو ان کی نظموں میں۔ جہاں ان کی نظموں میں تغزل کا بھرپور رچاؤ ہے وہیں ان کی غزلوں میں حوادث روزگار سے نبرد آزمائی کا عزم محکم جولاں و رقصاں پایا جاتا ہے اور یہ توازن و تناسب اُس تپے ہوئے جذبہ اور اُس رچے ہوئے احساس سے گذر کر آیا ہے جن پر وقت نے اپنی پوری قوت سے شبخون مارے ہیں۔ ان کی غزل اپنا رنگ روپ سماجی و معاشی حقائق کے آئینہ میں نکھارتی ہے۔ ان کے یہاں فکر کا عمق کم ہے مگر خلوص میں ڈوبی ہوئی صداقت بڑی گہرائیوں تک جاتی ہے۔

"دور حاضرہ میں جن شعراء نے غزل کے امکانات کو تابناک تر اور وسیع تر بنایا ہے[۱۱] میں فیض کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے نظم کی طرح غزل کے حسن کو بھی اپنے ابلاغ کا نشانہ بنایا ہے ان کی شاعری کا مربوط مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ بے احتیاطیاں ان کے مزاج

پختگی کے ساتھ قدم جما چکی ہیں۔ چنانچہ جہاں انھوں نے اپنی شاعری کے پیکر میں نعرہ بازانہ خوش آئند گیوں کو پیوست نہیں ہونے دیا وہیں بعض دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں زبان وفن دونوں کو زیادہ نقصان پہنچایا اور نئی پود کو جو ان کی شاعری سے یک گونہ متاثر ہے، زیادہ گمراہ ہونے کے مواقع دیے۔ فیض کا یہ رویہ ان کی شاعری کے وزن و وقار کو کم اور ان کے شاعرانہ مرتبہ کو شدت سے مجروح کرتا ہے۔ لسانی وفنی ضوابط سے انحراف میں فراق و جگر کی غیر ذمہ داری اور آزادہ روی بھی اکثر ہدفِ تنقید بنتی رہی ہے لیکن فیض ان سے اس قدر آگے ہیں کہ کوئی موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں ضوابط سے وہ ضوابط مراد ہیں جن کی پابندی محض قدیار یا قافیہ پیا شعرا کا حصہ ہے اور ان سے یہ ممکن بھی تھا بلکہ اشارہ ان ضوابط کی جانب ہے جن کی اہمیت دورِ جدید نے بھی تسلیم کی ہے کیونکہ ان کا تعلق براہ راست مذاق سلیم سے ہے۔

بہرحال ان کی غزلوں کے چند اور اشعار مندرجہ ذیل ہیں جن سے ان کی آواز کو سمجھنے اور پرکھنے میں مزید سہولت ہوگی:

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے   وہ آزمائش دل و نظر کی وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن   یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے   چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
حضور یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب   گرہ میں لے کے گریباں کے تار تار چلے

جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل   وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس   مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

جنہیں خبر ہے کہ شرطِ نواگری کیا ہے — وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے
گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے — تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں — نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن — نگۂ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی — بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد — فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری — فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے — تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

دیکھا جائے تو فیض نے داخلیت سے خارجیت کی جانب قدم بڑھائے ہیں اور ان کی شاعری قد و گیسو کی روایات سے دار و رسن کی حکایات تک پہنچی ہے۔ یہ سفر جو انھوں نے تنہا بھی طے کیا ہے اور ہمراہیوں کے ساتھ بھی، بجائے خود بڑا اہم ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے قافلہ کی رفاقت معیت میں بھی تنہا رہے ہیں نیز یہی تنہائی ان کے ذہن کو جلا دیتی رہی ہے اور ان کا فن تاریخ کے موڑوں سے ٹکراتا امروز کی وادیوں تک پہنچا ہے۔

سلام مچھلی شہری

"ایک خط"

یہ خط بھی نجمہ ہی کا ہے اور میں پڑھے بغیر ہی یہ سوچ رہی ہوں کہ اس نے یہ یہ لکھا ہوگا۔
وہی زرد لفافہ ہے اور اندازِ نگارش بھی وہی ہوگا
یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نے اب لفافہ کھول دیا ہے اور خط پڑھنے لگی ہوں.... اس نے بھوالی کے سینی ٹوریم سے مجھ سے پھر کئی مضطرب سوالات کرتے ہوئے میری پُر معنی خامشی پر اظہارِ خیال کرتی ہوئی لکھتی ہے :-

"_____ زہرہ! میں اس عالم میں بھی اپنے وقار اور خود داری کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتی اور اسی لئے، تم سے، تمہاری خامشی بلکہ بے مہری کی شکایت نہیں کروں گی لیکن اب یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوں کہ وقت اور فاصلے نے شاید میرے خیال کو تمہارے دل سے مٹا دیا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں، جب میری زندگی ہی بیکار چیزوں میں شامل ہوگئی ہے تو تم سے کیا شکایت۔ لیکن میں اپنی ان نگاہوں کو کیا کروں جو کبھی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گذشتہ دنوں کی کہر میں ڈوبی ہوئی صبحوں کی جستجو کرنے لگتی ہیں اور کبھی سلونی شاموں میں خورشید کو شوپن ہلر کی تصنیف کے دھندلکوں میں محوِ خیال پاتی ہیں _____ زندگی اور اس کے راز کو چھو لینے کی تمنا خورشید کی ایک خاص عادت تھی، اور تم۔ ظاہر ہے تم بھی ایک شاندار چترکار ہو۔ اکثر کائنات کے رنگ برنگے راز کینوس پر پھیلاتی ہوئی نظر آتی ہو۔ جمیلہ آپا کی محبتیں بھی مجھے اکثر یاد آتی ہیں۔ سچ کہتی ہوں زہرہ! اب تو یہی کردار میری داستانِ حیات کے اہم ترین جزو بن چکے ہیں۔!"
نجمہ نے بڑی معصومیت اور سادگی سے اپنے محبوب کرداروں کا ذکر کر دیا ہے۔ وہ

جس نرم اور دھیمے لہجے میں بات کرتی ہے ، اسی نرمی اور پرسوز مٹھاس کو اس نے اس خط کے ان جملوں میں بکھیر دیا ہے ۔

نجمہ ہمیشہ مجھے "میڈونا" کی سی نظر آتی ہے ۔ اس وقت اس خط سے بھی اس کا یہی رُوپ اُبھرا ہے ۔ نجمہ بڑی پیاری لڑکی ہے ـــــ چند برسوں پہلے اسے آسائشِ حیات کی بڑی تمنا تھی اور اسی لئے اس کی فطرت ہمہ تن تبسم بہار بن گئی تھی ـــــ جب بھی وہ سج سجا کر خورشید کے سامنے جاتی تو اتنی پیاری لگتی کہ دل چاہتا کہ اسے روح کے آئینہ خانے میں بند کر لو ۔ ان دونوں نے اپنے حسین راز کو مجھ سے کبھی نہیں چھپایا ۔ وہ دونوں اپنی محبت کو مریم کے خیال کی طرح پاک اور لطیف سمجھتے تھے اور کہتے تھے مقدس چیز کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہیئے تاکہ ان کے پراگندہ خیالات سکون پا سکیں ۔ اس جذبہ کی تسکین کے لئے نجمہ نے مجھ سے خورشید کی تصویر بھی منگوائی تھی ـــــ آج بھی اسے خورشید سے سچی محبت ہے ۔ مجھے اس کا احساس ہے ۔

مجھے نجمہ کے اس خوبصورت راز کا علم ان ہی دنوں ہو گیا تھا جب "جمیلہ آپا" کا سہاگ لٹا تھا ۔ وہ بیوگی کا درد بھولنے کے لئے ، سب کچھ اپنے لختِ جگر خورشید ہی کو سمجھنے لگی تھیں اور تنہائیوں سے بچنے کے لئے ہماری کوٹھی میں آن بسی تھیں ۔ ان کی مانگ عالمِ شباب ہی میں اجڑ گئی تھی ۔ محبوب شوہر کی آخری نشانی کی پرورش اور تربیت کے احساس نے انھیں لوہے کا عزم عطا کر دیا تھا اور اسی عزم نے خورشید کو ایک مثالی کردار بنا دیا تھا ۔ ماں کی ممتا اور محبوبہ کی بے پناہ محبت پاکر خورشید کی پروازِ خیال بہت بلند ہو گئی تھی ۔ میں نے خود بھی ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ خورشید عام انسانوں کی ذہنی سطح سے کچھ بلند ہے ۔ وہ اب بھی ایسی آزاد زندگی کے خواب دیکھا کرتا ہے جہاں کائنات کی وسیع فضاؤں میں اس کے اپنے ہی خیالات پنچھیوں کی طرح اڑ رہے ہوں اور جہاں کوئی صیاد پہونچ بھی نہ سکے

ابھی کچھ ہی دنوں پہلے جب میں برش اور کینوس سنبھالے ، پائیں باغ میں کسی خیال کو رنگ ونقش دینے میں کھوئی ہوئی تھی ، وہ نہ جانے کہاں سے مسکراتا ہوا سامنے آگیا تھا اور

بڑے بھروسے سے مشورہ دینے لگا تھا "ـــــ زہرہ آپا! یہ تو ٹھیک ہے کہ کلاسیکی آرٹ میں لیونارڈو اور جدید فن میں آمرتا شیر گل کی تصویروں نے آپ پر جادو کر رکھا ہے لیکن میرے خیال میں آپ کی رفعتِ نظر ان سے بھی زیادہ ہے۔ تو پھر آپ اپنی اور صرف اپنی راہ پر چلئے اور قدرت کے زندہ شاہکاروں کی تصویریں بنایا کیجئے۔ مثلاً مونالزا کے تبسم کی بجائے نجمہ کی مسکراہٹ ......"

اور ایک دن جب نجمہ بھی میرے ساتھ خورشید کے آراستہ پیراستہ کمرہ میں موجود تھی تو خورشید کے ذہن میں بسے ہوئے دلکش خیالات گویا پر لگا کر آکاش کو چھونے لگے تھے۔ اس نے بہت دیر تک اپنے بلند ارادوں، جوان حوصلوں اور درخشاں مستقبل پر گفتگو کی تھی۔ اس نے ان رومانی شاعروں کا بھی ذکر کیا تھا جو اس حقیقت بھری دھرتی پر رہنے کے باوجود اپنی بیشتر زندگی تصور کے رومان پرور جزیروں میں بسر کرتے ہیں، اسی صحبت میں خورشید نے مزید تعلیم کے لئے یورپ جانے کے فیصلے کا اظہار کیا تھا اور اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتایا تھا کہ میں تنہا نہیں جاؤں گا، اور نجمہ کے عارض پر ایک سرخ سی لکیر دوڑ گئی تھی۔

کسے معلوم تھا کہ اچانک ہی نجمہ پر ٹی۔ بی کا حملہ ہو جائے گا اور اسے سینی ٹوریم جانا پڑے گا۔

اس خط میں بھی آگے چل کر، نجمہ نے ان ہی رنگین لمحوں کا ذکر کیا ہے ـــــ "زہرہ! کوئی کہہ رہا تھا بہار آگئی ہے۔ یہاں ہر مریض کے کمرے میں ہر صبح شگفتہ پھول رکھے جاتے ہیں۔ آج بھی میں ان پھولوں کو گذشتہ دنوں کی طرح شعریت سے لبریز پاتی ہوں، کھڑکی سے پرے مناظر بھی بہت نشاط پرور ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا زمین و آسمان مل کر کسی انتہائی حسین غزل کے جاوداں شعر بن گئے ہیں۔ سامنے پھولوں سے لدی ڈالیوں پر کوئلوں کی کوک زندگی کے پُربہار ہونے کا ثبوت دے رہی ہے لیکن نہ جانے کیوں میں انھیں نہیں سننا چاہتی۔ میری

نظریں تو اب اسی عہد پارینہ ہی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہیں جس سے میرا ماضی وابستہ ہے۔ اگر میں ان مناظر کو دیکھتی ہوں یا کوئلوں کی کوک سنتی ہوں تو یہ بھی خیال آتا ہے کہ یہ صرف میرا ذوق جستجو ہے اور کچھ نہیں ــــــ زہرہ! اگر اب بھی تم میری قنوطیت کی وجہ نہ جان سکو تو اپنی خاموشی سے پوچھ لو۔ خورشید تو تمہارے پاس، تمہاری کسی تازہ تصویر میں محو ہوں گے، ان ہی کی مسکراہٹوں سے جواب مانگ لو ــــــ!"

میں نجمہ کی اس مضطرب افسردگی کی وجہ جانتی ہوں لیکن اف! اتنا بڑا دل کہاں سے لاؤں جو اسے بتاؤں۔

آگے وہ پھر لکھتی ہے ــــ "زہرہ تمھیں تو میری بہت جلد افسردہ ہو جانے کی عادت کا علم ہے۔ میری مسلسل علالت نے اس عادت کو اور بھی جلا دیدی ہے۔ میں تو سوچتی ہوں کہ ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور تالابوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے قید کر رکھا ہے ــــ میں یہ قید نہیں چاہتی۔ نہیں چاہتی زہرہ! خدارا مجھے بتاؤ، خورشید کہاں ہیں؟ وہ مجھے خط کیوں نہیں لکھتے؟ خود تم کیوں پتھر کی طرح خاموش ہوگئی ہو؟ جمیلہ آپا کیسی ہیں؟ تمہاری نئی تصویر کا موضوع کیا ہے ــــ !!"

اس میڈونا کو کیسے بتاؤں کہ میری نئی تصویر کا موضوع کیا ہے، تصور کی ملگجی روشنی میں نجمہ کی شمع نما انگلیوں کی کپکپاہٹ مجھ پر اچھی طرح واضح ہے۔ میں اس کی شبنمی پلکوں پر لرزاں موتیوں کو دیکھ رہی ہوں ــــ ان ہی آنسوؤں نے خط کے آگے کے جملوں کو دھندلا سا کر دیا ہے اور مجھ سے مشکل سے پڑھا جا رہا ہے۔

"ــــ سچ سچ بتادو زہرہ! آخر راز کیا ہے۔ تم میرے انتہائی دردانگیز خطوط کے جواب سے گریز کیوں کر رہی ہو؟"

میں نجمہ کے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتے ہوئے ہونٹوں کی پکار سن رہی ہوں، لیکن میں اسے کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں، کیوں بتاؤں۔

بعض ناقدوں کا خیال ہے کہ میرا برش ذہنِ انسانی سے ابھرنے والے ہر سوال کا جواب کینوس پر بڑی خوبصورتی سے اُبھار دیتا ہے مگر آج یہی برش مجھ پر طعنہ زن ہے۔ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ مجھ سے پوچھ رہا ہے ــــ "نجمہ تو تمھاری واحد سہیلی تھی، تمھارے خوابوں کی طرح سلونی۔ پھر تم اس پر یہ ظلم کیوں کر رہی ہو۔ جواب دو نا۔ اُسے ــــ"

اس کے آخری جملے بہت کربناک ہیں۔

"ــــ اوہ میں بھی کتنی گنہ گار ہوں۔ تم ایسی سہیلی کو بھی اس طرح لکھ دیا مگر اسے بھی میرے سوزِ دروں کا اعجاز ہی سمجھو کہ میں یہاں، اسی ہیبت ٹوریم سے، اس وقت بھی تمھیں کینوس پر جھکے ہوئے آسمانی رنگوں کی دنیا میں گم دیکھ رہی ہوں۔ بہر حال میرا دل کہتا ہے کہ اب یادوں کے کنول جلانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن اس کو کیا کروں کہ خورشید کا چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ زہرہ! تم ان سے پوچھنا تو سہی کہ لطیف خوابوں کے دیکھنے والے انسان! کیا تیرے خواب بھی نجمہ کی طرح مردہ ہو گئے ہیں؟"

"چپ رہ نجمہ"! اُف، میں یہ کیا کہہ بیٹھی۔

خط کے یہ آخری جملے کہیں مجھ سے وہ کہلوا نہ دیں جو میں نہیں کہنا چاہتی۔ میں خود اپنی سیاہی میں گھر سی گئی ہوں۔ کائنات کا ہر رنگ اس تاریکی میں سیاہ ہو گیا ہے۔ میں اس اندھیرے کی ماہیت کیسے بتاؤں ــــ" اے خدا! اگر مجھے نجمہ اتنی عزیز ہے تو خورشید کو میرے دل سے نکال دے۔"

آغا کامل رزمی

اپ بھرنش

مسلمانوں کی آمد سے کافی پہلے ہندوستان میں پراکرت زبانیں نئے رنگ و آہنگ میں تبدیل ہوتی ہوئی وقت کے تقاضوں کے ساتھ چل رہی تھیں۔ قواعد نویسوں اور ادبی تاریخ نگاروں نے اس دور کی عوامی بولیوں کو "اپ بھرنش" (بگڑی ہوئی زبان) کہہ کر پکارا ہے۔ اپ بھرنش میں سنسکرت کے تت سم (اصلی) لفظوں کے بجائے تدبھو (بگڑے ہوئے) الفاظ آزادی سے استعمال کئے گئے ہیں۔ اپ بھرنش میں نگر، ودّیا، بھرمرک جیسے آسان سنسکرت الفاظ کے بدلے بھی نئر، بجیا، بھونرا استعمال ہوئے۔ جس سے زبان عالمانہ نہ رہ کر تعلی عوامی ہوتی گئی۔ اپ بھرنش میں اخلاقی، عشقیہ اور رجزیہ عنوانات پر شاعروں نے دوہے، چھپے اور گاتھائیں موزوں کیں۔

اپ بھرنش کا لفظ سب سے پہلے راجہ دھارسین ثانی کے ایک کتبہ میں ملتا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے باپ گہرسین کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش تینوں کا شاعر بتلایا ہے۔ راجہ ہرش (۶۰۶ء تا ۶۴۷ء) کے عہد کے مشہور شاعر بان کے "ہرش چرتر" کے مطالعہ سے اپ بھرنش کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے بدھ مذہب کی بجریانی شاخ کے سدھوں کی تصانیف میں اپ بھرنش کے نمونے ملتے ہیں۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے اپ بھرنش کا ملک میں چلن ہوا۔ اس وقت سے لے کر یہ زبانیں پرتھوی راج کے زمانہ تک مشرق میں بودھ تانترک اور سدھوں، وسط میں جین دھرم کے مبلغوں اور شمال مغرب میں ناتھ پنتھیوں کی مذہبی تحریکات میں کام آتی رہیں۔

ان لوگوں نے بخوبی سمجھ لیا تھا کہ سنسکرت اور پراکرت زبانوں میں تبلیغ کرنا عوام کے لیے چنداں کارآمد نہیں بلکہ بے اثر اور رائیگاں ہے۔ لہٰذا انھوں نے عوامی بولیوں کو ہی عوام الناس سے رابطہ قائم کرنے کی خاطر اپنایا۔ راج درباروں میں بھاٹ اور کوی بھی اپنی آشریہ داتا اور ممدوح کی تعریف اسی زبان میں کرتے اور بہادری کی داستانیں سناتے تھے

مسلم تلوں کا خاص زور پنجاب میں رہا جہاں ناتھ پنتھی اپنا اثر جمائے ہوئے تھے۔ مسلمان گھرانے پنجاب اور دہلی میں آباد ہوتے جا رہے تھے جہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے ساتھ عربی و فارسی زبانوں کے الفاظ مقامی زبان و بیان کو متاثر کر رہے تھے۔ اسی دور میں مسلمان صوفیوں درویشوں اور اہل اللہ نے بھی ہندوستانی عوام میں توحید اور تصوف کی تبلیغ کی خاطر عربی و فارسی پر یہاں کی مقامی بولیوں کو ہی ترجیح دی۔ مسلمانوں کے اختلاط، اثر اور ربط وضبط سے یہاں کی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ کی آمیزش فطری طریقہ پر ہونی شروع ہوگئی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۰۰۰ء کے حدود میں جنوبی ہند کو چھوڑ کر تمام ملک میں اپ بھرنش رائج تھی مگر اتنے وسیع اور ہر لحاظ سے مختلف علاقوں میں اس کے اسلوب یقیناً مختلف رہے ہوں گے۔ اپ بھرنش کی خاص قسمیں اور ان کے حدود وعمل حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ماگدھی اپ بھرنش

یہ مگدھ دیش یعنی صوبجات بہار و اڑیسہ اور بنگال کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ بودھ تانترک اور سدھوں کی تبلیغی جماعتیں اسی میں پرچار کرتی تھیں اور یہ بات اس زبان کی ترقی کے لئے زبردست نعمت ثابت ہوئی۔ تحریر و تقریر کا کام اسی میں ہوتا تھا۔ ماگدھی اپ بھرنش سے آہستہ آہستہ آسامی، بنگالی اور اوڑیہ زبانیں پیدا ہوئیں جنھوں نے رفتار زمانہ کے ساتھ ترقی اور کامیابی کے مراحل طے کئے نیز ملکی ادب میں خاصا اضافہ کیا۔

۲۔ اردھ ماگدھی

یہ بولی مغربی بہار اور مشرقی یوپی میں رائج تھی۔ بودھ اور جین مبلغ اس اپ بھرنش کو

پھیلا رہے تھے۔ بھوجپوری اور مشرقی ہندی نے آگے چل کر اردھ ماگدھی کی جگہ حاصل کی۔
اسی کا ایک اسلوب آگے چل کر "اودھی" کے نام سے مشہور ہوا۔ ہندی کے کلاسیکل شعراء کی
اودھی میں کافی تصانیف ہیں۔ سنت کوی کبیر (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء) کی زبان بھی کچھ پرانی
اودھی ہے۔ جس میں عربی وفارسی الفاظ کی آمیزش ہے۔ ملک محمد جائسی (پیدائش ۹۰۰ ہجری)
کی زبان بھی پوربی اودھی ہے۔ گوسوامی تلسی داس (متوفی سمبت ۱۶۸۰ مطابق ۱۵۵۴ء) کا "رام
چرت مانس" وغیرہ بھی اودھی میں ہے۔

۲۔ شورسینی اپ بھرنش

یہ تمام اپ بھرنش بولیوں میں ممتاز سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اس کا علاقہ شمالی ہندوستان کے وسط
میں مغربی یوپی، دلی اور پنجاب کا تھا۔ پہلے یہ گری پڑی رہی مگر پھر اس کی ترقی کے دروازے
کھلے۔ راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کو جب دلی اور دوآب کے علاقوں میں فروغ ہوا تو شورسینی
اپ بھرنش کو بھی کافی عروج حاصل ہوا۔ بعد کو شورسینی سے مغربی ہندی اور پنجابی رونما ہوئیں۔
مغربی ہندی کے دو اہم اسلوب منظر عام پر آئے یعنی دوآب کے علاقہ میں کھڑی بولی اور
متھرا کے آس پاس برج بھاشا کو فروغ ہوا۔

موجودہ ہندی کھڑی بولی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے جو اردو سے بہر حال مماثلت رکھتی
ہے۔ دراصل کھڑی بولی میں اگر سنسکرت کے الفاظ زیادہ مستعمل ہوں تو آج کی اصطلاح
میں ہندی ہے اور اگر عربی وفارسی کی آمیزش ہو تو اردو۔ کھڑی بولی کے مقابلہ میں برج بھاشا
زیادہ نرم ونازک ہے جس میں الفاظ کو شاعر بعینہ نہ رکھ کر ترمیم کر دیتا ہے۔ ہندی کے شعراء
کی زبردست اور غالب اکثریت کو برج بھاشا زیادہ پسند رہی ہے۔ سورداس (سمبت ۱۵۴۰
تا ۱۶۲۰) ان میں گل سرسبد ہے۔ سورداس نے کرشن بھگتی میں سوا لاکھ پد موزوں کئے ہیں۔
(اگرچہ پانچ ہزار کے علاوہ باقی اب نایاب ہیں)۔ تلسی داس نے بھی برج بھاشا کو اپنے کلام
میں استعمال کیا ہے۔

۴۔ آونتی اپ بھرنش

یہ راجپوتانہ کے ریگستانی علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ راجستھانی زبان کا سرچشمہ یہی آونتی اپ بھرنش ہے۔ اس کی شاخوں میں مارواڑی سب سے اہم ہے۔ راجستھانی ادبیات کا بیشتر حصہ اسی اسلوب میں ہے۔ اس کے علاوہ میواتی، جے پوری، مالوی بھی اسی کی اولاد ہیں۔ بندیل کھنڈ کے علاقہ میں بندیلی بولی جاتی تھی۔ آلھا اودل کی رجزیہ داستانیں بندیلی زبان میں ہی ہیں۔ آلھا کا مخصوص اسلوب اور طویل انداز بیان دیہاتوں میں فرصت کے اوقات میں، اب بھی پسند کیا جاتا ہے۔

۵۔ ناگر اپ بھرنش

یہ موجودہ گجرات اور قرب وجوار کے راجپوت علاقوں میں رائج تھی۔ سولنکی راجاؤں کے عہد میں یہ کافی عروج پر تھی۔ ناگر اپ بھرنش سے ''گرجری'' نکلی جس کی ترقی یافتہ شکل ہی موجودہ گجراتی زبان ہے جس نے بقول محققین کلاسیکل اردو کو ایک گونہ متاثر کیا ہے۔ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے فاضل ڈائرکٹر پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے حال ہی مرتب کردہ اپنے ''لغات گجری'' کو اردو کا قدیم ترین لغت قرار دیا ہے۔

۶۔ مہاراشٹری اپ بھرنش

گجرات کے جنوب میں مغربی گھاٹ کے کوہستانی علاقوں میں مہاراشٹری اپ بھرنش رائج تھی جو براہ راست عربی زبان سے متاثر تھی کیونکہ آغاز اسلام سے ہی عرب تاجر بحر عرب میں جہازرانی کیا کرتے اور جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ اس طرح عربی کا اثر بڑھتا گیا۔ ایران میں غلبۂ اسلام کے بعد پارسیوں کی آمد بھی ادھر بہ کثرت ہوئی۔ موجودہ مرہٹی (مراٹھی) اور کوکنی زبانیں اسی مہاشٹری اپ بھرنش کی جانشین ہیں جن میں خلاص، برابر، مذکور، پروانگی، رضا، نادار ی وغیرہ وغیرہ الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اس سے اردو کی ارتقا میں کافی مدد ملی۔ خود سرسید مرحوم بمبئی میں پارسیوں کی اردو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اردو کی ملک گیر امتیازی ترقی پر مہر تصدیق ثبت کی۔ یہی نہیں بلکہ اردو تھیٹر کی تحقیق کے سلسلہ میں ہمارے محترم

دوست ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نامی سندیلوی پرنسپل اورینٹل کالج بمبئی نے بھاؤ داجی لاڈ کا نام اردو کے پہلے ڈرامہ نویس کے طور پر دیا ہے۔

۷۔ ڈنگل اور پنگل

راجپوتوں کے سیاسی اثر و رسوخ سے ایک زمانہ میں ڈنگل اور پنگل کا زور ہوا۔ ڈنگل اپ بھرنش کی وہ شاخ تھی جو راجپوتانہ میں رائج تھی۔ پنگل دلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ ڈنگل میں قدرے کرختگی کا احساس ہوتا ہے جبکہ پنگل میں کافی شیرینی اور مٹھاس ہے۔

یہ اپ بھرنش کا ایک مختصر جائزہ ہے جو ملک میں اردو زبان کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اردو نے اگرچہ تمام اپ بھرنشوں سے کچھ نہ کچھ استفادہ کیا ہے تاہم ماہرین لسانیات کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ہماری اردو شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی کی نمائندہ زبان ہے جس میں عربی فارسی وغیرہ کی بہترین آمیزش اور ایک حسین امتزاج موجود ہے اور آگے چل کر اس میں مغربی زبانوں کے ارتباط سے مزید توسیع و ترقی ہوئی ہے۔ اس طرح اردو ایک بہترین لچکدار زبان ہے۔

عنوان چشتی

اُردو کی صوفیانہ شاعری

فلسفہ وتصوف علم وعمل کے موضوعات ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ موضوعات حرف وصوت میں ڈھل کر ادب وشعر کہلائیں۔ ہم اخبار کے اشتہاروں اور "غبارِ خاطر" کی تحریروں میں فرق کرتے ہیں ایک کو ادبی دوسرے کو غیر ادبی کہتے ہیں۔ یہی فرق ادبیت یا شعریت کہلاتا ہے۔ جس کا تعلق مواد سے کم اور اسلوب سے زیادہ ہے۔

اردو میں لٹریچر کا ترجمہ "ادبیات" یا "ادب" کیا گیا ہے۔ 'ادب' عربی میں تہذیب کا ہم معنی ہے۔ اور اس لفظ کو ان تمام علوم وفنون کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ جو تہذیب وشرافت، نفاست و پاکیزگی اور ادراک وشعور کا سرچشمہ ہیں۔ اور ہماری مادی اور ذہنی مسرتوں کا ذریعہ ہیں۔ قدیم عربی 'ادب' سے مراد علمِ زبان تھا مگر جدید عربی میں انگریزی کی طرح 'ادب السیاست' اور 'ادب الثقافت' جیسی اصطلاحات عام ہوگئی ہیں۔ انگریزی میں یہ لفظ بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ وہاں ہر طرح کی تحریر کو لٹریچر کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ ادبی ہو یا غیر ادبی۔ علمی ہو یا غیر علمی۔ اس لئے ایک نقاد نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تمام تحریریں جو قوموں نے اپنے بعد چھوڑیں خواہ ان کی نوعیت بہ اعتبار اسلوب، مواد اور مقصد کچھ ہو، "ادب" ہیں۔ ہڈسن بھی اِسی طرح کی بات ذرا سی شرط کے ساتھ کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عام دلچسپی کی تمام تحریریں ادب ہیں۔ اس لئے انگریزی میں ہر تحریر کو اس کے مقصد کے ساتھ وابستہ کر کے پکارا جاتا ہے مثلاً مذہبی ادب یا تاریخی ادب مگر اردو میں ادب کا وہ تصور نہیں جو جدید انگریزی اور عربی میں ہے۔ یہاں تاریخی، جغرافیائی، سائنسی، منطقی اور دوسرے علمی موضوعات سے متعلق تحریروں کو ادب نہیں کہتے۔ بلکہ یہاں ادبی

تحریر وہ تحریر ہے جس سے ایک خاص قسم کی روحانی اور وجدانی آسودگی میسر ہو۔ یہ آسودگی اکثر اوقات جذباتی اور روحانی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حسین چمن کی آبیاری اور اس کی نشو ونما سے باغباں کو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اس شخص کی خوشی سے بالکل الگ ہوگی جو سیر چمن گلگشت سے محسوس کرتا ہے۔ پہلی خوشی مادی اور دوسری غیر مادی کہلائے گی۔ یہیں سے ادب اور فنون لطیفہ کے تعلق کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر طرح کا ادب تو فنونِ لطیفہ کے دامن میں جگہ نہیں پا سکتا۔ وہی ادب فنونِ لطیفہ میں شمار کیا جائے گا جس میں ادبی وشعری پُراسراریت ہو۔ ادب نثری بھی ہوتا ہے اور شعری بھی مگر دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اس لئے دونوں کی ادبیت یا پراسراریت کے تناسب میں بھی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ نثر میں عقلیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے جبکہ شعر میں رومانیت کا۔ نثر کی بہ نسبت شعر میں رومانیت اور شعریت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہیگل نے شاعری کو اعلیٰ درجہ کا فنِ لطیف قرار دیا ہے۔ اس شعریت یا ادبیت کی اساس جمالیاتی کیفیت ہے۔

جمالیاتی کیف وکشش کی طرف واضح اشارہ کرنے کے لئے اٹلی کے مشہور فلسفی کروچے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ کروچے نے علوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وجدانی علوم اور عقلی علوم۔ وجدانی علوم تخیل کی وساطت سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان میں رومانیت کے عناصر ہوتے ہیں۔ یہ عناصر جزویات سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ان کا کام "صورت گری" یا ترتیب وتہذیب اجزاء ہے۔ جس کو دوسرے لفظوں میں اظہار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کروچے وجدان کو صناعی اور صناعی کو وجدان خیال کرتا ہے۔ مصوری ہو یا بت گری۔ موسیقی ہو یا شاعری وجدان کا اظہار ہیں۔ اس لئے آرٹ کو وہ وجدانی تجربہ یا روحانی عمل کہتا ہے اور ادب وفن کو روح کی ایسی آواز بتاتا ہے جو پیشِ نگاہ زندگی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ کیٹس کے خیال میں بھی آرٹ اپنی غایت آپ ہے۔ ہر حسین چیز بجائے خود ابدی مسرت ہے۔ اس لئے فنکار کا کام محض صورت گری اور حسن آفرینی ہے۔ تاکہ حسن اور اس سے حاصل ہونے والی مسرت میں اضافہ ہوتا رہے۔ شاعری سے بھی چونکہ "ایک گونہ بیخودی" حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری بھی فنِ لطیف قرار پایا۔ جس کی روح جمالیاتی

کیفیت ہے۔ اسی جمالیاتی کیفیت کو غالبؔ "چیزے دگر" اقبالؔ "نمودِ خونِ جگر" قاآنی "شعریت" اور جگرؔ "تاثیر" کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ماورائیت ہے جو فن کو بیکراں بناتی ہے۔ اور اس کو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد کرتی ہے۔ اس لئے اسپنگارن نے کہا ہے کہ شاعری اخلاقی ہوتی ہے نہ غیر اخلاقی بلکہ وہ آرٹ کا نمونہ ہوتی ہے۔

یہ جمالیاتی کیفیت خام مواد میں نہیں ہوتی۔ خام مواد جب تخلیقی عمل سے گزر کر صورت پذیر ہوتا ہے تو اس میں جمالیاتی جھلک نظر آتی ہے۔ گویا جمالیاتی جھلک مواد میں نہیں اسلوب میں ہوتی ہے۔ کروچے بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ جب تک کوئی جذبہ یا خیال تخلیقی عمل سے گزر کر مجسم و متشکل نہیں ہوتا اس میں جمالیاتی کیفیت پنہاں رہتی ہے۔ صورت پذیری کے بعد ہی اس میں نمایاں رہتی ہے۔ اس لئے افکار کا الجھاؤ اور الفاظ کا بکھراؤ دونوں چیزیں جمالیاتی کیفیت کو کم کرتی ہیں شاعر اور فنکار کی نارسائی اور ناپختہ کاری بھی فن میں تخلیقی شان پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اس لئے بہترین تخلیق وہ ہے جس میں لفظ اور خیال، مواد اور ہیئت ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ میکس ملر کے نزدیک بھی لفظ خیال ہے اور خیال لفظ۔ ہر جذبہ اور خیال اپنے ساتھ مناسب حرف و صوت لاتا ہے۔ اب یہ فنکار کا کمال ہے کہ وہ ان چیزوں کو شخصیت کے نہاں خانے میں تحلیل کر کے صفحۂ قرطاس پر اس طرح اجاگر کرے کہ دوئی کا تصور بھی باقی نہ رہے۔ ایسی تخلیق ہر طرح مکمل متوازن اور معیاری ہوتی ہے۔ اس لئے ایک نقاد کی رائے میں بہترین خیال کو بہترین الفاظ میں بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا نام شاعری ہے۔ آتشؔ نے بھی "مرصع سازی" اسی معنی میں کہا ہے۔ فلسفہ و تصوف میں ہر لفظ کی جمالیاتی حیثیت کے ساتھ منطقی حیثیت بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ فلسفہ و تصوف کے نازک مسائل و مراحل کے اظہار کے لئے انتہائی موزوں لفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے صوفیانہ اور فلسفیانہ شاعری میں صورت گری اہم کام ہے۔

فلسفہ و تصوف علمی و عملی موضوعات ہیں۔ کروچے انھیں عقلی علوم کہتا ہے۔ جس کے ڈانڈے عقلیت اور خارجیت سے مل جاتے ہیں۔ شاعری جمالیاتی فن ہے۔ جس کا تعلق وجدانیت

اور داخلیت سے ہے ۔ ان بظاہر دو متضاد اور متصادم چیزوں کو ایک دوسرے میں تحلیل کر کے آرٹ کی بلندیوں کو چھونا آگ میں پھول کھلانے سے کم نہیں ۔ آگ میں پھول کھلانے کا فن ہی صوفی اور شاعر دونوں کا فرض ہے ۔ حقیقی شاعر خارجیت کو داخلیت میں، عقلیت کو رومانیت میں تحلیل کر کے ایسی تخلیق پیش کرتا ہے جس سے ایک طرف ذہن وفکر کی بالیدگی اور دوسری طرف دل ونگاہ کی آسودگی ہوتی ہے ۔ اس طرح اچھی اور سچی صوفیانہ شاعری خواب اور حقیقت کے حسین ترین امتزاج سے جنم لیتی ہے ۔

صوفیانہ اردو شاعری کی جمالیاتی قدر وقیمت مشکوک ہے اور یہ حسنِ صورت سے محرومی کے سبب بے کیف و بے اثر معلوم ہوتی ہے ۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تصوف نے غزل کو حریتِ فکر، حریتِ جذبات اور حریتِ اظہار کی برکتوں سے سرفراز کیا ۔ ادبی لحاظ سے حکیمانہ افکار وخیالات سے مزین کر کے گہرائی وگیرائی عطا کی ۔ تصورِ حسن وعشق کی پاکیزگی اور سنجیدگی کی دولت سے مالا مال کیا ۔ زبان وبیان کو وسعت، تہ داری اور رمزیت کی جادوگری بخشی ۔ لیکن نظر غائر سے مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اردو کی تمام صوفیانہ شاعری ایک معیار و کردار کی حامل نہیں ہے ۔

یہ الگ بات ہے کہ اردو غزل میں ہندوستانی عناصر موجود ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو غزل فارسی غزل کا عکس جمیل ہے ۔ ایران کی طرح ہندوستان کا ذہن فلسفیانہ اور مزاج رومانی ہے ۔ یہاں تغزل اور تصوف کے ہندوستانی روپ ویدانت اور شرنگار رس کی پہلے سے موجودگی اس کا ثبوت ہے ۔ اس لئے تصوف اور تغزل کا پودا یہاں کی آب وہوا میں بہت جلد تناور درخت بن گیا ۔ اور اردو غزل اپنے اندر تصوف و تغزل کے حسین ومتین عناصر اپنے اندر جذب کرتی گئی ۔ مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں نے اپنے طریقۂ فکر وکار سے ان چیزوں کو اور بھی بڑھاوا دیا ۔ اس لئے اردو کے تمام چھوٹے بڑے غزل گو شاعر شعوری اور غیر شعوری طور پر روایت کے گہرے اثرات اور عوامی رجحانات کا شکار ہوتے گئے ۔

اردو کے بیشتر شعراء کے یہاں کوئی فکری نظام نہیں ہے۔ البتہ ریزہ خیالی اور تضاد کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ قریب قریب سب نے تصوف برائے شعر گفتن خوب است' پر عمل کیا، مگر اس کو عملی و علمی طور پر نہیں پرکھا اور اس کی فلسفیانہ وحدت و صداقت کو نہ صرف نظرانداز کیا بلکہ اپنے لئے کسی ایک نقطۂ نظر کا انتخاب بھی نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر شاعروں کے یہاں مختلف نظریے دست و گریباں ہو گئے، اور فکری الجھاؤ کی وجہ سے فنی صنم سازی بھی ادھوری رہ گئی۔
نظریاتی تضاد اور فکری الجھاؤ کی مثالیں اردو کے تمام غزل گو شاعروں کے یہاں مل جاتی ہیں۔ خواجہ میر درد کی علمی و عملی زندگی اور سیادت و سجادگی اپنی جگہ مسلم مگر وہ اسلامی تصوف کے مختلف نظریے اور ان سے ملتے جلتے غیر اسلامی نظریوں کے نازک امتیازات کو جانتے ہوئے اپنی شاعری میں قائم نہ رکھ سکے۔ غالب جیسا آفاقی ذہن رکھنے والا شاعر مولوی فضل جیسے وحدت الوجودی سے ارادت کے باوجود اس تضاد سے نہ بچ سکا۔ غالب کے یہاں تو یہ تضاد طرزِ بیدل کی پیروی جدت طرازی کے ذوق اور مشکل پسندی کے زعم کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہے، فانی کو تصوف کے مطالعے اور افتادِ طبع دونوں نے تصوف کے قریب کیا مگر وہ بھی شہود، وجود اور ویدانت کو گڈمڈ کر گئے۔ اصغر و فانی دونوں شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت و ارادت کے باوجود فکری و عملی طور پر کسی ایک راہ پر گامزن نہ رہ سکے۔ قلی قطب شاہ سے ولی تو اس عہد کی کچی زبان کی طرح تصوف کے مسائل بھی "دودھیا" نظر آتے ہیں۔ البتہ آسی غازی پوری وحدت الوجودی اور اقبال ایک مخصوص نظریۂ حیات کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کے یہاں فکری و فنی رچاؤ ملتا ہے۔ امیر مینائی، آتش اور دوسرے شعراء تو ان لوگوں تک بھی نہ پہنچ سکے۔
بہت سے اشعار میں صوفیانہ اصطلاحات، علامات اور الفاظ کو نظم کر کے فرض کر لیا گیا ہے کہ صوفیانہ شاعری کا حق ادا ہو گیا۔ ان چیزوں سے غزل کو نئے موتیوں کا خزانہ تو مل گیا مگر ان کی ثقالت اور غرابت سے غزل کی فطری معصومی، سادگی اور نرمی کا خون ہو گیا۔ اور اس کے پیکر کا حسن کم سے کمتر ہو گیا۔ الفاظ کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک منطقی دوسری جمالیاتی۔ الفاظ کی منطقی

حیثیت اس کی شاعرانہ حیثیت پر حاوی ہوکر جمالیاتی کیفیت کو کم کرتی ہے ۔صوفیانہ شاعری میں ایک طرف کسی اہم مسئلے کی ترجمانی کا حق ادا کرنا ہوتا ہے دوسری طرف تغزل کے جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے ۔ ان دونوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا مشکل ہے ۔ اور اس مشکل پر قابو نہ پا سکنے کی وجہ سے اکثر شعراء "صورت گری" جمالیاتی رچاؤ کے ساتھ نہیں کر سکے ۔

اردو شاعروں نے کشفی اور باطنی تجربوں کو غزل میں سم سمویا ہے ۔ شاید وہ تصوف کی عملی اور کشفی سمت و جہت سے ناآشنائی کے سبب ایسا نہیں کر سکے ۔لیکن اردو کے تین شاعروں کے بارے میں کسی قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوفی بھی تھے اور شاعر بھی ، وہ ہیں مرزا مظہر جانِ جاناں ۔ خواجہ میر دردؔ ، اور آسیؔ غازی پوری ۔ مظہر جانِ جاناں کا اردو کلام کم یاب ہے ۔ چند شعر تذکروں میں ملتے ہیں ۔ ان میں رنگِ مجاز بہت گہرا اور رنگِ حقیقت بہت ہلکا ہے ۔اس لئے ان کے قلیل اردو اشعار میں باطنی تجربوں کا عکس تلاش کرنا بے سود ہے ۔ خواجہ میر دردؔ کے یہاں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے ۔اور کہیں کہیں صوفیانہ پُراسراریت جمالیاتی کیفیت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے ۔ یہ پراسراریت ان کے کلام میں مخصوص ذاتی اشاریت ، داخلیت اور ابہام کے روپ میں جلوہ گر ہے ۔لیکن خواجہ میر دردؔ کے یہاں بھی ایسے اشعار کی تعداد کم ہے ۔ آسیؔ غازی پوری نے غزل کے بنیادی اسلوب اور فطری زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا ۔ اس لئے کلاسیکل دلکشی ، مانوس ماحول اور دلکش اندازِ بیان کی وجہ سے باطنی تجربات کی آنچ مدھم ہوگئی مگر محسوس ضرور ہوتی ہے ۔عشق کی آشفتگی اور حسن کی نغمگی ان کی غزلوں کی جان ہے ۔ اور جمالیاتی رچاؤ کی ضامن بھی ۔اس لئے آسیؔ کی بیشتر شاعری من موہنی ہے ۔ رہے غالبؔ تو وہ ایک حدِ خاص سے آگے نہ جا سکے ۔کالے شاہ صاحب کی بیعت و ارادت نے صوفی بنانا چاہا مگر ان کی تعیش پسندی ، فکری بے راہ روی اور انانیت نے بادہ خوار ہی رکھا ۔ اس لئے ان کے اشعار باطنی تجربات کی کسک اور مخصوص صوفیانہ ذاتی اشاریت سے محروم ہیں ۔ آتشؔ و امیرؔ بھی سامنے کی باتوں سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے ، ولیؔ و میرؔ بھی اس مقام پر تہی مایہ نظر آتے ہیں ۔ دوسرے شعراء کو تو تصوف کے عملی و کشفی

پہلو سے کوئی سروکار ہی نہ تھا اس لئے ان کے نام نہاد صوفیانہ اشعار میں گھلاوٹ، داخلیت اور مخصوص ذاتی اشاریت کی تلاش بے کار ہے۔

فانی، اصغر اور اقبال نے کسی حد تک فکر وفن کو شیر وشکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ فانی و اصغر کے فکری تضاد سے قطع نظر انھوں نے فلسفہ و تصوف کے جس مسئلے کو شعر میں سمویا اس کو غزل کے اساسی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ فلسفیانہ موشگافیوں کے اظہار اور صوفیانہ عقاید کی تبلیغ سے زیادہ شعریت اور معنویت پر توجہ کی۔ اس لئے ان کی شاعری میں فکر وفن کے خوبصورت نمونے مل جاتے ہیں۔ اقبال بظاہر تصوف سے بیزار ہیں مگر بباطن تصوف دوست ہیں۔ کیونکہ اسلامی تصوف کی روشنی میں انھوں نے اپنی شاعری مسکینی اخلاق، قنوطی رجحانات اور منفی کیفیات کو دور کر کے مثبت حقائق اور ارتقا پذیر عناصر کا آئینہ دار بنایا۔ فکری و علمی نیرنگی کو فلسفیانہ یک رنگی عطا کی۔ اقبال کا فلسفۂ خودی تصوف سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اسی کی ترشی ترشائی شکل ہے۔ اقبال کی ذہانت اور آذری نے اس کو جمالیاتی کیف و کم عطا کر دیا ہے۔

اس طرح اردو کی بیشتر صوفیانہ شاعری فکری تضاد، علمی تہی مائگی، باطنی تجربات سے محرومی مخصوص ذاتی اشاریت کے فقدان، روایت پرستی، عوامی پسندیدگی اور لفظی بازی گری کا شکار ہو کر جمالیاتی رچاؤ سے محروم ہو گئی۔ اگر فانی و اصغر فکر وفن کو شیر وشکر نہ کرتے۔ درد او ر آسی باطنی تجربات کا سوز و گداز اور کسی قدر مخصوص ذاتی اشاریت عطا نہ کرتے، اور اقبال اس کو فکری ہم آہنگی و یک رنگی نہ دیتے تو اردو کی صوفیانہ شاعری کی آبرو خطرے میں پڑ جاتی پھر بھی اچھی اور سچی صوفیانہ شاعری کی کمی عبرتناک حد تک محسوس ہوتی ہے۔

کوائف جامعہ

فن تعمیر

دلی میں اور ہندوستان کے بعض دوسرے شہروں اور علاقوں میں قدیم عمارتوں کے بہترین نمونے ملتے ہیں، ان کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں، مگر عام طور پر صرف ظاہری شکل وصورت دیکھتے ہیں، فن کی گہرائیوں میں جانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب ہر سال ایم اے کے طالب علموں کو دلی اور دلی کے باہر کی عمارتوں کو دکھانے کے لئے لے جاتے ہیں اور ان عمارتوں کی تاریخی حیثیت کے علاوہ، ان کی تعمیر کی فنی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ امسال مدرسۂ ثانوی کی انجمن اساتذہ کے سکریٹری کی خواہش پر موصوف نے فن تعمیر پر ایک تقریر کی، جس میں جامعہ کے مختلف اداروں کے استادوں اور کارکنوں نے شرکت کی، کچھ عرصہ ہوا پروفیسر محمد مجیب صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں "قطب کی عمارتوں کا مجموعہ" کے عنوان سے انگریزی میں ایک توسیعی لکچر دیا تھا، اس کا ترجمہ بھی اب شائع ہو گیا ہے۔ اس مضمون اور تقریر دونوں کی مدد سے ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ موصوف کے خیالات پیش کرتے ہیں:

فنی تعمیر کے کسی نمونے کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ اس طرح لیا جاتا ہے کہ ہم سوچیں کہ معمار کے ذہن میں کیا تھا، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس نے عمارت کے مصرف یا مقصد کو سامنے رکھ کر مسالے اور فنی ترکیبوں سے کس طرح کام لیا ہے۔ معمار کے خیالات کا سراغ لگانے کی کوشش میں وہی تمام مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں، جس کا حل معمار کو نکالنا تھا اور ہم گویا خود نقشہ بنانے، وسائل فراہم کرنے اور عمارت کو بنا کر کھڑا کر دینے کے منصوبے میں شریک ہو جاتے ہیں، ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوتی اگر ہم شروع ہی سے محسوس کرتے ہیں کہ معمار کے دل میں کوئی بڑا حوصلہ نہیں تھا، وہ نقل کرتا

یا رواج کی پابندی کرنا کافی سمجھتا تھا۔ اس نے تعمیر کے وہی اصول برتے جو عام طور پر برتے جاتے تھے، وہی مسالہ استعمال کیا جو آسانی سے مل جاتا تھا اور اسے صرف ویسی ہی قدر شناسی کی توقع تھی جو بے ذوق کام کرنے والوں سے بے ذوق کام کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پر وجد کی وہی کیفیت طاری ہو جائے جو معمار پر طاری تھی۔ جب سوچتے سوچتے عمارت کے مقصد اور اس کے نقشے میں کامل ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک حسین صورت اس کی سمجھ میں آئی اور ہم محسوس کریں کہ عمارت کا نقشہ، تعمیر کی ترکیبیں، عمارت کا مسالا اور بنی ہوئی عمارت کے اجزا کا تناسب سب سمٹ کر تخلیقی کیف کا ایک لمحہ بن جاتے ہیں۔ یہی احساس ہمیں یقین دلاتا ہے کہ فن تعمیر کا حسن وہی حسن ہے جو شاعری، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی میں نظر آتا ہے اور آرٹسٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ ان پردوں کو ہٹا کر جو ہماری آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں، فنون لطیفہ کی بنیادی وحدت کو آشکارا کرے۔

پروفیسر مجیب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ تعمیر کو تمام فنون کی ماں کہا گیا ہے، کیونکہ تعمیر کے ذریعہ دوسرے فنون کو ترقی کا موقع ملا۔ مصر، یونان اور ہندوستان کے قدیم مندروں میں مورت سازی، سنگ تراشی اور تعمیر ایک واحد فن تھے، مصوری، ڈرامے، رقص اور موسیقی کی ابتدا تعمیر سے ہوئی ہے، یہاں تک کہ باغبانی کا آغاز بھی تعمیر کا مرہون منت ہے۔ ایک مغربی مدبر کا خیال ہے کہ جب سے باغبانی اور مکان کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا ہے، دونوں میں کمی آگئی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعمیر کے تین پہلو ہوتے ہیں (۱) مصرف (۲) فنی پہلو (۳) جمالیاتی پہلو ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک لاطینی کا پرانا مقولہ ہے کہ تعمیر نام ہے مضبوطی، حسن اور مصرف کا۔

تعمیر کی طرف خوف اور خطرے کی وجہ سے توجہ کی گئی، انسان کو سب سے بڑی فکر اپنے وجود کو سلامت رکھنے کی تھی، اس کے علاوہ ان دیکھی قوتوں کو، جن سے انسان اپنی ابتدائی زندگی میں بہت ڈرتا تھا، رام رکھنے کے لئے مکان بنانے کی فکر ہوئی، اس لیے اس نے اپنے رہنے کے لئے اور دیوتاؤں کے لئے گھر بنائے۔ بعض محاورے اس احساس اور خیال کی طرف اشارہ کرتے ہیں، مثلاً

دعائیں پڑھنا، صدقات دینا وغیرہ۔ قدیم زمانے میں حاکم نیم دیوتا سمجھے جاتے تھے، ان کے مرنے کے بعد لوگ ان سے ڈرتے تھے، اس لیے ان کی لاشوں کو بڑے بڑے اور شاندار مکان بنا کر رکھتے تھے غالباً مصر کے اہرام کی تعمیر کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے فن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مجیب صاحب نے اپنے توسیعی لکچر میں لکھا ہے کہ "عمارتوں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تقسیم کرنے میں ہم فن تعمیر کی تاریخ کی بعض بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ستون اور شہتیر یا بکاسے کی چنائی سے در اور دریچہ بنانے کا طرز ہندوؤں کی ایجاد یا ہندوستان کا مخصوص طرز نہیں ہے بلکہ یہ اس زمانے سے چلا آیا ہے جبکہ ہندوستان میں پتھر کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ محراب اور گنبد بنانے کا طریقہ اسلام سے پہلے روم اور بازنطین میں رائج ہو گیا تھا، مگر ہم ایک طرز کو ہندوؤں اور محراب اور گنبد کو مسلمانوں سے منسوب کرتے ہیں۔" اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے کہ "میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فن تعمیر میں کوئی فرق نہیں ہے یا اس فرق کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مندر اور مسجد عبادت کے دو مختلف تصوروں کو پیش کرتے ہیں، اس لئے ان کا نقشہ ایک سا نہیں ہو سکتا، لیکن اگر ہم پہلے عمارت کے مصرف پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ معمار کے ذہن میں کیا کچھ تھا، تو ہم عمارت کے حسن کا اندازہ کر سکیں گے اور ہمارا خیال فروعی اور غیر متعلق باتوں کی طرف نہیں جائے گا۔"

ہندوستان کے فن تعمیر کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مجیب صاحب نے لکھا ہے۔ "ہندوستان کے فن تعمیر پر غور کرتے وقت ہمیں جس بات کا خیال رکھنا چاہیے، وہ تعمیر اور سنگ تراشی کا فرق ہے۔ تعمیر میں اینٹوں اور پتھروں کو جوڑ کر ایک شکل بنائی جاتی ہے۔ سنگ تراشی میں پتھر کو توڑ کر ایک شکل نکالی جاتی ہے۔ تعمیر کا دار و مدار ریاضی پر ہے، سنگ تراشی کا قدرت کی صنعت گری پر۔ ایک بہت چھوٹی سی عمارت فنِ تعمیر کا نمونہ ہو سکتی ہے اور ایک بہت بڑی عمارت بلکہ عمارتوں کا مجموعہ بھی سنگ تراشی کا نمونہ ہو سکتا ہے۔ صرف ایلورا کے کیلاش مندر ہی کو نہیں، جو کہ

واقع ایک چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا، بلکہ اور بہت سے مندروں کو دانستہ ایسی شکل دی گئی ہے جس سے خیال ہو کہ وہ پتھر کاٹ کر نکالی گئی ہے ۔۔۔ لیکن فن تعمیر اور سنگ تراشی کے اصولوں میں کوئی لازمی تضاد بھی نہیں ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں سنگ تراشی کے اصول حاوی نظر آتے ہیں، مگر وہاں سرکیج کی جامع مسجد جیسی عمارت بھی ہے، جس میں سنگ تراشی کے میلانات کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ ہم کہہ سکتے کہ ایک خاص زمانے تک ہندوستان کا فن تعمیر سنگ تراشی کے جمالیاتی اصولوں کا پابند رہا۔ مسلمانوں نے مورت سازی کی سرپرستی نہیں کی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ سنگ تراشوں نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے فن تعمیر کے جمالیاتی اصولوں کو رفتہ رفتہ قبول کیا۔ اس لئے مذہب کی بنا پر عمارتوں کی تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے، ہر عمارت کی خصوصیات پر غور کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کے نقشے، اس کی تعمیر اور سجاوٹ میں کس حد تک فن تعمیر کی ریاضیات کو برتا گیا ہے اور کس حد تک سنگ تراشی کے جمالیاتی اصولوں کو۔"

مالک رام صاحب کی تقریر اور شعر و شاعری

انجمن اساتذہ جامعہ کے اہتمام میں ۲۱راگست کو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی صدارت میں ایک علمی و ادبی جلسہ منعقد ہوا، جس میں اردو کے مشہور محقق اور ممتاز ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب نے ایک دلچسپ اور پر مغز تقریر کی اور جامعہ کے چند شعراء نے اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔

جون کے تیسرے ہفتہ میں کابل میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان کی طرف سے جناب مالک رام صاحب اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے شرکت کی تھی، انجمن اساتذہ کے ناظم عبد اللطیف اعظمی کی درخواست پر جناب مالک رام صاحب نے سیمینار کی غرض و غایت اور اس کے مباحث اور فیصلوں پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے فرمایا کہ مشرق کی دوسری زبانوں کی طرح کابل میں بھی فارسی میں مغربی علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ اردو کی طرح فارسی

جیسا کہ اصطلاحوں کے ترجمے کا مسئلہ ہے۔ اسی مسئلے پر غور کرنے کے لئے یہ سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں کابل کے علاوہ ایران، پاکستان اور ہندوستان کے نمایندے شریک ہوئے تھے، موصوف نے بتلایا کہ ہندوستان کی طرح کابل میں بھی لسانی کشمکش یا لسانی نزاع موجود ہے، انھوں نے فرمایا کہ فارسی کو افغانستان کے لوگ دری کہتے ہیں، قدیم زمانے میں فارسی کو دری کہتے تھے، ممکن ہے احیاپرستی کی وجہ سے وہ لوگ دری کہتے ہوں، یا ممکن ہے ایران سے رقابت کی وجہ سے کہتے ہوں۔ بہرحال دری کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور یہ وہاں کے اونچے طبقے کی زبان ہے اور پشتو وہاں کا عوامی زبان ہے، جس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ستر فیصدی ہے، اگرچہ دونوں زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہے، لیکن دونوں میں کشمکش موجود ہے، جس کا اظہار اس سیمینار میں بھی ہوا۔ افغانستان کے وفد کے بعض اراکین نے شکایت کی، جن میں وہاں کے مشہور شاعر جناب سرور خاں گویا بھی شریک تھے کہ سیمینار کی تمام تر کاروائیاں دری میں ہو رہی ہیں اور پشتو کو یکسر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔

سیمینار کے مباحث اور فیصلوں کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے فرمایا کہ اصطلاحات کے بارے میں عام رجحان یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے انگریزی یا فرانسیسی کی اصطلاحیں جوں کی توں لے لی جائیں، اب تک عام طور پر جو اصطلاحات رائج ہیں ان کے بارے میں طے پایا کہ انھیں فن وار یا موضوع وار کتابی صورت میں شائع کر کے سیمینار میں شریک ہونے والے ملکوں کو بھیجدی جائیں اور ان کی رائے معلوم کی جائے، نیز یہ طے پایا ہے کہ کابل میں ایک مرکزی دفتر قائم کیا جائے جو سیمینار کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنائے گا اور ممبر ملکوں سے رابطہ قائم رکھے گا۔

افغانستان کی عام زندگی اور رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقرر نے فرمایا کہ لباس اور طرز زندگی میں مغربی تہذیب و تمدن کی حکمرانی ہے۔ انھوں نے فرمایا یہ صورت حال دیکھکر مجھے آج سے چالیس سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ غریب امان اللہ خاں کو صرف اس لئے تخت سے ہٹا دیا گیا کہ ملکہ ثریا کا لباس افغانستان کے مذہبی طبقہ کی نظر میں مناسب نہیں تھا، انھوں نے سوال کیا جواب

کے سلسلہ میں فرمایا کہ ہندوستان کی دو شخصیتیں افغانستان میں بہت ہر دلعزیز ہیں، ایک فارسی کے مشہور شاعر بیدل، دوسرے حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ بابر کے مقبرے کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ بابر کا انتقال اگرچہ آگرہ میں ہوا تھا، مگر ان کی تیسری بیوی نے مرحوم کی وصیت کے مطابق کابل لے جاکر دفن کیا۔ مقبرے کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس کی اس طرح دیکھ ریکھ نہیں ہو رہی ہے، جس طرح ایک شہنشاہ کے مزار کی ہونی چاہیے۔ شاید افغانی حکومت کا رویہ ایسا ہے، جیسا ایک غیر شخص کے مزار کے ساتھ ہوتا ہے۔

جناب ملک رام صاحب کی تقریر کے بعد شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا۔ جامعہ کے ایک قدیم طالب علم اور شفیق میموریل اسکول کے استاد جناب اقبال خاں جامعی صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جو بہت پسند کی گئی، چند منتخب شعر آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہیں:۔

یہ برگِ خشک جو حسنِ بہار کی ہے زکاۃ
نہ ہو گدائے گل ولالہ کی امید سے کم

کہیں نہ لے کے چلے جائیں میکدے میں اسے
رواں کدھر کو ہیں زاہد کے بہکے بہکے قدم

ہجومِ حسرت وغم، یاس، دردِ محرومی
انھیں سے ہم نے بنائے ہیں آرزو کے صنم

مقطع قطعہ بن ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

وہی فریب جسے لوگ عشق کہتے ہیں
اسی کے دم سے ہے شیرازۂ حیاتِ بہم

اسی فریب کی اقبالؔ کو تلاش رہی
زمن مپرس خدایا چہ کردہ ام چہ کنم

اس کے بعد مدرسہ ثانوی کے ہندی کے استاد جناب جے پال سنگھ ترنگ صاحب نے اپنے

گیت نے عجیب سماں پیدا کر دیا۔ گیت طویل ہے، صرف دو بند ملاحظہ ہوں:

آنکھوں میں ساون ہے، ہونٹوں پہ تالے ہیں
گیتوں کو گاتا ہوں من کے سمجھانے کو
پیڑا جب مستی میں کوئل سی روتی ہے
دنیا آجاتی ہے طبیعت بہلانے کو

من میں جب آہوں کا دھواں سا گھٹتا ہے
چنگاری اٹھتی ہے چاہیں جل جاتی ہیں
ارتھی ارمانوں کی جیون کے کندھے پر
مرگھٹ سے پہلے ہی زندہ جل جاتی ہیں
ابھی لاشا پنچھی جو بیٹھا پر کھینچ ہو
پنجرے سے جھانکے گر نبھ میں منڈرانے کو
دنیا آجاتی ہے طبیعت بہلانے کو

اس کے بعد مدرسہ ثانوی کے استاد جناب سیفی پریمی صاحب نے غزل پڑھ کر سنائی، ملاحظہ ہو:۔

تم ہو تو زمانہ بھی انوار میں ڈھلتا ہے
اب چاند ابھرتا ہے سورج بھی نکلتا ہے
خواہش سے کہیں کوئی ماحول بدلتا ہے
دل شمع کا جلتا ہے تب موم پگھلتا ہے
اک شہر جراحت ہے اس دل کو نہ دل کہئے
ہر زخم سے غم دیدہ افسانہ نکلتا ہے

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۴	بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

سعید انصاری

مولانا ابوالکلام آزاد

تعلیم اور انسان دوستی کی روشنی میں

انسان دوستی سے کیا مراد ہے؟

انسان دوستی اصل میں فلسفۂ تعلیم میں وہ تصور ہے، جو انسان اور انسانیت کو تعلیم کا مرکز بناتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں تعلیم کے مختلف مقاصد رہے ہیں۔ کبھی تعلیم علم و معرفت کے لئے حاصل کی جاتی تھی، تو کبھی یہ حصولِ معاش کا ذریعہ سمجھی گئی ہے۔ کبھی یہ محض قوائے ذہنی کی تربیت کے لئے دی جاتی تھی تو کبھی اس کا مقصد سیرت کی تشکیل و تعمیر رہی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں مذہب زندگی کے ہر شعبہ پر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ تعلیم پر بھی اس کا گہرا نقش تھا، اس کی بنا پر تعلیم محض اخروی زندگی کی فلاح کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی تھی، اور اس کے نصاب میں سوائے چند دینی علوم کے اور کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کے نزدیک دنیوی زندگی اور اس زندگی کے معاملات کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ انسان اور انسان کی دنیوی زندگی کو ایک گونہ پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے انسانی زندگی کا صحیح نمونہ اور تعلیم کا مقصد قدیم یونان اور پھر بعد میں رومہ کے زبان و ادب کے مطالعہ کو قرار دیا تھا، اس لئے کہ ان میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جو

---

[1] یہ مقالہ مولانا آزاد کی گزشتہ برسی کے موقع پر لکھا گیا تھا۔

اس دنیا میں انسان سے تعلق رکھتی ہیں۔ یونانیوں کے ہاں ہمیں اس دنیا سے گزر کر دوسرے عالم سے متعلق خیالات اور افکار بھی ملتے ہیں، لیکن ان کا تعلق اِس دنیا سے کچھ بہت دُور نہیں ہوتا تھا، اس لئے ان کے ہاں علوم طبیعی میں مابعد الطبیعیات اور انسان دونوں چولی دامن کی طرح ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے فلسفہ اور حکمت میں مابعد الطبیعی اور طبیعی مسائل دونوں ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ یونانیوں کی انسان دوستی کے تصور میں فلسفہ اور علوم طبیعی دونوں شامل ہیں اور ان کے ہاں ہر علم کا محور انسان ہے اور بقول سقراط "انسان ہی تمام چیزوں کا پیمانہ ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ یونانیوں کا سارا ادب جس میں ان کی شاعری، ان کے قصص و اساطیر ان کے ڈرامے سب ہی شامل ہیں، ہر قوم اور ہر نسل کے لئے جاذبیت اور کشش کا باعث ہوتا ہے اور ہر زمانہ میں اُس سے انسانی زندگی کو روشنی ملتی رہی ہے وہ علوم اور عرفان کا ایک ایسا سرچشمہ ہے، جس سے ہر شخص اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق سرشار ہو سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ صرف یونانی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم ہی سب سے بڑا مقصد بن گئی اور ان زبانوں کے ادب اور ان کی روح تک رسائی نہ ہو سکی۔ اور عام زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔

یورپ میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ باوجود ایک مذہب ہونے کے وہاں ایک مذہب کے دو فرقوں میں عرصے تک سخت جنگ اور خوں ریزی رہی اور بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدارس سے مذہبی تعلیم خارج کر دی گئی اور وہاں سیکولر تعلیم یعنی غیر مذہبی تعلیم کا رواج ہوا۔ اسکولوں سے خواہ مذہبی تعلیم نکال دی گئی ہو لیکن بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام وہاں کلیساؤں کے ذمہ رہا اور وہ اس کمی کو برابر پورا کرتے رہے۔ ہم نے مغرب کی تقلید میں جہاں اور بہت کچھ قبول کیا وہاں انگریزی تعلیم کے ساتھ یہ سیکولر تعلیم کا تصور بھی لیا اور مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے مدارس دینی تعلیم سے یکسر خالی ہو گئے اور اگر کوئی مذہبی تعلیم دے بھی تو وہ سرکاری امداد کا مستحق نہ ہوگا۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں جتنے مذاہب ہیں، ان میں کلیسا جیسی کوئی تنظیم نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچے یا تو مذہبی تعلیم سے یکسر بیگانہ رہیں یا پھر ہمارے مدارس سرکاری امداد سے محروم ہوں۔ انگریزوں کے زمانہ حکومت تک تو یہ چیز جیسے تیسے چلتی رہی، لیکن آزادی ملنے اور قومی حکومت

قائم ہونے کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ ہمارے مدارس میں دینی تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہیئے، ورنہ ہمارے بچوں کی مکمل نشوونما بے دینی کی فضا میں صحیح نہ ہو سکے گی۔

مولانا آزاد کی وسیع معنوں میں مذہبی تعلیم کی حمایت :

مولانا آزاد نے بحیثیت وزیر تعلیم زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کے جب پہلے جلسے میں جو قومی آزادی کے بعد ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا تھا اس مسئلہ کو بڑی شدومد کے ساتھ پیش کیا۔ پچھلی دو عالمی جنگوں کے بعد یورپ کی لبرل تعلیم کے خلاف جو مذہبی تعلیم سے عاری تھی، ایک اختلاف کی رو اٹھی، مولانا اس رو کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"ظاہر ہے کہ لاکھوں آدمی ہندوستان میں اس کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ اُن کے بچوں کی تربیت غیر مذہبی فضا میں ہو اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس سے متفق ہوں گے۔ بالفرض اگر حکومت خالص سیکولر تعلیم دینے لگے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ لازماً لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام نجی ذرائع سے کریں گے۔ یہ نجی ذرائع آج کس طرح کام کر رہے ہیں، یا آگے کریں گے، آپ بخوبی جانتے ہیں۔ میں اس سے کسی قدر واقف ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف گاؤں میں شہروں میں بھی یہ دینی تعلیم ایسے استادوں کے سپرد کی جاتی ہے جو اگرچہ لکھے پڑھے تو ہوتے ہیں لیکن تعلیم یافتہ نہیں ہوتے ہیں، ان کے نزدیک مذہب کے معنی سوائے تعصب اور تنگ نظری کے اور کچھ نہیں ہیں۔ تعلیم کا طریقہ بھی ایسا ہوتا ہے جس میں وسعتِ نظر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اب اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو خیالات بچوں کے دلوں میں اس ابتدائی عمر میں داخل کر دیے جائیں گے، وہ بعد کی تعلیم میں جو خواہ کتنی ہی جدید کیوں نہ ہو، ان کے ذہنوں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اگر ہمیں اپنے ملک کی ذہنی زندگی کو اس خطرے سے بچانا ہے، تو یہ ہمارے لئے نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ ابتدائی دینی تعلیم کو نجی ہاتھوں میں نہ چھوڑیں۔ ہمیں اپنے براہ راست ہاتھوں اور نگرانی میں لینا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک غیر ملکی حکومت مذہبی تعلیم سے اپنا دامن بچائے رکھ سکتی

تھی لیکن ایک قومی حکومت اس ذمہ داری سے بری نہیں ہوسکتی۔ قوم کے بڑھتے ہوئے دماغوں کو صحیح راہ پر رکھنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔ ہم بغیر مذہب کے دماغوں کی تشکیل نہیں کرسکتے ہیں۔"

اعلیٰ تعلیم کی حمایت اور فلسفہ و تاریخ کی تعلیم پر زور:

مولانا آزاد کی انسان دوستی کا اندازہ اصل میں یونیورسٹی کی تعلیم میں سب سے زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وقتی اور ملکی ضرورتوں کا خیال کر کے اس نئی قومی حکومت کا وزیر تعلیم ابتدائی تعلیم کی توسیع پر زیادہ زور دیتا، جو دستور ہند کی بڑی شرطوں میں سے ایک نہایت اہم اور ضروری شرط تھی یا قومی ضرورت کے پیش نظر ایک بڑے پیمانہ پر بالغوں کی تعلیم کا انتظام، اس لئے کہ جمہوریت کی بقا اور قیام کے لئے یہی دونوں سب سے بڑی ضامن ہیں، لیکن آزادی ملنے کے بعد جمہوریہ ہند کا پہلا وزیر تعلیم جنوری ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے اپنے افتتاحیہ میں "قومی تعلیم کی ایک اسکیم" کا خاکہ پیش کرتا ہے تو اس میں یونیورسٹی کی تعلیم اور اس میں اصلاح کا مسئلہ نہایت شدومد کے ساتھ پیش کرتا ہے، حالانکہ قومی تحریک کے سالار قافلہ مہاتما گاندھی نے یونیورسٹی تعلیم کی اہمیت کو بہت گھٹا دیا تھا۔ لیکن مولانا آزاد نے نہ صرف اس کے قیام و ترقی کی پالیسی کو علی حالہٖ قائم رکھا بلکہ ان کے علمی دامن کی وسعت اور ان کی از سر نو تنظیم میں جس فراخی قلب و نظر کا ثبوت دیا ہے، وہ ان کی انسان دوستی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ وہ اس جلسہ میں مندوبین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دوسرا مسئلہ جو میں آپ لوگوں کے غور و فکر کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یونیورسٹی کی تعلیم میں اصلاح کا مسئلہ ہے، جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ علم کے میدان میں تنگ قومیت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کسی قوم کی گزشتہ تاریخ و تہذیب میں کوئی تنگ نظری سے کام نہیں لیا گیا ہے اور نہ کبھی ہماری قومی سیرت اور تہذیب میں اعلیٰ خیالات کی حوصلہ افزائی میں کمی کی گئی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں ایسا ہوا ہے اور میں آپ کی توجہ دو چیزوں کی طرف خاص طور سے مبذول کراؤں گا: ایک فلسفہ اور دوسری تاریخ۔"

اب اس کے بعد فلسفہ میں جس تنگی نظر سے کام لیا گیا ہے، مولانا اس کا تذکرہ ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

"یورپ میں یونانی فلسفہ کا دوبارہ احیاء عربوں کی بدولت ہوا جو قرون وسطیٰ میں اس کے سب سے بڑے مفسر اور نقاد تھے۔ نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زمانہ میں یونانی اور لاطینی زبانوں سے براہ راست ترجمے ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں فلسفہ کی عام تاریخ بھی یونانیوں سے شروع ہوتی ہے اور جدید یورپی فلسفہ پر آکر ختم ہو جاتی ہے اور ہندوستانی اور چینی فلسفہ کا دامن چھوکر نکل جاتی ہے۔ یہ ہے تاریخ فلسفہ جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اب تک پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن آپ تسلیم کریں گے کہ دنیا میں فلسفیانہ خیالات و افکار کے نشوونما کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے۔ آج کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دائرہ میں ہندوستانی ذہن نے کتنے بڑے کارنامے کئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی حال میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی فلسفہ ایک مضمون کی حیثیت سے شروع ہوا ہے لیکن دنیا کی تاریخ فلسفہ میں اس کا جو مقام ہونا چاہئے، وہ ابھی اسے حاصل نہیں ہوا ہے۔"

اور آگے چل کر مولانا ہند کی فلسفہ میں فہم و بصیرت کا جو اظہار فرماتے ہیں، وہ نہ صرف ان کی فراخ نظر، وسعت قلب اور انسان دوستی پر دلالت کرتی ہے، بلکہ ان کے بے پایاں علم و فضل کا بھی ایک بڑا ثبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یونانی فلسفہ میں ایک مکتب خیال فیثاغورث کا ہے۔ ان کے ہندوستان میں آنے کی روایت خواہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن ان کے فلسفہ پر ہندوستان کے فکر و خیال کا جو گہرا اثر نظر آتا ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستانی ذہن ان حدود سے کہیں آگے پہنچ چکا تھا جہاں تک فیثاغورث کے فلسفہ نے ابھی قدم نہیں رکھا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو یونانی فلسفہ کی ہر شاخ کے مقابلہ میں آپ کو ہندوستانی مکتب خیال ملے گا، پھر مزید بر اں ہمیں جا بجا ... ایسی گہری بصیرت اور عمق فکر بھی ملتا ہے جس کا یونانی فلسفہ میں کہیں نام و نشان

بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ صرف دو علوم کے سوا ہندوستانی ذہن اور تمام علوم میں یونانیوں سے کہیں آگے پہنچا ہے اور وہ دو علوم منطق اور ہیئت ہیں۔ ارسطو کی منطق اپنی ساخت اور حدود میں ہندوستان کے نیائے سے کہیں آگے ہے۔ اسی طرح ہیئت میں بھی ٹولیمی کی Majestic (مجسطی) برہم گپتا کے "سدھانت" اور آریا بھٹ کی تصانیف سے کہیں بلند ہے لہٰذا ہمیں ایک نئی تاریخ فلسفہ کے مرتب کرنے کی ضرورت ہے، جس میں ہندوستان کے فلسفہ کو اس کا صحیح مقام دینا ہوگا۔"

اسی طرح مولانا نے ہندوستان کی تاریخ کی تعلیم و تصنیف میں بھی جو عیب و نقص ہے، اس کا پردہ بھی اسی وسعت قلب و نظر سے فاش کیا ہے اور اپنی انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ونسنٹ اسمتھ (تاریخ ہند کا ایک مشہور مصنف ہے) کے زمانہ تک انگریزی میں ہندوستان کی کوئی صحیح اور معقول تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ خود اسمتھ کی تاریخ بھی غلطیوں اور خامیوں سے خالی نہیں ہے۔ اور ہماری یونیورسٹیوں میں آج تاریخ کی جتنی کتابیں استعمال ہوتی ہیں، ان سب میں یہی عیب و نقص ہے ان میں یہ خامیاں بھی ہیں اور تحریف سے بھی کام لیا گیا ہے۔ آج اس سے زیادہ اور کوئی بڑا کام نہ ہوگا کہ ہم ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک از سر نو تاریخ کے مطالعہ اور تعلیم کا انتظام کریں۔ یہ وہ کام ہے جو ہماری یونیورسٹیوں کو فوراً ہاتھ میں لینا چاہیے۔ سب سے قابل عمل بات یہ ہوگی کہ یہ کتابیں سب سے پہلے انگریزی میں تیار کی جائیں جن کا بعد میں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو سکے گا اس سے نہ صرف محنت اور خرچ میں کفایت ہوگی بلکہ ایک گونہ یکسانیت اور وحدت بھی رہے گی، لہٰذا میں تمام ہندوستانی یونیورسٹیوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اس کام میں آگے بڑھیں اور میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ مرکزی وزارت تعلیم ان کی ہر ممکن امداد کرے گی۔"

مشرقی زبانوں کی تعلیم پر زور:

اسی طرح مولانا یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کی بھی بہت کمی محسوس فرماتے رہے اور

یہی کلاسکی زبانیں ہیں جو حقیقت میں انسان دوستی کی جان و روح ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تعلیم میں انسان دوستی کی تحریک اصل میں یورپ کی دو کلاسکی زبانوں یعنی یونانی اور لاطینی سے شروع ہوئی اس لئے کہ ان زبانوں اور ان کے ادب میں کبھی وہ روح تھی جو انسان کو تمام قیود اور پابندیوں سے آزادی بخشتی ہے اور اس کے مرتبہ کو بلند اور ارفع کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے بھی اس کمی کو ہندوستان کی تہذیب میں محسوس کیا اور اس کے لئے انھوں نے ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور جامعات کو ہندوستان کی کلاسکی زبانوں کی تعلیم کے لئے اپیل کی ہے وہ اپنے اس خطبہ میں لکھتے ہیں :-

"ایک اور اہم مسئلہ کی طرف میں اس کانفرنس کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ مشرقی زبانوں اور مشرقی ثقافت کی تعلیم ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب تک اس کا انتظام بہت ناقابل اطمینان رہا ہے......

"ہندوستانی یونیورسٹیوں میں جہاں مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی بھی رہی ہے وہ بہت سرسری انداز میں رہی ہے۔ اگر ہم ایک سنسکرت کو دیکھیں (اور یہ مولانا ۱۹۴۸ء میں فرما رہے ہیں) یا کسی کلاسیکی زبان کو لے لیں جس کی تعلیم یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے، تو ہم یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ یہ بہت بے دلی کے ساتھ ہو رہی ہے، باوجود اس کے کہ ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کو سمجھنے کے لئے ان زبانوں کو جاننا ناگزیر ہے۔ جو حال سنسکرت کا ہے، اس سے کچھ بہتر عربی اور فارسی کا نہیں ہے

"میں چاہتا ہوں کہ ان کے علاوہ بعض اور مشرقی زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے جیسے چینی یا تبتی زبانیں ہیں۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ بدھ مذہب کی بہت سی کتابیں اور اس کا ادب تبتی زبان میں ہے، اور ان کا اصل مسودہ جو سنسکرت زبان میں تھا، وہ ضائع ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر لوک شنکر گپتا کی "ترک بھاشا" لیجئے جس کا عرصہ تک اصل سنسکرت نسخہ ناپید تھا لیکن اس کا تبتی ترجمہ البتہ موجود تھا اور ابھی حال تک ہمارا ماخذ اور منبع تھا۔ ابھی حال میں اصل مسودہ ہاتھ آیا ہے اور وہ گائیکواڑ سلسلہ شرقیات" میں شائع ہوا ہے۔

"اسی طرح چینی سیاحوں کے لکھے ہوئے حالات بھی قدیم ہندوستان کی تاریخ کے لئے ایک بہت بڑا سرچشمہ ہیں۔ چینی زبان اور ادب میں اور بہت سا ذخیرہ بھی موجود ہے جو ہماری قدیم تاریخ اور تہذیب پر روشنی ڈال سکتا ہے، بشرطے کہ ہم ان سے استفادہ کرسکیں۔ ان وجوہ کی بناپر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ قدیم زمانہ میں ہندوستان ایشیا کے مختلف سرچشموں کا مرکز تھا، جہاں سے علم وتہذیب کے سوتے پھوٹ کر نکلے اور ایشیا کے مختلف گوشوں میں پھیلے، ہندوستان کی قدیم تہذیب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایشیا کی دوسری زبانوں کا بھی علم ہو۔"

آرٹ کا صحیح مفہوم اور اس کا مطالعہ:

قرون وسطیٰ کی انسان دوستی کی تحریک کی جہاں ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یونانی اور لاطینی زبان وادب کا مطالعہ اس زمانہ کے علماء کا خاص شغل تھا، وہاں اس زمانہ کے آرٹ اور دوسرے حسن وجمال کے مظاہر سے بھی انھیں خاص دلچسپی ہوتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جہاں معقولات اور منقولات کے اتنے بڑے عالم تھے، وہاں فنون لطیفہ، موسیقی، ڈراما اور ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنی ایک تقریر میں جو انھوں نے مارچ ۱۹۵۲ء میں "سوویت فنون لطیفہ کی نمائش" کا افتتاح کرتے وقت کی تھی، "آرٹ آرٹ کے لئے ہو یا آرٹ زندگی کے لئے" اس موضوع پر بڑی ناقدانہ بحث کی ہے اور اس میں تضاد دکھانے کی بجائے ایک امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان (دونوں نظریوں) کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان میں بظاہر جو تضاد نظر آرہا ہے وہ حقیقی سے زیادہ سطحی ہے۔ جب ایک فنکار کہتا ہے: "فن، فن کے لئے" تو حقیقت میں فن کو روح انسانی کا ایک مظہر سمجھ کر کہتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انفرادی پسند وناپسند اعلیٰ صفات کے تابع ہے۔ جو عالمگیر صفات ہیں۔ یہی اصول ایک جھوٹا عقیدہ بن کر رہ جاتا ہے، جب فنکار سماج اور اپنے ہم جنسوں کے تقاضوں کو نظر انداز کردیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی شخص ایک منٹ کے لئے بھی اسے گوارا نہیں کرسکتا ہے۔ ایک فنکار کتنے ہی
اعلیٰ صفات کا مالک کیوں نہ ہو، یہ صفات ایک سماجی انقلاب کا نتیجہ ہوتی ہیں اور سماج ہی
سے وہ قائم بھی رہ سکتی ہیں۔

دوسرا نظریہ، "فن زندگی کے لئے" اس حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ
صحیح فن فرد کی پسند و ناپسند سے بالاتر ہوتا ہے اور وہ ان جذبات کا ترجمان ہوتا ہے جو
عالمگیر ہوتی ہیں۔ یہ اس حقیقت کو بھی پورے طور پر ظاہر کرتا ہے کہ حقیقی فن اصل میں تعلیم کا
ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ جذبات میں لطافت اور علو پیدا کرتا ہے اور حسیات اور تخیل کی
تربیت کرتا ہے۔ اول الذکر نظریے کا بڑے سے بڑا حامی بھی اس کی گہری اور سماجی قدروں
سے ایک لمحہ کے لئے انکار نہیں کرے گا۔ جب "فن زندگی کے لئے" اس معنی میں سمجھ لیا جائے
کہ عوام کی ہر ہوا و ہوس کی تشفی کی جائے، تو پھر اس نظریہ کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی اور
یہ ایک غلط عقیدہ بن جاتا ہے۔"

اس سے زیادہ اور کون جدید یا قدیم فن کا عالم ہوگا، جو دونوں میں اس سے بہتر محاکمہ کرسکے
اور پھر ایک درمیانی راستہ نکال سکے۔

اور پھر آخر میں ان خیالات کا اظہار فرماتے ہیں جو مولانا کی انسان دوستی پر دلالت کرتے ہیں:۔
سیاسی اعتبار سے ممکن ہے دنیا دو کیمپوں میں تقسیم ہو۔ مادی مفاد کی سطح پر ممکن ہے نظریوں کا
تصادم ہو، لیکن روحانی دنیا میں، فن کی تخلیق میں، فلسفہ، ادب اور دوسری قدروں میں
انسان ایک ہے۔ ان صورتوں میں کسی فرد کی تخلیق پوری نسلِ انسانی کی ملک بن جاتی ہے۔ ہندوستان
اپنی قدیم فنی روایات کے ساتھ جو ماضی کی ناقابل یاد مدت تک پھیلی ہوئی ہیں، مجھے امید ہے کہ
یہ روسی فنکاروں کے لئے تحریک کا باعث ہوگا اور روس کے فنکاروں کی یہ نمائش ہمارے نوجوان
فنکاروں کے لئے ہمت افزائی کا موجب بنے گی۔"

وزارت تعلیم نے حصول آزادی کے بعد ہی ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے قدیم آرٹ کی ایک بہت

نمائش منعقد کی تھی جس میں تصویروں کے انتخاب کے لئے انگلستان سے تین نقادان فن کی ایک کمیٹی آئی تھی اور جس نے پہلے ملک کا دورہ کر کے بڑی مشکل سے .. تصویروں کا انتخاب کیا تھا۔ مولانا نے ان اشیاء کے جمالی پہلوؤں پر عالمانہ تبصرہ فرماتے ہوئے آخر میں آرٹ اور تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے:

"آرٹ جذبات کی تعلیم کا نام ہے اور اس لئے کسی صحیح قومی تعلیم کی اسکیم میں اسے ایک اہم جزو کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔ تعلیم خواہ ثانوی سطح پر ہو یا یونیورسٹی کی، اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی اگر وہ جمالی احساس کے لئے ہمارے قوا کی تربیت نہ کرے۔ مجھے اعتراف ہے کہ آرٹ کی تعلیم کو خواہ تفہیم تاریخ کے ایک سرچشمہ کی حیثیت سے ہو یا جمالیاتی مظاہر کی حیثیت سے، ہمارے ملک میں بہت بری طرح سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض وقت طلبا کو کلکتہ، جے پور، میسور اور حیدر آباد کے میوزیموں کی سیر کے لئے لے جایا جاتا ہے، لیکن یہ اتفاق اور کبھی کبھار ہوتا ہے اور آرٹ کی تعلیم ہماری تعلیم کا جزو نہیں بن سکی ہے۔ وزارت تعلیم نے بعض ایسی اسکیمیں مرتب کی ہیں جس سے آرٹ کو ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم میں سمویا جاسکے گا لیکن اس کے لئے ابھی کچھ وقت کی ضرورت ہوگی۔"

اسی طرح مولانا نے جہاں آرٹ اور تعلیم میں بے تعلقی کا اظہار کیا ہے، وہاں آرٹ کے زندگی سے بے تعلقی پر بھی نوحہ کیا ہے۔ اور پھر اسی طرح آرٹ اور کرافٹ میں فرق پر بھی ماتم کیا ہے۔ ان نقصانات کو خود انہی کی زبان سے سنئے:

"ایک معاشرہ صحت مند اور متوازن رہتا ہے اگر اس کے ارکان میں فنون کی تربیت اور اس سے لطف اندوزی کا انتظام ہو۔ آج کل کے معاشرے میں افراد کے اندر جو احساس درجہ افتراق و انشقاق نظر آتا ہے اور خود معاشرے میں جو سینکڑوں اختلافات دکھائی دیتے ہیں، اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہماری زندگی میں مختلف حیثیتوں سے آرٹ کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے ایک بڑا فرق جو آج کل کیا جاتا ہے وہ آرٹ اور کرافٹ کے درمیان ہے۔ قدیم زمانہ میں

۱۸۸

جیسے کاریگر جو ہمارے معاشرہ کے استعمال کے لیے سامان تیار کرتے تھے وہ آرٹسٹ بھی ہوتے تھے۔ اسی طرح آرٹسٹ بھی اپنی تخلیق پر اس حیثیت سے نازاں ہوتا تھا کہ وہ بھی معاشرے کا ایک مفید رکن ہے۔ لیکن یورپ کے صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے آج آرٹ اور کرافٹ میں فرق کیا جانے لگا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آرٹسٹ کاریگر کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کاریگر اور صناع بھی اپنے کو آرٹسٹ کے مقابلہ میں کم تر سمجھتا ہے جس سے دونوں کا نقصان ہے۔"

انسان اور انسانیت کا مفہوم:

مولانا ابوالکلام آزاد کو تعلیم اور انسان دوستی کی روشنی میں پیش کرنے کے بعد ایک نظر ڈالنا اس پر شاید ضروری ہے کہ مولانا کا تعلیم کے متعلق کیا نظریہ تھا اور جس کی قیادت بحیثیت وزیر تعلیم کے وہ استے عرصے تک فرماتے رہے۔ نیز ان کی نظر میں انسان کا کیا تصور تھا، جس انسان دوستی کی روشنی میں ہم انھیں اب تک دیکھتے رہے ہیں۔ مولانا نے ان دونوں تصورات کے متعلق اپنے خیالات کا بڑی وضاحت کے ساتھ ایک سمپوزیم کے افتتاحی خطبہ میں اظہار فرمایا ہے جو مشرق و مغرب میں انسان کے تصور اور اس کے فلسفہ تعلیم پر ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا۔

انسان کے متعلق اپنے اصل تصور کے اظہار سے پیشتر پہلے تو مولانا نے انسان کے ارتقار کی کہانی بڑے اختصار اور خوبی کے ساتھ بیان کی ہے اور اس میں بتایا ہے کہ وہ کس طرح ہزارہا سال کے اندر اپنی زندگی کی ابتدائی منازل طے کرتا اور فطرت کے موانع اور دشواریوں کو طے کرتا تہذیب کے دایرے میں قدم رکھتا ہے اور اس کشمکش حیات کی دوڑ میں وہ بہت سے فطرت کے راز کا پتہ لگا لیتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ مولانا نے یہ بھی سوال کیا ہے کہ آیا اس نے اس اقلیم مادیت کی فتوحات کے ساتھ اپنی اندرونی مملکت کے راز ہائے پنہاں کی بھی عقدہ کشائی کی ہے؟ جواب ملے گا ہرگز نہیں۔

ہزاروں برس سے بڑے بڑے علماء اور حکماء نے نفس انسانی کی اس حقیقت کی پردہ کشائی کی کوشش کی ہے، لیکن جواب ابھی تک تشفی بخش نہیں ملا ہے۔ برعکس اس کے مادیت کی دنیا میں اس نے بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں۔ زمین اور سمندر کی فتوحات تو اس نے کب کی کرلی تھیں، اب فضا اور آسمان کی پیمائش بھی شروع کر دی ہے اور بہت جلدی ہی وہ اس کرۂ ارضی کے علاوہ دوسرے سیاروں کا بھی مالک بن بیٹھے گا۔

لیکن خود انسان کیا ہے؟ اس کا دوسرے بنی نوع سے کیا تعلق ہونا چاہئے؟ قومی اور بین الاقوامی زندگی کی تشکیل کیوں کر ہو؟ جنگ اور امن کے مسئلے کیسے حل ہوں؟ یہ اور بہت سے اس قسم کے سوالات ہیں۔ جن کا جواب اس بنیادی سوال کے جواب پر منحصر ہے۔

مشرق و مغرب کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں بہ حیثیت مجموعی انسان کی اندرونی کیفیتوں پر زور دیا گیا ہے اور یہاں کے حکمائے حواس، ذہن اور عقل کی حدود سے گزر کر انسان کو ایک عمیق حقیقت مستطر میں گم کر دیا ہے۔ برعکس اس کے یونان کے حکماء نے خارج کی دنیا پر تمام تر زور دیا ہے اور اسی لئے ان کے تصور میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ انسان کتنا کیا ہے، نہ کہ وہ ہر کیا؟ اور ارسطو نے آکر انسان کو ایک 'حیوان معقول' قرار دے دیا، جس کے بعد سے معاملہ بالکل صاف ہو گیا اور یہی عقل مابین انسان اور دوسرے حیوانات کے مابہ الامتیاز قرار پائی۔

اسی طرح مشرق میں انسان کا تصور بالکل جدا رہا ہے۔ یہاں انسان کی اندرونی زندگی پر بہت زور دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں ویدانت کا فلسفہ اور عرب میں تصوف کی شکل [illegible]

مشرق و مغرب کے اس تفسلہ اور اختلاف میں [illegible] آئے آئی ہے اور وہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرتی ہے انسان کے [illegible] کا ایک طریقہ مثالی ہے یہ فرماتے ہیں:

آمیں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ، مشرق ومغرب کے انسان کا تصور ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے ۔ اگر ایک اس کے وجود کی اندرونی صفات پر زور دیتا ہے تو دوسرا اس پر کہ وہ اپنی سعی وکوشش سے کیا کر سکتا ہے ۔ اگر ایک اس کی فطرت کے روحانی پہلو پر زیادہ توجہ کرتا ہے تو دوسرا اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس روحانی صفات کے لئے مادی بنیاد بھی ہونی چاہئے ۔ باوجود اس اختلاف کے اگر ان دونوں تصورات میں امتزاج و ہم آہنگی ہو سکتی ہے ، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان دونوں علاقوں کے فلسفہ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کیوں نہ کی جائیں جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکیں ۔"

اب یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان دوست وزیر تعلیم بول رہا ہے جس کا فرض صرف اپنے نظام تعلیم میں کچھ سرسری انتظامی تبدیلیوں کے علاوہ مالی وسائل اور ذرائع کا فراہم کرنا ہی نہیں ہے ، بلکہ ان نئے حالات میں ایک نئے فلسفہ تعلیم کی تشکیل وتنظیم بھی کرنی ہے ۔ یہاں بھی مولانا نے پہلے مشرق ومغرب کے فلسفہ تعلیم کا تجزیہ کیا ہے اور پھر اس کے بعد حل پیش کیا ہے :

"مشرق ومغرب دونوں کے مروجہ نظام تعلیم میں بہت سی متناقض باتیں نظر آتی ہیں ۔ مشرق میں ہمیں انفرادی فلاح وبہبود پر بہت زیادہ زور دکھائی دیتا ہے ۔ انسان کے تحصیل علم کا مقصد صرف ذاتی فلاح ہے ۔ مشرق کے اس انفرادی فلاح پر زور کی وجہ سے سماجی بہبود اور ترقی کا خیال اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ برعکس اس کے مغرب میں سماجی ترقی پر بہت زور دیا گیا ہے ۔ بعض وقت تو یہاں تک کہ اس سے ایک ایسے سماج نے فروغ پایا ہے جس کے اندر فرد کی کوئی حیثیت نہیں سمجھی گئی ہے ۔ آج جب سائنس کی بدولت مشرق ومغرب ایک دوسرے سے اتنے قریب آ گئے ہیں تو اس امر کی ضرورت ہے کہ اس زور کو کسی قدر کم کیا جائے جو خواہ فرد کے حق میں ہو یا سماج کے ، اور ایک ایسے نظام تعلیم کی تشکیل کی جائے جو فرد اور جماعت دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرے اور جو انفرادی اور جماعتی دونوں زندگی کی قدروں کو ابھارے ۔"

علی جواد زیدی

بدلتا افغانستان

نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا خصوصی ہوائی جہاز "پشپک" پندرہ ہم سفروں کی مختصر سی جماعت اپنے دامن میں سمیٹے کل ساڑھے تین گھنٹوں میں دلی کے پالم ہوائی اڈے سے کابل کے خوبصورت ہوائی اڈے پر پہنچ گیا، تو یہی احساس ہوا کہ سائنس کی بدولت فاصلے کس طرح سمٹ گئے ہیں۔ اس سفر کو طے کرنے میں پہلے مہینوں لگ جاتے تھے اور کم ہوتے ہوتے بھی کئی دن لگ جایا کرتے تھے، تھکان، تکلیف، تشویش اس پر مستزاد تھی۔ اب ہوائی جہاز طائر خیال کی ہم سری کرنے لگا ہے !

یہ چھ دن کا سفر تھا جسے سیاسی اصطلاح میں "خیر سگالی سیاحت" کا نام دیا جائے گا، لیکن خود ذاکر صاحب نے اسے جائز طور پر "نئی دریافت کی سیاحت" سے تعبیر کیا ہے۔ کابل کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی ہماری نظر اُس افغانی اور ہندی مجمع پر پڑی جو "خوش آمدید" کہنے کے لئے دیر سے منتظر تھا۔ ہوائی اڈا تو نیا تھا ہی، لیکن وہاں کے نئے ابھرتے ہوئے طبقوں میں بھی ایک ایسا نیا پن تھا، جو پہلی نظر میں بول اٹھتا ہے۔ نوجوان افغانستان سرگرم عمل بھی ہے اور مایل بہ ترقی بھی۔ افغانستان جانے سے پہلے، اُس ملک کے بارے میں میرا تصور خاصا دقیانوسی تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہاں نوجوانوں کی ایک ایسی نسل ابھر رہی ہے جو جدید ترین خیالات کی حامل ہے، لیکن یہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ وہ ایک سوتا ہوا سا ایشیائی ملک ہوگا اور وہاں کے باشندے مزاج، اطوار اور خیالات میں ان افغانوں سے مختلف نہ ہوں گے، جنھیں ہم بچپن سے ہینگ، مشک اور مومیائی وغیرہ بیچتے اور سود کا کاروبار کرتے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اُن کی بلند قامتی، محنت کشی، عالی حوصلگی اور آزادی پسندی کا بھی

دلچسپ شہر تھا لیکن نئی ترقیوں کا خیال کرتے وقت شاہ امان اللہ، بچہ سقہ اور ملائے شور بازار وغیرہ کے واقعات ذہن میں گونجنے لگتے تھے۔ اس لئے میں کابل جاتے وقت یہ سوچتا جا رہا تھا کہ مجھے وہ افغانستان ملے گا جو دھیرے دھیرے بدل رہا ہوگا، لیکن مجموعی حیثیت سے ماضی سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگا۔ کابل پہنچ کر یہ تصور حیرت و مسرت میں بدل گیا۔

کابل تو بالکل ہی نیا شہر معلوم ہو رہا تھا۔ چوڑی چوڑی صاف و شفاف سڑکیں، جدید ترین کاریں اور بسیں، بلند و بالا عمارتیں، یورپی لباس پہنے ہوئے بڑے اور بوڑھے، سیاہ فراک، سیاہ لمبی جرابوں اور سیاہ جوتوں میں ملبوس پھول سی بچیاں، اسکول سے آتی جاتی ہوئی، جگمگ کرتی دوکانیں جن میں یورپ، جاپان، مشرقِ قریب، ہندوستان وغیرہ کے سامان بھرے ہیں اور لوگ جوق در جوق خرید رہے ہیں! یہ تو دنیا ہی نئی تھی۔ میرے تصور سے بالکل مختلف تھی۔

کابل کے ہوائی اڈے پر شاندار استقبال ہوا۔ افغانستان کے وزیر اعظم (جو صدر اعظم کہلاتے ہیں)، کابینہ کے اراکین، سفرا، عمائدین شہر، افغانستان میں مقیم ہندوستانی بھی موجود تھے۔ فوج کا دستہ دونوں ملکوں کے قومی ترانوں کی دھنیں بجا رہا تھا، اپنا قومی ترانہ تو خیر اپنا تھا ہی، لیکن افغانستان کے قومی ترانے کی دُھن بھی مانوس سی تھی۔ چند دنوں پہلے جب ڈاکٹر محمد یوسف سابق وزیر اعظم افغانستان، ہندوستان تشریف لائے تھے تو میں اُن کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ ان کے استقبال میں بھی افغانی ترانے کی دُھن ہندوستانی بینڈ پر سن چکا تھا۔ کابل کا ہوائی اڈہ روس نے بنایا ہے، خوبصورت، پائدار اور جدید ترین طرز کا ہے۔ ہوائی اڈے تو مشرق میں کہیں بھی پرانے نہیں ہیں، اس لئے اس کی جدت پر نظر نہیں رکی، لیکن اڈے کے باہر جب چمکتی ہوئی لیموزین کاروں کا قافلہ کشادہ سڑکوں پر سے گزرنے لگا تو سڑکوں کی صفائی اور چوڑائی دیکھ کر دل خوش ہوا۔ چوڑائی تو روپے خرچ کرکے مل جاتی ہے لیکن کابل جیسے پہاڑی علاقوں میں صفائی مزاج و طبیعت کی صفائی کے بغیر نہیں آتی۔

سڑکوں کے کنارے دو رویہ درخت ابھی چھوٹے ہی تھے۔ سفیدے، چنار، بِلّو اور جھنڈ چمکا کے نونہال۔ اِن کی کم سنی سڑکوں کے نئے پن کا افسانہ سنا رہی تھی، سڑکوں کے کنارے جا بجا تماشائیوں کے جھنڈ زبانِ حال سے خوش آمدید کہہ رہے تھے اور رہ رہ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ میری کار میں افغانستان حکومت کے پروٹوکال افسر مسٹر ہندو پیس بھی تھے۔ وہ خود اس نام کی وجہِ تسمیہ سے ناواقف تھے، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ ہندوستانی لفظ شاید اِن کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ہند سے اپنے ساتھ لایا ہوگا اور اب خاندان کا نام بن گیا۔

میں نے فارسی پڑھی تو اکثر ہے، لیکن لکھنے کا اتفاق کم ہوا ہے۔ بولنے کا موقع کبھی ملا ہی نہیں۔ پچھلی بار جب سابق وزیرِ اعظم افغانستان کی پارٹی کے ہمراہ مجھے ہندوستان کا دورہ کرنا پڑا تو راستے میں کبھی کبھی اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی بھی بولنا پڑی۔ ویسے افغان افسر تو سبھی انگریزی سمجھ لیتے ہیں لیکن وزیرِ اعظم کے ذاتی اسٹاف میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو انگریزی سے ناواقف تھے، اُن سے کبھی کبھی فارسی میں بھی بولنا پڑتا اور میں رُک رُک کر جھجک جھجک کر اپنی غلط سلط فارسی آن پر عاید کرتا۔ حق مطالب کے لئے معمولی زبان سے بھی سارے کام نکل جاتے ہیں، کسی زبان کے ادب سے واقفیت ضروری نہیں ہے۔ اِن لوگوں نے میری فارسی زبان دانی کی وہ پُر غلو تعریفیں کیں کہ اب افسروں سے لے کر وزیرِ اعظم تک یہ خبر ہوگئی اور گفتگو سیاسیات، اقتصادی نظریات اور ادبیات جیسے موضوعات پر بھی ہونے لگی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ؏

بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد

جب بھرم کھل ہی گیا تو میں بھی بے باک ہوگیا اور ہر موضوع پر فارسی میں گفتگو کرنے لگا۔ اس گفتگو میں زیادہ تر رَواں فرہادی، ڈائرکٹر جنرل محکمہ امورِ خارجہ اور قشقائی، رئیس بختار ایجنسی، روزنامہ کابل شائز شریک رہا کئے۔ باتوں میں کشمیر کا ذکر نکل آیا اور فانی کشمیری اور غنی کشمیری کا تذکرہ آ گیا۔ میں نے بتایا کہ کشمیر کی ثقافتی اکادمی نے اول الذکر کی مثنویوں کا مجموعہ اور آخر الذکر کا دیوان غزل شائع کیا ہے اور دیوانِ غنی کشمیری کی ترتیب و تصحیح میں میرا بھی کچھ ہاتھ رہا ہے۔ اب اِن حضرات

نے دیوانِ باقی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، بلکہ یہ بھی کہا کہ کہیں مل سکے تو اُن کے لئے بقیمت خرید کر لیا جائے۔ میرے پاس دو تین نسخے موجود تھے وہ میں نے ادب و احترام کے ساتھ وزیرِ اعظم افغانستان، وزیر مالیات افغانستان اور قشقاقی کی خدمت میں پیش کر دئے۔ ڈاکٹر فرہادی کے لئے کوشش کے باوجود کوئی نسخہ مہیا نہ ہو سکا اور اس کا افسوس رہا۔ قشقاقی کے والدِ محترم نے علامہ شبلی کی "شعر العجم" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور وہ اردو سے بھی بخوبی واقف تھے اس لئے آقائی قشقاقی سے مزید قربت محسوس ہونے لگی تھی۔ اب رواں فرہادی سے ہوائی اڈے پر جو ملاقات ہوئی تو پچھلی تمام یادیں ذہن میں اُبل آئیں اور انھوں نے بھی مجھے پہچان کر فارسی میں گفتگو شروع کر دی۔ بس پھر کیا تھا، میں افغانستان کے پورے سفر میں فارسی کا "نیم ملا خطرۂ زبان" بنا رہا۔

زبان بھی دلوں کو جوڑنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ کابل میں میری شکستہ فارسی میرے بہت کام آئی، کسی مجمع میں بھی مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہونے پائی۔ کابل کی فارسی جدید ایرانی فارسی سے مختلف اور قدیم فارسی سے قریب تر ہے۔ اسے اب وہاں ثقافتی اور سرکاری حلقوں میں دری کہتے ہیں، لیکن عام طور پر لوگ فارسی ہی کہتے ہیں۔ میں نے اپنی فارسی سے موٹر ڈرائیور، ہوٹل کے بیرے ڈاک اور تار کے محکموں کے اہلکاروں، دفتروں کے چپراسیوں اور کلرکوں سبھی سے کام چلایا۔ سب خوش ہو کر مجھ سے بات کرتے اور ایک عجیب و غریب اپناپن محسوس کرتے۔ ایک ڈرائیور اردو بھی جانتا تھا، لیکن جب اسے معلوم ہو گیا کہ میں فارسی میں بات کر سکتا ہوں، تو وہ میرے اردو سوالوں کا جواب بھی فارسی میں دینے لگا۔ ڈرائیور کا نام غالباً محی الدین تھا۔ غالباً اس لئے بڑھا رہا ہوں کہ ناموں کے معاملے میں میرا حافظہ خاصا ناقابلِ اعتبار ہے۔ قدرت کا کھیل دیکھئے کہ اس کے ساتھ سینکڑوں نہیں بلا مبالغہ ہزاروں سے سیاسی، ادبی، ثقافتی، سرکاری اور سماجی ضرورتوں کے تحت شناسائیاں ہیں اور حافظہ پر ناموں اور حلیوں کا اچھا خاصا بار ــــ لطیف و خوش آئند لادے پھرتا ہوں !

ہوائی اڈے سے ہم پہلے "گل خانہ" گئے جو صدرِ اعظم افغانستان کی سرکاری اقامت گاہ ہے اور جس کے شاندار مہمان خانے میں ہمارے نائب صدر قیام فرمانے والے تھے، اور پھر وہاں

[illegible] میں دوسرے افسر اور ہندوستانی اخبارنویس وغیرہ ہوٹل کابل پہنچے۔ ہمیں جو مطبوعہ پروگرام ملا وہ دو زبانوں یعنی انگریزی اور دری (فارسی) میں تھا۔ فارسی میں جولائی ۱۹۶۶ء کے پہلو بہ پہلو سرطان ۱۳۴۵ کی تاریخیں بھی درج تھیں۔ پروگرام میں آمد کے لئے 'مواصلت'، استقبال کے لئے 'پذیرائی' دستخط کرنے کے لئے 'امضاء' "گل پوشی" کی جگہ "گل گذاری" دوپہر اور شام کے کھانے کے لئے 'صرف نہار' و 'صرف شام' اور وداعی مراسم کے لئے 'مراسم تودیع' استعمال کئے گئے تھے یہ دیکھ کر مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ ہمارے مکاتب اور عربی مدارس میں جو فارسی پڑھائی جاتی ہے وہ ایرانی ہی نہیں بلکہ افغانی فارسی سے بھی بہت دور جا پڑی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی ہم زیادہ تر قدیم فارسی سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اور جدید فارسی سے رشتہ جوڑ کر اپنے اور کورسوں میں فوری مناسب تبدیلیاں کرنا چاہئے۔

دوسری بات جو میں نے اس سلسلے میں محسوس کی وہ یہ تھی کہ نہ صرف یہ پروگرام بلکہ فارسی میں ہر چیز، اخبار، رسالے، کتابیں، پوسٹر وغیرہ سبھی خط نسخ میں چھپتے ہیں اور نستعلیق صرف آرائش کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ گویا عرب ممالک، ایران، افغانستان اور مشرق بعید ہر جگہ خط نسخ ہی رواج پا گیا ہے۔ صرف ہندوستان و پاکستان دو ایسے ملک ہیں جو اب بھی خطِ نستعلیق سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اچھے کاتب نایاب ہوتے جا رہے ہیں اور نستعلیق کی بنا پر ہم تمام جدید سہولتوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں لیکن اپنی قدامت پسندی پر مفتخر و نازاں ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں جلد از جلد نسخ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تاکہ ٹائپ وغیرہ سے کام چلا سکیں اور اچھی طباعت اور بین الاقوامی سہولتوں کو پا سکیں۔ میں نے وہاں کے قیام میں یہ بھی دیکھا کہ ایرانی کتابیں وہاں خاصی تعداد میں پڑھی جاتی ہیں، بالخصوص ایرانی ناول مقبول ہیں۔ ہوٹل کے بیرے اور ڈرائیور بھی ایرانی ناول پڑھتے ہیں۔

افغانستان میں پشتو اصل زبان ہے لیکن فارسی کو بھی سرکاری مرتبہ حاصل ہے۔ کابل شہر کی اکثریت فارسی سمجھتی اور بولتی ہے۔ دوکانوں پر، ڈاک خانوں، تار گھروں، دفتروں، ہوٹلوں، سبھی

بلکہ زیادہ تر لوگ فارسی ہی میں بات کرتے ہیں۔ اخبارات بھی زیادہ تر فارسی میں نکلتے ہیں، کچھ اخبار و رسائل پشتو میں بھی نکلتے ہیں۔ انگریزی میں روزنامہ "کابل ٹائمز" نکلتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر کچھ دنوں پہلے تک ہندوستان کے جانے پہچانے مسٹر کلتی تھے۔ اب وہ چلے آئے ہیں، لیکن خبر تھی کہ وہ لوگ پھر کسی ہندوستانی اخبار نویس کو اس اخبار کی ادارت کے لئے بلا رہے ہیں۔ افغانستان کی قومی خبر رساں ایجنسی بختار ہے لیکن بختار خبر رساں ایجنسی کا دائرۂ عمل افغانستان ہی تک محدود ہے، باہر کی خبروں کے لئے اسے "رائٹرز" یا "اسوشی ایٹڈ پریس آف امریکہ" کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے سے جو خبریں ملتی ہیں اُن میں سے اکثر ایک خاص زاویۂ نگاہ جھلکتا ہے۔ وہ اس کے خواہاں تھے کہ کسی ہندوستانی خبر رساں ایجنسی سے بھی صحافتی روابط قائم ہو جائیں تاکہ کم از کم ہندوستان کے بارے میں صحیح اور غیر جانبدار خبریں وہاں پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں کئی انتظامی مرحلے آتے ہیں میرے ساتھ یہاں کی خبر رساں ایجنسیوں کے بھی نمائندے گئے تھے، ممکن ہے کہ اِن لوگوں سے وہاں بات چیت ہوئی ہو۔

افغانستان کی صحافتی زندگی میں ہندوستان کا جذباتی لگاؤ قدیم ہے۔ وہاں صحافت کی ابتدا سید جمال الدین افغانی کے روزنامہ "کابل" سے ہوتی ہے۔ سید مرحوم سے ہندوستان میں کون واقف نہیں ہے۔ یہ روزنامہ بہت جلد وہاں کی خانہ جنگی کی نذر ہوا۔ پھر ۱۸۷۶ء میں امیر شیر علی خاں کے روزنامہ "شمس النہار" نے اس کی جگہ لی۔ یہ بھی سید افغانی کی پالیسیوں اور اصلاحات کا حامی تھا اور ہر دل عزیز تھا۔ یہ بھی بعد میں نذرِ خانہ جنگی ہوا۔ پھر صحافتی زندگی میں تعطل سا آیا جو امیر حبیب اللہ خاں کے زمانے میں ختم ہوا۔ اس زمانے میں محمود طرزی نے "سراج الاخبار" جاری کیا۔ امیر امان اللہ خاں کی تخت نشینی کے بعد اس کا نام "امانِ افغان" ہو گیا۔ اسی دور میں مشہور عالم غلام محی الدین نے روزنامہ "انیس" بھی جاری کیا جو اب تک شان سے چل رہا ہے۔

اس کے بعد فسادات میں پھر اخباروں پر آفت آئی۔ ۱۹۲۹ء میں محمد نادر شاہ کے زمانے میں روزنامہ "اصلاح" جاری ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں کابل میں ایک ادبی انجمن قائم ہوئی۔ ہندوستان

سے ڈاکٹر سر محمد اقبال اور علامہ سید سلیمان وغیرہ نے کابل کا سفر کیا۔ ۱۹۳۹ء میں یہاں پریس کا محکمہ قائم ہوا۔ اس انجمن اور اچھے پریس کے قیام سے یہاں کی صحافت کو بڑا سہارا ملا۔ آج کل افغانستان میں کم و بیش چالیس اخبارات و رسائل دری (فارسی) پشتو اور انگریزی میں شائع ہو رہے ہیں۔ کابل کے چار روزنامے "انیس"، "ہیواد"، "اصلاح" اور "کابل ٹائمز" سرکاری مطبع میں چھپتے ہیں اور وہیں سے ۱۵ کے قریب ہفت روزے اور پندرہ روزے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ابھی تک بیشتر اخبارات سرکاری ہی ہیں، لیکن اُن میں بنیادی پالیسیوں کے علاوہ عام امور میں کافی آزادی سے اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ بہرحال موجودہ آئین میں پریس کی آزادی کی ضمانت دے دی گئی ہے اور سرکار وہاں نجی اخبارات نکالنے والوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ دری اور پشتو کے اخبارات ٹائپ میں چھپتے ہیں۔ پریس میں روٹری اور لائنز کا باقاعدہ انتظام ہے۔ اور اخبارات و رسائل معقول چھپتے ہیں۔

اخباروں کی اشاعت جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کابل میں تعلیم بھی کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ جس وقت ہماری کار کابل کی سڑکوں سے گزرتی تو ہم کو اکثر چھوٹی چھوٹی بچیاں سیاہ فراکوں، سیاہ ہی لمبے موزوں اور ایک سیاہ اسکارف میں ملبوس نظر آتیں۔ فراکیں ذرا لمبی ہوتیں اور ٹانگیں موزوں میں چھپی رہتیں۔ بس پھول سے معصوم رخسار اور سرخ و سفید ننھے ننھے ہاتھ کھلے رہتے۔ یہ اسکولوں کی طالبات ہیں۔ سبھی اسکولوں میں سیاہ یونیفارم لڑکیوں کے لئے ہیں۔ اس سے بڑی عمر کی عورتیں بھی یورپی انداز کے لباس میں نظر آتیں۔ میں نے تو بعض برقعوں کے نیچے بھی یورپی لباس دیکھا اور مشرق و مغرب کا یہ ملاپ کچھ عجیب و غریب نظر آیا۔ کچھ عورتیں سائیکلیں چلاتی نظر آئیں، مگر اُسی مغربی لباس میں اور چند عورتیں دفاتر وغیرہ میں بھی ملیں۔ اُن کی آنکھوں میں مشرقی حیا و شرم اب بھی پڑھی جا سکتی تھی لیکن ان میں علم و تمدن کی روشنی بھی تھی۔ وہ زلفیں جو کبھی ناگنوں کی طرح شاعروں کی چھاتی پر لہرایا کرتی تھیں، اب مغربی تراش و خراش کا نمونہ بنتی جا رہی ہیں اور اب طائر تخیل کے پر پرواز ہی سے اُن کی تشبیہ دی جا سکتی ہے ـــ لیکن (اور یہ بہت پرانا لیکن ہے)

ایسی عورتوں کی تعداد کم ہی ہے کیونکہ پردہ اب بھی عام ہے۔ اعلیٰ طبقوں میں پردہ نہیں رہا ہے لیکن وہ بھی باہر شاذ ہی نکلتی ہیں۔ دوکانوں اور شفاخانوں میں برقعے عام طور سے نظر آجاتے ہیں۔

کابل کے بازاروں اور سڑکوں پر شلواریں اور ساڑیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن نسبتہً ساڑیاں کم ہیں۔ مردوں کی بہت بڑی اکثریت مغربی لباس اختیار کر چکی ہے۔ لمبے کوٹ پر شلوار اور کلاہ یا قراقلی ٹوپی بھی خاصی عام ہے، لیکن تعلیم یافتہ طبقے میں ان کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ ادھیڑ عمر والوں، بوڑھوں اور کم تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی رفتہ رفتہ لباس کی تبدیلی کا رجحان آنے لگا ہے۔ یہ وقت کی رفتار ہے، جس کا بدلنا ناممکن ہے، آج سارے عرب و ایران میں ہی نہیں ساری ایشیا اور سارے افریقہ میں یہی رجحان ہے۔ کم از کم لباس کے معاملے میں دنیا ایک ہوتی جارہی ہے اور ملک اور علاقے کی حدبندیاں ٹوٹتی جارہی ہیں۔

یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم ہے اور تعلیم مفت ہے۔ لڑکے لڑکیاں سب تندرست اور خوش رو نظر آئے۔ اکثریت خوش حال بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ ہے کہ متوسط طبقہ آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے اور نچلے طبقوں کے طلبا سرکاری امداد پاتے ہیں۔ ویسے بھی کابل تیزی سے ترقی اور خوش حالی کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے آثار صرف نوجوانوں کے صحت مند چہروں پر ہی نظر نہیں آتے، بلکہ کابل کی ساری زندگی اس کی گواہی دیتی ہے۔ یہ شہر جو پہلے چھوٹے چھوٹے کچے گھروندوں پر مشتمل تھا، آج یہاں بلند اور کئی منزلوں والی عمارتیں بن گئی ہیں اور بنتی جارہی ہیں۔ سارے ملک میں سڑکوں کا ایک جال بچھ رہا ہے، نئے کارخانے مکمل رہے ہیں، غیر مزروعہ زمینیں زیر کاشت لائی جارہی ہیں۔ پن بجلی کے منصوبے بن رہے ہیں۔ غیر ملکی تجارت ترقی پر ہے اور بازاروں میں بڑی رونق اور چہل پہل ہے۔

قیمتیں تو ساری دنیا میں بڑھ رہی ہیں اور ان کا کچھ اثر کابل میں بھی ہے لیکن نان کی قیمت شاہی حکم سے مقرر کر دی گئی ہے اور نان کے وزن اور قیمت دونوں ہی کی سخت جانچ ہوتی ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا ملتی ہے۔ نان کے علاوہ "محاصرات" (Government monopolies) میں بھی مقررہ قیمتوں پر چیزیں ملتی ہیں۔ محاصرات میں زیادہ تر روس سے درآمد کی

عملاً چیزیں فروخت ہوتی ہیں، گھڑیاں، فاؤنٹن پن، بال پوائنٹ، کیمرے، کچھ چھوٹی موٹی مشینری، شیشے کا سامان وغیرہ۔ اِن جگہوں کے علاوہ جن دوکانوں پر جائیے وہاں مول تول ضرور ہوتا ہے۔ مول تول کا کاروبار بھی عجیب ہے۔ سودا لینے والے کو یہ کبھی یقین نہیں ہوپاتا کہ وہ صحیح دام دے رہا ہے۔ خاصا سستا سودا چکانے کے بعد بھی اُس کو یہی دُگدھا رہتا ہے کہ کہیں دوکاندار نے زیادہ دام تو وصول نہیں کر لئے۔ دوکاندار ایمانداری سے دام بتانے کے بعد بھی خریدار کو اپنی صداقت کے بارے میں مطمئن نہیں کرپاتا۔ کئی دوکاندار مول تول نہیں کرتے، وہاں جاکر بھی لوگ یہی سوچتے ہیں کہ جو دام وہ بتارہا ہے وہ قطعی ہے یا نہیں۔ اس چکر میں لوگ کئی دوکانوں کے چکر لگاتے ہیں۔ یہ طریقہ ہمارے اکثر شہروں میں بھی رائج ہے۔ اس لئے ہم اس کے عادی سے ہوگئے ہیں، لیکن اس کی روک تھام ضروری ہے۔

وہاں کی حکومت نے اشیاء پر درآمدی محصول کم لگایا ہے، اس لئے باہر کا مال وہاں سستا ہے اور اُن ممالک کے سیاح جہاں درآمدی محصول زیادہ ہے یہاں سے درآمدی سامان خرید کر لے جاتے ہیں۔ اِن سامانوں میں ٹریلین کی قمیصیں اور بُش شرٹیں، گھڑیاں، ٹرانزسسٹر خریدتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت بہت ہی محدود تھا۔ نائب صدر کے سرکاری دورے کا پروگرام ایسا بنا تھا کہ تقریباً ہر تھوڑی دیر کے بعد کوئی تقریب ہوتی یا کہیں جانا پڑتا تھا۔ بیچ بیچ میں اگر وقت مل جاتا تو ہم بھی بازار جھانک آتے، لیکن وہ مہلت ہوتی کہ خریداری کا مزا کرکرا ہو ہوجاتا۔ کابل کے بازاروں میں سبھی طرح کا مال ہے۔ روس کے علاوہ جرمنی، جاپان، لبنان وغیرہ کی چیزیں کافی ملتی ہیں۔ دوکانوں پر خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور خریداروں کی صف میں غیر ملکیوں سے لے کر، افغانستان کے دیہی علاقوں تک کے خریدار شامل ہوتے ہیں۔

سفر کا پہلا دن رسمی تقریبات کی نذر ہوجاتا ہے جس دن ہم لوگ کابل پہنچے (۱۰ جولائی ۱۹۶۹ء) وہ اتوار تھا، لیکن کابل میں تعطیل کے سناٹے کی بجائے معمولی دنوں کی چہل پہل تھی۔ معلوم ہوا کہ وہاں ہفتے کی چھٹی جمعہ کو ہوتی ہے اور جمعرات کو بھی نصف دن کی تعطیل ہوتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے

بعد ہم لوگوں نے قیلولہ کا وقت نکال لیا۔ چار بجے کتاب شاہی پر دستخط کرنے کے لئے نائب صدر "قصر دلکشا"
میں تشریف لے گئے، جہاں حضور اعلیٰ حضرت ہمایونی (شاہ کابل) تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے بعد
سابق شاہ افغانستان مرحوم، نادر شاہ کے مزار پر رسم "گل گزاری" کے لئے ہم سب گئے۔ یہ مزار "تپ
مرنجان" نامی پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے اور اس بلندی سے سارے شہر کابل کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔
سامنے بالا حصار کے نیچے وہ شور بازار ہے جس کے ملائے شور بازار کے نام سے ہم سب واقف رہ چکے
ہیں۔ نادر شاہ کا مزار خوبصورت بنا ہے اور طرز تعمیر قدامت اور جدت کا بہت ہی حسین امتزاج ہے۔
"گل گزاری" اور فاتحہ خوانی کے بعد ہم لوگ وہاں سے واپس ہوکر صدر اعظم (وزیر اعظم) محمد ہاشم میوندوال
کی قیام گاہ "گل خانہ" پہنچے۔ وہاں صدر اعظم سے نائب صدر کی بہت دوستانہ ملاقات ہوئی اور ہم
لوگ اپنے سفارت خانے اور حکومت افغانستان کے افسران اور ساتھی صحافیوں سے مصروف
گفتگو رہے۔ چائے اور کافی کا دور چلا اور کابل کے پستے اور بادام مزے لے لے کر کھائے گئے
بادام تو خیر کشمیری بادام ہی جیسے تھے، بلکہ کشمیری بادام کے بعض اقسام یقیناً اس سے بہتر تھے لیکن
پستے واقعۃً خوب تھے اور خاصے کی چیز تھے۔

رات کو نائب صدر کے اعزاز میں صدر اعظم افغانستان نے "چہل ستون محل" میں شاندار دعوت
دی۔ حکومت کے عمائد، سفراء، ممتاز شہری اور حکام مدعو تھے۔ چالیس ستونوں کا یہ خوبصورت محل امیر
عبدالرحمٰن نے بنایا تھا اور شاہزادہ حبیب اللہ کے صرفِ خاص میں دے دیا تھا۔ ایک انگریز ڈاکٹر
نے اس کی تشبیہ اس یونانی مندر سے دی تھی جس کے چاروں طرف ستون ہوں۔ اس محل سے تاریخ
کا ایک باب وابستہ ہے۔ ڈیورنڈ لائن کے مصنف سر ڈیورنڈ کی سرکردگی میں جو ڈیورنڈ وفد آیا
تھا وہ اسی محل میں ٹھہرایا گیا۔ شاہ ایران، صدر آئزن ہاور اور وزیر اعظم خروشچیف کو بھی یہیں ٹھہرایا
جاچکا ہے۔ اس کے چاروں طرف خوبصورت باغ اور چاردہ وادی ہیں جو اس محل کی بلند کرسی
سے صاف نظر آتے ہیں۔ چاندنی رات تھی اور روشنیاں بھی آب وتاب سے جل رہی تھیں، مگر میں
نئے اور پرانے دوستوں کے مجمع میں محوِ گفتگو اور نئے لوگوں سے ملاقات میں مصروف تھا۔ اگرچہ

میرے پاس کھانے کا انگریزی سوٹ بھی تھا، مگر میں نے سیاہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامے کو ترجیح دی تھی، نائب صدر اور چند دوسرے ہندوستانی مدعووین نے بھی شیروانی پہن رکھی تھی اور بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ اِن دعوتوں میں افغانی عورتیں شاذ آتی ہیں۔ لیکن وزیرِ صحت، کبریٰ نور زادہ وہاں تشریف فرما تھیں۔ آپ بہت ہی سنجیدہ اور تین اور حسنِ صورت وحسنِ سیرت دونوں سے متصف ہیں اور ہر طبقے میں ہر دلعزیز ہیں۔ سفرار کی صفوں میں چند خواتین اور تھیں، ورنہ مجموعی حیثیت سے یہ مردوں ہی کی دعوت تھی۔ دعوت میں انواع واقسام کے کھانے، میوے اور پھل چُن دیے گئے تھے۔ ہر چیز خوب تھی۔ ترکیب زیادہ تر وہی مغل کھانوں کی تھی اور بنیادی طور پر ذائقہ بھی وہی تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہایت ہوشیار باورچیوں نے دادِ فن دی تھی۔ ہر چیز وافر اور بامزہ تھی۔ دعوت کے بعد حسبِ دستور تقریر ہوئی اور جامِ صحت نوش کیا گیا لیکن یہ جام جامِ سادہ تھا، آخر نائب صدر جیسے متقی کی دعوت تھی! یہاں شہر کے کئی مدیروں اور ادیبوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہاں بھی یہ بات لب بہ لب گشت کر گئی کہ میں فارسی جانتا ہوں اور پھر تمام گفتگو مجھے مستقل طور سے فارسی میں کرنا پڑی۔

اس دعوت سے پہلے ایک غیر رسمی سی ملاقات خان عبد الغفار خاں سے ہوئی۔ قومی تحریک کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میں اُن سے تھوڑا شناسا سا تھا اور انھیں بادشاہ خان یا سرحدی گاندھی کے ناموں سے یاد کرتا تھا۔ آزادی کے بعد ہمارے اور ان کے درمیان ملک کی تقسیم نے ایک فرضی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ پھر آزادی کے بعد کی بیشتر مدت انھوں نے پاکستانی جیلوں میں گزاری اور اب افغانستان میں وطن سے باہر زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ اس لئے انھیں ہندوستان آنے کا موقع نہیں ملا لیکن اہلِ ہند انھیں بڑے پیار اور احترام سے یاد کرتے ہیں۔ نائب صدر ہند کے ہمراہ ہم "دارالامان" کے اُس گوشے میں پہنچے جو کبھی اس عالیشان محل کا مہمان خانہ تھا۔ بلند و سرسبز درخت اور ہرا بھرا سبزہ زار دعوت نظر دیتا تھا۔ اسی سبزہ زار کے ایک گوشے میں کچھ لکڑی کی معمولی سی کرسیاں پڑی تھیں اور ان پر بادشاہ خان کی بلند قامت ہستی ہلکے سرمئی رنگ کے کھدر میں ملبوس ہمارے سامنے استادہ تھی۔ پہلے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر سے ملاقات ہوئی، آداب کے بعد دونوں

گرم جوشی سے گلے ملے اور سبھی ہندوستانی ساتھیوں کی آنکھیں بھر آئیں، خود یہ دونوں حضرات آبدیدہ ہو گئے۔ اس کے بعد خان عبدالغفار خاں نے دوسرے ہندوستانیوں سے ملاقات کی، شربت کا ایک دور چلا، اور پھر نائب صدرِ ہند اور بادشاہ خاں ایک گوشے میں بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ ہم لوگ اِس موقع پر صرف خاموش تماشائی تھے۔ بعد میں چند لمحے ہم سے بھی ملاقات ہوئی لیکن ہم نے ممدوح سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ ہم لوگوں یعنی صحافیوں کو تفصیلی ملاقات کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ دوسری مرتبہ ہم لوگ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے قریب بادشاہ خاں کے پاس رہے اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ اگرچہ اُن کی ساری زندگی جیلوں میں گزری تھی لیکن سچے گاندھی وادی کی طرح اُن کی گفتگو کے انداز میں کوئی تلخی نہیں تھی۔ وہ پٹھانوں کے لئے ایک باعزت و باوقار جگہ چاہتے ہیں اور پختونستان کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اُن کے ارادے جوان ہیں اور اُن کے بالکل ہی سفید بالوں کے پیچھے آج بھی ایک قوی اور باہمت دل ہے۔ اخبار نویسوں سے بات کرتے وقت وہ کچھ ابتدائی دور کی باتیں سنانے لگے۔ گاندھی جی اور جواہر لال کی گھریلو زندگی کی باتیں۔ بڑی ہی دلچسپ اور مفید صحبت رہی۔ جب ہم اٹھے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور چلے تو ایک نہ مٹنے والی یاد بھی ہمارے ساتھ چلی۔

کابل میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ صحافیوں، ادیبوں اور مفکروں کی بڑی قدر ہے۔ موجودہ صدر اعظم جناب محمد ہاشم میوندوال خود ایک صحافی اور ذی علم بزرگ ہیں۔ شعراء میں جناب مائل ہروی سے، علماء اُدباء میں جناب کہزاد اور پروفیسر اشتین، آقائی گویا اعتمادی، وزیر معارف ڈاکٹر انس سے اور وزارت خارجہ کے رئیس روان فرہادی سے، صحافیوں میں کابل کے روزناموں کے مدیرانِ گرامی سے رواروی ہی کی ملاقاتیں رہیں اور تشنگی سی محسوس ہوتی رہی۔ ملاقاتیں ہوئیں تو دعوتوں میں لیکن چونکہ دعوتیں مختلف مقامات پر ہوئیں کبھی پغمان میں، کبھی چہل ستون میں، کبھی سفارت خانۂ ہندوستان میں، کبھی باغ بالا میں اور ہر جگہ فطری طور سے مجھے یہی مجمع اپنی جانب کھینچتا تھا، اس لئے ان کے چہرے آج بھی نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں، وہ مسکراتی، محبت بھری، وہ چہروں پر

فضائت اور جذبہ عمل کا نور! آقائی قشقائی کابل ریڈیو کے رئیس ہیں۔ ان سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی، اس بار کچھ زیادہ ہی ملاقاتیں رہیں۔

کئی حلقوں میں، کئی صحبتوں میں، مختلف طبقات کے افغانیوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ہندوستان کے لئے ان کے دلوں میں محبت ہے، لیکن ہر محبت کی طرح اس کو بھی عین ایمان بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس میں مزید استواری پیدا کرنے کی کوششوں سے غافل نہ رہیں۔ یہ کوشش صرف زبانی باتوں کا نام نہیں ہے۔ ملکوں کے مابین صرف افلاطونی قسم کی محبت بے معنی ہے۔ اس کی جڑیں انسانی زندگی میں دور تک پیوست ہونی چاہئیں۔ اس سیاحت میں بھی اسی قسم کا جذبہ کارفرما نظر آیا۔ نائب صدر جمہوریہ نے اس موقع پر ایک سو پلنگوں کے ایک وسیع اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ اسپتال ہندوستان کی مالی امداد سے بن رہا ہے۔ اس پر کوئی ۵۰ لاکھ روپے صرف ہوں گے اس میں سارا سامان بھی ہندوستان دے گا اور بیشتر ہندوستانی ڈاکٹر ہی اس میں کام کریں گے یہ اسپتال بچوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ رنگا رنگ شامیانوں کے نیچے، ایک منتخب مجمع کے سامنے نائب صدر نے سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ واقعتہً سنگ بنیاد تھا، یعنی ایک ٹکڑا زمین کا نیو کی طرح کھودا گیا اور اس میں کابل کے پہاڑوں سے کٹا ہوا پتھر کا ایک ٹکڑا، نائب صدر نے اپنے عالمانہ ہاتھوں سے نصب کیا۔ کتبہ بھی وہاں رکھا ہوا تھا، جب نیو سے دیوار اوپر کو اُٹھ کے آ ئے گی تو یہ کتبہ کہیں پر نصب ہوگا۔ نہ صرف وزیر صحت کبریٰ نور زادہ صاحبہ بلکہ نائب صدر نے بھی اس موقع پر افغانی دری (فارسی) میں تقریریں کیں۔ مجمع میں کئی صحافی دوستوں اور سیاحوں نے بتایا کہ موجودہ افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی بیرونی ہستی کو افغانستان نے یہ اعزاز بخشا ہے کہ وہ کسی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھے۔ شروع شروع میں تو اس اسپتال میں ہندوستانی ڈاکٹر ہی کام کریں گے لیکن جیسے جیسے افغانی ڈاکٹر ابھرتے آئیں گے وہی اس کام کو سنبھال لیں گے۔

افغانستان کو زرعی اور تجارتی سامان مہیا کرنے کے علاوہ حکومت ہند وہاں ایک بجلی گھر اور ایک کپڑے کے کارخانے کی تعمیر کے سلسلے میں بھی مدد دے رہی ہے اور اس دوسرے

بی تعاون اور باہمی امداد کے مختلف ذرایع پر گفت وشنید ہوتی اور اس اعتبار سے یہ سفر بہت ہی نتیجہ خیز رہا۔ بالخصوص ہمارے نائب صدر نے وہاں دلوں کو موہ لیا۔ افغانیوں کو کہیں سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ذاکر صاحب کی اصل بھی افغانی ہے اور ان کے اجداد اب سے کچھ صدی پیشتر ہندوستان میں جا بسے تھے۔ اس لئے ذاکر صاحب کو افغانی ایک دوست ملک کے نائب صدر سے کچھ زیادہ ہی عزیز گردانتے تھے۔ پھر اُن کی فرشتہ خصلتی اور نیکی، ذہانت وشہرت نے ان کی شخصیت کے گرد جو ہالے بنا رکھے ہیں اُن کے بھی قدرداں تھے۔ غرض، اتنے کامیاب سفر کو صرف خیر سگالی یا سیاسی سفر سمجھ لینا غلط ہوگا۔ اُن سات دنوں کے ہر لمحے میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری دوستی کے رگ و پے میں تازہ خون دوڑ رہا ہے۔

کابل ہوٹل کے لاؤنج میں ایک روز اتفاق سے ایک ایسی خاتون سے ملاقات ہو گئی، جو بہت ہی خوش لہجگی سے اردو میں باتیں کر رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے بند گلے کا کوٹ پہنے دیکھ کر یہ تاڑ لیا کہ میں ہندوستانی ضرور ہوں گا اور انھوں نے دریافت کیا کہ کیا ذاکر صاحب ابھی کچھ دنوں اور رہیں گے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بیگم میاں افتخار الدین ہیں۔ یہ ان میاں افتخار الدین کی اہلیہ تھیں جو پہلے متحدہ پنجاب کی صوبائی کانگریس کے صدر رہ چکے تھے، پھر پاکستان میں انھوں نے "پاکستان ٹائمز"، وغیرہ اخبارات نکالے، جن پر بعد میں حکومت پاکستان نے قبضہ کر لیا۔ میاں صاحب بڑے ہی ترقی پسند تھے اور ہمارے زمانے میں طلبہ کی سیاست میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ بیگم صاحبہ کو دیکھ کر بہت سی یادیں ابھر آئیں۔ ملک کی تقسیم نے انسانی تعلقات کے درمیان کتنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں! دو تین اور پاکستانی وہاں جمع تھے، سب اپنے ہندوستانی اقربا اور احباب کو یاد کر رہے تھے، اور اس پر افسوس کر رہے تھے کہ آنے والی نسل شاید یہ جان بھی نہ پائے کہ سرحد کے دونوں طرف محبتوں اور روایتوں کی کتنی خوشگوار ہوائیں، خوش آیند یکسانیت کے ساتھ چلتی رہی ہیں۔

چلتے چلاتے کابل کے ایک اور گوشے کے تاثرات ناظرین تک منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دن کچھ

وقت فاضل تھا، ہمارے میزبانوں نے سوچا کہ ہمارے لئے سیاحت کا مزید موقع فراہم کریں۔ لیکایک یہ فیصلہ ہوا کہ ہم "باغ بابر شاہ" دیکھنے جائیں گے۔ "باغ بابر شاہ" کو ایک بھولا ہوا خواب سمجھنا چاہیئے۔ یہ باغ کبھی چناروں اور دوسرے درختوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا، اور اس کے سبزہ زاروں پر ظہیرالدین محمد بابر شاہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر مے کشی کی تھی اور دادِ عیش دی تھی۔ اس کے وسط میں ایک نہر بھی رواں تھی، سبزہ تو اب بھی موجود ہے لیکن نہر کا نشان نہیں ہے، درختوں میں کچھ چنار بچ رہے ہیں، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان چناروں کی عمریں کیا ہیں۔ غالباً یہاں بابر کے زمانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔

اکتوبر ۱۵۰۴ء میں بابر بارہ برس کے نوجوان شاہزادے کی حیثیت سے کابل میں داخل ہوا تھا وہاں کا تخت حاصل کر کے اُس نے ہندوستان کا رخ کیا اور آگرہ کو پائے گاہ بنایا پھر یہیں ۱۵۳۰ء میں اُس نے اپنی جان اپنے بیٹے ہمایوں پر نچھاور کر دی۔ ہندوستان میں بھی اُس کا دل کابل کے اُن باغوں میں لگا رہتا، جہاں اس نے جوانی کے دن گزارے تھے۔ مرتے وقت اُس نے وصیت کی کہ اُس کی لاش کابل ہی میں دفنائی جائے۔ اس کے مرنے کے بعد میّت آگرہ میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ پھر خانہ جنگی کی بدولت کسی کو اُس کی وصیت پر عمل کرنے کا خیال نہیں آیا۔ نو برس کے بعد اُس کی میت آگرہ سے کابل منتقل کی گئی۔ اُس کی وفادار بیوی، بی بی مبارکہ جو یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں میت کے ساتھ کابل گئی اور اسی باغِ بابر میں سونپ دی گئی۔

جہانگیر نے اس پر کتبہ نصب کرایا اور غالباً خوبصورت مگر مختصر سا مقبرہ بھی بنوایا۔ مقبرہ کم از کم ۱۸۳۲ء تک تو اچھی حالت میں تھا۔ چارلس میسن نے اپنی کتاب Narrations of Various Journeys in Balochistan, Afghanistan, Punjab and Kalat میں مقبرہ کا جو نقشہ دیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کا فرش تھا، اور مقبرہ بلند کرسی پر بنا تھا۔ باہر درختوں کی قطاریں تھیں، نہر تھی، گلاب و یاسمین کی جھاڑیاں پہاڑی پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف سنگِ مرمر کی جالیاں، خوبصورت بنی ہوئی لگی تھیں۔ یہ سب تفصیلیں پرانے سفرناموں میں ملتی ہیں۔ لیکن بعد میں یہ سب اجڑ گیا اور صورت بے ہو گئی ہے۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے ——— نے پرِ پروانہ سوزد نے سراید بلبلے

شاہ نادر شاہ کے زمانے میں اس کی مرمت کی طرف کچھ توجہ کی گئی اور اب یہ جگہ اس قابل ہو گئی ہے کہ وہاں جانے والوں کو جانے کے لئے کہا جا سکے، لیکن اب بھی یہاں عبرت و وحشت برستی ہے۔ حکومت افغانستان اس کی مرمت کی طرف اب بھی متوجہ ہے۔

جب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس کو دیکھنے کے لئے پہنچے تو نہ جانے کیسے آس پاس کے لوگوں کو خبر ہو گئی۔ ایک اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اس میں بہت سے قبائلی علاقوں کے طالب علم بھی تھے جو پاس ہی کے مدرسے میں تعلیم پاتے ہیں۔ سبھوں نے دیر تک اور زور زور سے تالیاں بجا کر مہمان کا استقبال کیا۔ ذاکر صاحب نے دو تین بار سلام میں ہاتھ اٹھائے۔ پھر اس مسجد کو دیکھنے گئے جو شاہجہاں نے فتح بلخ کی یادگار کے طور پر ۱۶۴۰ء میں بنوائی تھی۔ یہ سنگ مرمر اور سنگ سیاہ میں بنی ہوئی خوبصورت عمارت شکست و ریخت کی آخری منزلوں سے گزر رہی تھی۔ تیس برس پہلے اس کی مرمت کی طرف دھیان دیا گیا۔ غالباً یہ سلسلہ بیچ میں منقطع ہو گیا۔ نومبر ۱۹۶۴ء سے اطالوی ارکیالوجیکل مشن نے مرمت کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ افغانی انجنیر وغیرہ بھی ساتھ ہیں۔ یہ لوگ پرانی تصویروں اور نقشوں کی مدد سے اس کو اپنی اصلی صورت میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ ان کے طریق کار کی بابت نائب صدر جمہوریہ نے کچھ استفسار کئے، اس کے بعد بابر کے مقبرہ کی طرف گئے۔ وہاں ہم لوگوں نے نہ صرف بابر کی قبر پر بلکہ اور قبور پر بھی فاتحہ پڑھی۔ دوسری قبروں میں بابر کے سب سے چھوٹے بیٹے مرزا ہندال، ہمایوں کے بیٹے حکیم مرزا کی قبریں ہیں۔ ان کے پرانے لوح مزار محفوظ تھے اور نصب کر دئے گئے ہیں۔ اسی باغ میں عالمگیر ثانی اور مرزا ہندال کی بیٹیوں کی بھی قبریں ہیں۔

ان کا ذکر اس لئے ضروری ہوا کہ کابل میں افغانستان کے ماضی سے بے پناہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے جب قومیں بیدار ہوتی ہیں تو اپنے ماضی کی طرف بھی ضرور دوڑتی ہیں۔ اسی جذبے کے ماتحت بامیان کے علاقے میں بدھ مت کے آثار کے تحفظ کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ماضی سے ان کی دلچسپی خالص تاریخی اور قومی ہے افسوس ہے کہ ہم بامیان نہ جا سکے، جہاں مہاتما بدھ کے دو ایسے مجسمے ہیں جو دنیا میں سب سے بلند مانے جاتے ہیں گو

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار

انور صدیقی

مجاز — ایک جائزہ

مجاز اپنی شخصیت اور شاعری دونوں ہی کے اعتبار سے "رسم و رہ رومانیاں" سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھے۔ یہ ہم آہنگی کچھ اتنی مربوط اور مکمل ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کی شخصیت زیادہ رومانی تھی یا شاعری۔ اس لئے کہ مجاز اپنے کردار کے اعتبار سے اپنے شعری کردار سے بہت قریب تھے۔ ان کی اپنی شخصیت کا البیلا پن، کج کلہی، سرمستی، پرتمکنت سپردگی اور سوز و ساز ان کی شاعری کا اتنا ہی اہم حصہ ہیں جتنا کہ ان کی زندگی کا۔ آرزو اور شکست آرزو، خوابوں اور ان کی پامالیوں سے مجاز کی زندگی عبارت تھی۔ ان کی شاعری ہمیں ذاتی اور اجتماعی 'انا' کے صنم کدوں کی ویرانی کا منظر دکھاتی ہے۔ مجاز نے مختصر مگر بھرپور شعری زندگی گزاری۔ اس حیثیت سے یہ ان کی شادابیوں کی بھی امین ہے اور ویرانیوں کی بھی۔ وہ ہماری رومانی شاعری کے ہیرو بھی ہیں اور شہید بھی۔ ان کی شاعری اس رومانی لے کی تکمیل کرتی ہے جو اختر شیرانی کے نگارخانے سے بلند ہوئی تھی۔ اختر شیرانی کی شاعری اپنے حسن تناسب احساس تعبیر کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن مجھے ان کی شاعری میں تمام تر ارضیت کے باوجود ایک طرح کی الوہی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے — وہ ٹھنڈک جو رات بھر شبنم میں نہائے ہوئے تاج محل کی مرمریں سطح کو چھونے پر محسوس ہوتی ہے۔ مجاز نے اس ٹھنڈک کو اپنی سانسوں کی گرمی دی۔ انھوں نے اختر کی شاعری کی لذتیت کو تو باقی رکھا مگر اسے تبسم آمیز اشکوں سے روشن بھی کر دیا۔ ان کی غمگین نشاط انگیزی نے ان کی شاعری کو موثر بنایا اور وہ اسی درد کے رشتے سے ہزاروں نوجوانوں کے شاعر بن گئے ؎

ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُر نم نہیں ہے

مجازؔ اپنے رومانی مزاج، عزم بلند اور اپنے شعری مسلک کا تعارف یوں کرتا ہے:

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں
مجھ سے برہم ہے مزاج پیری
مجرم شوخی گفتار ہوں میں
محفل دہر پہ طاری ہے جمود
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

(تعارف)

شاعر کے منصب و مسلک کا یہ تصور سراسر رومانی ہے، تعقل کے مقابلے میں محسوسات، منجمد پیری کے مقابلے میں جوانی کی آتش نفسی، نیکی کی ٹھنڈک کے مقابلے میں گرمیٔ گناہ، یہ ساری باتیں رومانی اندازِ احساس کا پتہ دیتی ہیں۔ شیلی نے اپنی کتاب "شاعری کی مدافعت" میں اس سے زیادہ اور کیا کہا ہے کہ شاعر خوابیدہ دنیا کے لئے بیداری کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ قانون ساز ہوتا ہے، فرسودہ سماج نہیں! وہ غالبؔ کی زبان میں "عندلیب گلشن ناآفریدہ" ہوتا ہے اور صرف "گرمیٔ نشاط تصور" کے زیر اثر نغمہ سنج ہوتا ہے۔ مجازؔ اپنی رومانی تصوریت کی وجہ سے اپنی ایک الگ دنیا تخلیق کرنا چاہتا ہے، یہ دنیا اس کے لئے خلد طربناک کی حیثیت رکھتی ہے:

نہیں ہرچند کسی گم شدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلد طربناک کا ارماں ہے ضرور
بزم دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے لیکن
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور
(نکس)

مجاز ساری عمر "ایک فردوس گم شدہ" کی تلاش میں مصروف رہے۔ آدرشوں سے محبت رومانی شاعری اور فلسفے کی اساس ہے۔ ان آدرشوں سے جب دنیا انکار کرتی ہے تو شاعر کی صاعقہ بدوش شخصیت مضطرب ہو جاتی ہے۔ مجاز نے شروع ہی سے بغیر تنقیدی محاکمے کے ان آدرشوں کو اپنایا اور ان سے محبت کی، ان کی خاطر آتش و خون کے طوفانوں سے گذرنے کا عزم بھی کیا۔ اس آدرش پرستی نے ان کے اندر وہ رومانی مہم جوئی پیدا کی جو احساسات کی نئی دنیاؤں کے انکشاف تک لے جاتی ہے۔ یہی مہم جوئی ان کی نظم "طفلی کے خواب" میں بھی جھلکتی ہے اور "اندھیری رات کے مسافر" میں بھی۔

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں
(طفلی کے خواب)

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلبِ گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
(اندھیری رات کا مسافر)

غالباً مجاز کی شخصیت اور شاعری کی اسی خصوصیت کی وجہ سے کسی نے انھیں یورپ کے عہد وسطیٰ کے KNIGHTS یعنی البیلوں سے قریب قرار دیا ہے جو مہم جو تھے، حسن پرست تھے اور کبھی کبھی بڑے مقاصد کی خاطر جنگ سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یورپ کی رومانی شاعری کو عہد وسطیٰ کے کرداروں اور تہذیبی نظام نے بہت متاثر کیا۔ یہ بات بغیر کسی مبالغے کے کہی جاسکتی ہے کہ مغرب کی رومانی شاعری اور شاعروں کا کسی حد تک روحانی وطن تاریخ انسانی کا یہی دور ہے

مجاز کی حسن پرستی اور انقلابیت کی بنیاد رومانی جذباتیت پر تھی۔ یہی ان کی کمزوری بھی تھی اور توانائی بھی۔ کمزوری اس لئے کہ وہ اپنی مخصوص جذباتی افتاد طبع کی وجہ سے زندگی اور اس کے مسائل پر تھم کر نہ سوچ سکے، اور اگر خواب سحر جیسی نظموں میں سوچنے کی کوشش بھی کی ہے تو اس کی حیثیت سعیٔ ناتمام اور ایک طرح کے طفلانہ تفکر سے زیادہ نہیں، مغرب کے رومانی شاعروں میں آپ کو ایسے بہت سے شاعر ملیں گے جو علم، بصیرت اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں مگر ہماری اپنی رومانی نسل بلحاظ اعتبار سے سرمایۂ لیکن علمی حیثیت سے تہی کیسہ ہے، ممکن ہے کہ اس کی وجہ اقبال ہوں۔ انھیں کے سائے میں ہماری رومانی نسل پروان چڑھی تھی، بعض اوقات بڑے شاعر کے بعد جو نسل آتی ہے وہ اسی طرح تہی دامن ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑا شاعر فکر و فن کے تمام امکانات ایک عرصے تک کے لئے ختم کر جاتا ہے۔ جوش، اختر شیرانی اور مجاز کی فکری مفلسی کی غالباً یہی وجہ ہے، اس کے علاوہ ہمارے رومانی شاعر اس ذہنی ریاضت سے بھی دامن بچاتے رہے جو اچھے اور بڑے فنی کارناموں کو جنم دیتی ہے۔ اچھی شاعری نہ تو صرف غیر تہذیب یافتہ جذبے کی پیداوار ہوتی ہی اور نہ ہی بے جان تعقل کی۔ اس کے لئے فکر کو جذبے کا آتشیں پیرہن عطا کرنا پڑتا ہے۔ جس چیز نے مجاز کی فکری یا موضوعاتی شاعری کو تھوڑی سی مقبولیت بخشی ہے وہ ان کی غنائیت ہے۔ ان کے یہاں مطرب کے گلے کا وفور ضرور ہے مگر یہ وفور اس وقت کارگر ہوتا ہے جب وہ ہمارے سامنے ؎

شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں

کے صف میں آتے ہیں۔ مجاز کے یہاں جو علمی انقلابیت ہے اس کے پشت پر کوئی مربوط اور منظم نظریۂ زندگی نہیں بلکہ معاشی بے اطمینانی ہے جو خواب اور حقیقت کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی رومانی شاعری کے مقابلے میں اُن کی انقلابی شاعری کو اہمیت دینا مجاز کی روح کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس کی صرف اس وجہ سے قدر کرنی چاہئے کہ اس پر شاعر کی بے قرار روح کا پرتو ہے۔

مجاز دراصل ایک طرح کی جذباتی سرشاری اور شادابی کے شاعر ہیں۔ اس جذباتی اور حسی شادابی نے ان کی مختصر مگر جاندار شعری کائنات میں رنگ و نور کے بہت سے حسین اور شاندار پیکر تراشے ہیں۔ ان کی ذہنی تصویروں یا تمثالوں میں حسن اور رومان کی ایک حسین اور حیات آفریں دنیا آباد ہے۔ ایک خاص ذہنی عمر میں ہم میں سے ہر ایک اس دنیا کا باسی ہوتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ یہ دنیا ہمارے دامانِ نظر کو نہ کھینچے۔ مجاز کی پیکر نگاری (IMAGERY) کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اُن کے اکثر پیکر اپنے مزاج اور سرشت کے اعتبار سے رومانی اور اپنی وضاحت اور ربط کے اعتبار سے کلاسکی ہیں۔ رومانی شعراء کے اکثر پیکروں میں ابہام ہوتا ہے، یہی حال اُن کی تشبیہوں کا ہوتا ہے وہ غیر متعلق چیزوں کو یکجا تو کرتے ہیں مگر اُن میں ذہنی اور جذباتی رشتوں کی تلاش سے محروم رہتے ہیں۔ ایسی منزل پر مجاز اکثر کامیاب ہوتے ہیں جس سے ان کے تخیل کی خلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی مشہور نظم "آوارہ" میں جو ایک پوری نسل کے سوز و ساز کی دستاویز ہے سرمایہ دارانہ نظام کے ردّعمل سے بظاہر غیر متعلق مگر بے حد مربوط تصویر بناتے ہیں:

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

(آوارہ)

مجاز کے زیادہ تر پیکر بیشتر رومانی شعراء کے پیکروں کی طرح لمسانی ہیں، اُن میں ارضیت ہے، لمس و لذت ہے۔ جو چیز اُن کی خلاقانہ صلاحیت کا پتہ دیتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے

اس نے حسن کو خوابوں کی طرح حسین بنا دیا ہے۔ چند تصویریں ملاحظہ ہوں:

سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمال دُرِ خوش آب لئے
ضو فگن روئے حسیں پر شبِ مہتاب شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لئے
لبِ گلرنگ وہیں، جسم گداز وہیں
شوخیٔ برق لئے، لرزشِ سیماب لئے

(مادام)

عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات
نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

(آج کی رات)

مرے بازو پہ جب وہ زلفِ شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا
مرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا

(عشرتِ تنہائی)

بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط
ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
دلداریٔ نسیمِ بہاراں لئے ہوئے
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے

(عیادت)

مجاز کی شاعری میں ایک طرح کی شبستانی لطافت ہے جس میں حسن وعشق کا جمال وجلال نظر آتا ہے۔ محبوب کی آمد کا ایک شعر میں یوں ذکر کرتے ہیں:

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آہی گیا

خوابوں کا یہ شہزادہ اپنی زندگی کے پچھلے دور کا خاصا رومانی تصور پیش کرتا ہے، ہر رومانی شاعر کے جذبات میں "جنت شوق" کے بعد "عذاب احساس" کا دور آتا ہے۔ اس دور میں وہ پوری حسرت کے ساتھ پیچھے مڑ کر اپنے دورِ زریں کو دیکھتا ہے:

جنت شوق تھی بیگانہ آفاتِ سموم
درد جب درد نہ ہو کاوشِ درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بے باک میں گردوں کے نجوم
بزم پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم
لیلیٔ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوتِ خواب آتی تھی

لیکن جلد ہی یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس فردوسِ تصور کو حقائق کے شعلے نگل لیتے ہیں اور پھر وہ تمام عمر ایک پرسوز لَے میں گاتا رہتا ہے، وہ خود اپنا نوحہ بھی بن جاتا ہے اور نوحہ گر بھی، وہ اپنی شکست کی آواز بن جاتا ہے ـــــ اور پھر وہ دور بھی آتا ہے جب اس کی آواز کی نغمگی ختم ہونے لگتی ہے۔ یہ ساز لرزنے لگتا ہے، ٹوٹنے کے لئے۔ مجاز اپنی "نوائے خستہ" اور "بربطِ شکستہ" کے اس دور میں بھی عام رومانی شاعروں کی طرح کسی قسم کی کلبیت یا تلخی میں مبتلا نہ ہوئے۔ اُن کے اندر آخر تک فریب کھانے کا حوصلہ رہا:

مجھ کو احساسِ فریبِ رنگ وبو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریبِ رنگ وبو کھاتا رہا

اس لحاظ سے مجاز فریب رنگ و بو کے شاعر ہیں (اور کون رومانی شاعر نہیں ہوتا) اس فریب رنگ و بو پردہ کبھی سوچ نہ سکے (اور جب افتادِ طبع یہ ہو تو سوچتا کون ہے) اس سوچ بچار کی کمی نے ان کی شاعری میں جذبے کی وہ عمومیت اور تہ داری پیدا نہ ہونے دی جو اچھی اور بڑی شاعری کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خاص ذہنی اور جذباتی عمر کے شاعر ہونے کی حیثیت سے نوجوانوں کے شاعر بنے رہیں گے، ان کے خوابوں میں ہزاروں نوجوان شریک رہیں گے۔ اُن کی شکست کے آئینے میں وہ اپنی شکست دیکھیں گے۔ یہی شرف کیا کم ہے؟ وہ اپنی زندگی میں ایک افسانہ بن گئے تھے، اُن کی موت نے اُن کی زندگی کی افسانویت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اُن کے دوست اور ہم سخن جذبی نے ان کی موت پر بڑے ہی پرسوز انداز میں کہا تھا:

آج اک جادۂ پرپیچ کا راہی گم ہے
اک حریفِ الم لا متناہی گم ہے
ایک سودائی تعمیرِ گلستاں مفقود
ایک آوارۂ طوفانِ تباہی گم ہے
اک دہکتا ہوا شعلہ نہیں میخانے میں
اک مہکتی ہوئی سرشار نگاہی گم ہے
حسن والوں کی جبینوں کا اجالا اوجھل
عشق والوں کے نصیبوں کی سیاہی گم ہے

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

منظر اعظمی

"اردو شاعری کا ہندوستانی لب و لہجہ"

جولائی ۸۰ء کے "ہندوستان ریویو" میں "ہندو اور اردو زبان و ادب" کے تحت ایک مضمون نگار نے بڑے تلخ انداز میں اردو زبان کے بارے میں تحریر فرمایا تھا کہ "زبان اردو ہندو کلچر اور تہذیب کی تخریب کاری اور تباہی اور مسلم برتری اور اقتدار کو ایک بار پھر حاوی کرنے کے سلسلے میں سرچشمہ کا کام کرتی رہی ہے.... اور اس میں بدیسی عناصر رہے ہیں اور ایک بدیسی اسپرٹ بھی شامل رہی ہے جس کا ذہن اور جس کا لب و لہجہ بھی بدیسی ہے جو ہندوؤں کے لئے بالکل غیر مانوس اور بسا اوقات بالکل ہی برعکس ثابت ہوا ہے"۔ —— زبان اردو کے بارے میں اندازِ نگارش کی یہ تلخی اس ذہن کی غماز ہے جس پر کچھ تاریخی غلط فہمیوں، کچھ سیاسی تعصب اور کچھ اپنوں کی غلط روشی کے تلخ اثرات کی چھاپ نظر آتی ہے اور اس مجموعی فضا کی بھی ترجمان ہے جو اردو زبان کے سلسلے میں اس کے مخالفوں نے بنا رکھی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو نے فارسی کے کامل اتباع میں اس ہندوستانی فضا اور مجموعی تاثر کو بھی مسموم کر لیا جس کے زیر اثر یہ زبان "ہندی" یا "ہندوی" کہی جاتی رہی۔ مگر یہ کہنا کہ بدیسی عناصر کے شامل ہو جانے سے یہ بدیسی ہو گئی ہے ایک لسانی و تمدنی اور تہذیبی ناانصافی ہے۔ اس لئے کہ تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک جو زبانِ اردو کی تعمیر و تشکیل کا دور ہے جہاں بھی ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے۔ اہل دہلی و نواحِ دہلی کی زبان کو جس پر زبانِ اردو کی بنیاد ہے زبان ہندی ہی کہا گیا ہے۔ ایسا اس لئے تھا کہ اس کی ساخت، اس کا مزاج اور اس کا لب و لہجہ سب میں ہندوستانیت رچی بسی تھی۔ اس لئے ہر شخص اس کو ہندی یا دیسی زبان ہی سمجھتا رہا۔ موجودہ ہندی ادب کی تاریخ میں ۱۹ ویں صدی سے پہلے کسی

کسی مخصوص زبان کا نام ہندی نہیں ملتا۔ بلکہ کبھی ہندوستانی زبانوں کو مثلاً گجراتی، سندھی، مراٹھی، بنگالی، آسامی اور پنجابی وغیرہ کو کبھی ہندی کہدیا گیا اور کبھی ان کے مخصوص جغرافیائی خطوں کے نام سے پکارا گیا مگر فورٹ ولیم کالج سے پہلے موجودہ ہندی کا وجود نہیں تھا بلکہ کھڑی بولی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، راجستھانی، اودھی، بھوجپوری اور ساگدھی وغیرہ کو ہی ہندی کہا جاتا رہا اور چونکہ اردو کھڑی بولی، برج بھاشا اور مشرقی پنجابی وغیرہ زبانوں سے مل جل کر اپنی تشکیل کر رہی تھی اس لئے لامحالہ اس کو بھی ہندی یا ہندوی ہی کہا جاتا رہا۔ اسی لئے مسعود سعد سلمان جو لاہور میں رہتے تھے۔ ان کے تین دیوان کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں سے ایک کو "بزبان ہندوی" کہا گیا ہے حضرت امیر خسرو بھی اپنے دیباچہ دیوان میں اپنے اردو کلام کو 'ہندوی' فرماتے ہیں۔ 'سیر الاولیاء' کے مصنف نے بابا فرید شکر گنج کے ایک قول کے متعلق لکھا ہے کہ "فرمود بزبان ہندی"۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر جو کتاب لکھی تھی اس کی زبان کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ 'ہندی' تھی۔ رقعات عالمگیری میں شاہ جہاں کے نام ایک خط میں اورنگ زیب نے لکھا ہے "آں فرمانِ عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است"۔ سکسینہ نے لکھا کہ 'میر اور مصحفی کے زمانے تک میں اردو کو بمقابلہ فارسی کے ہندی کہتے تھے جس سے ملک کی دیسی زبان مراد تھی۔ ان سارے شواہد سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اردو قطعی دیسی زبان تھی اس کا لب و لہجہ، اس کا مزاج، اس کی ساخت اور اس کے انداز و اظہار سبھی پر ہندوستانی مذاق کی چھاپ تھی۔ چند فارسی اور عربی کے الفاظ آجانے سے اسے بدیسی نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ فارسی اور عربی الفاظ کا آنا بھی ضروری تھا۔ اس سے زبان میں وسعت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں قدرت اور قوت پیدا ہوئی۔ کسی زبان کے دروازے جب دوسری زبانوں کے معقول اور خوبصورت الفاظ کے لئے بند ہو جاتے ہیں تو وہ زبان سکڑ جاتی ہے۔ سمٹ کر ایک محدود خانے میں بند ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے ذہن و زبان کی تختی سے کھرچ دی جاتی ہے۔

سنسکرت کی قیمتی اور قدیم کتابوں کے فارسی میں منتقل ہونے سے اردو زبان کے ہندوستانی

لب ولہجہ اور اس کی ہندوستانی فضا کی تعمیر پر بڑا اثر پڑا۔ مزید براں مسلمان بادشاہوں کی مذہبی رواداری اور سیاسی بے تعصبی بھی اس پر کافی اثر انداز ہوئی۔ ایک طرف اگر مسلمان شعراء اور ادباء نے سنسکرت برج، کھڑی بولی، اودھی اور بھوجپوری وغیرہ زبانوں میں دسترس حاصل کر کے قابل قدر خیالات کا اضافہ کیا اور امیر خسرو، فیضی، بدایونی، دارا شکوہ، خانِ خاناں، رسکھان، رحمٰن، تان سین، قطبن اور ملک محمد جائسی وغیرہ کے کارنامے بھلائے نہیں جا سکتے تو دوسری طرف اکبر کا بھی کبھی کبھی ہندی شعر کہنا، ابراہیم عادل شاہ کا ملکی حسابات کو بھی فارسی کے بجائے ہندی میں لکھنے کا حکم دینا زبان اردو پر ہندوستانی تہذیب و تمدن اور روایات کے اثر انداز ہونے کا باعث ہوا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ مسلمان بادشاہوں کے یہاں جو ہندو رانیاں تھیں ان کے اثر سے بھی اس وقت کی بنتی ہوئی زبان میں ہندوستانیت رچی بسی رہی۔ یوسف عادل شاہ کی بیوی بوبوجی، محمد قلی قطب شاہ کی محبوب بیوی بھاگ متی اور احمد نظام شاہ والیِ احمد نگر کی ہندو ماں نے اردو کے ہندوستانی مزاج کو بنانے اور سنوارنے میں براہِ راست نہ سہی بالواسطہ ضرور حصہ لیا۔ مزید براں ۔ ۔ ۔ صوفیاء کا عوام سے تبلیغی تعلق بھی زبان کی ہندوستانی فضا بنائے رکھنے میں معاون ثابت ہوا۔ اس عہد کے اشعار پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف الفاظ و تراکیب کا استعمال بلکہ ان کی روح، ان کی مجموعی فضا، ان کا لب و لہجہ اور ان کے پیچھے تہذیبی روایات کی پرچھائیاں قطعاً ہندوستانی ہیں۔ ان میں کہیں بھی فارسیت یا عجمیت کی چھاپ نظر نہیں آتی

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ + محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ (محمد قطب شاہ)

تیری پیشانی پہ ٹیکا جھمکتا + تماشہ ہے اجالے میں اجالا (عبداللہ قطب شاہ)

ساری سکھیاں نے مل کر کیا بے خطا دیا ہے + تجھ نازنیں موہن کی انکھیاں میں خط کا کاجل (ولی دکنی)

رات دن ہے پکار میں داؤد + جوں پپیہا پیا پیا تجھ بن (داؤد دکنی)

حضرت امیر خسروؒ کی کہہ مکرنیاں، انملیاں، پہیلیاں وغیرہ لاکھ ثبوت طلب سہی مگر ان میں جو ہندوستانی فضا پائی جاتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"تذکرۂ جلوۂ خضر" کے مصنف لکھتے ہیں کہ "زبان اردو انہی تینوں زبان (فارسی، عربی، ہندی) سے مل جل کر پیدا ہوئی۔ پہلے شعرائے اسلام نے جو فارسی کہتے تھے اور ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے جب ہندی کی طرف توجہ کی تو دوہرے، کبت وغیرہ کہنے لگے مگر شاہجہاں کے وقت میں جب زبان اردو نے ایک صورت پکڑی اور عالمگیر کے وقت میں ولی کا کلام دلی پہنچا اور شاہ گلشن خاں آرزو، مرزا بیدل اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے اِدھر توجہ کی تو اس کو بھی ہندی کا بچہ سمجھ کر دوہروں اور کبت کی روش پر ڈال دیا۔ چونکہ ان لوگوں نے زبان ہندی میں بہت کم فرمایا۔ اس لئے ان کے تعلیم یافتہ شعراء یا جن شعراء نے اردو زبان میں کہنا شروع کیا ان لوگوں نے کہ ہندی بھاکا کو خوب جانتے تھے ان میں ہندی کبیشروں کی ترکیب رکھی اور مضمون اور زبان فارسی عربی والوں کا لیا مگر سوائے وزن کے زیادہ تر دھان ومنبع ہندی پر رہا" (تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول از صفیر بلگرامی) اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اردو " اک بات سچری بزبان دکھنی تھی" اور اسے قلعے کی اردو کے موافق جس کو اردوئے معلّٰی کہا جاتا تھا۔ کہنے کی بات کہی جارہی تھی۔ یعنی اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ داخل کرنے کی سعی بلیغ کی جارہی تھی اور شاہ سعداللہ گلشن ولی دکنی کو مشورہ دے رہے تھے کہ "شما زبان دکھنی را گذاشتہ موافق اردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت ورواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی گردد"۔ اور دکن میں بولی جانے والی اردو کو دکنی اور دہلی اور نواح دہلی کی زبان کو بھاکا کہتے تھے۔ جیسا کہ مولانا محمد باقر ویلوری دکنی کا اپنی ایک تصنیف کے سلسلے میں یہ کہنا ثابت کرتا ہے کہ " ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں۔ بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا ہوں۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکنی زبان میں ہیں"۔ اس فرق کے باوجود اور اس کے باوجود بھی کہ اس وقت اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ داخل کرنا کارِ حسنات سمجھا جاتا تھا اس کی ہندوستانی فضا، اس کے ہندوستانی لب ولہجہ اور اس میں ہندوستانی ماحول کی چھاپ دھندلی نہیں ہوتی۔ بلکہ زبان میں رس، لچک اور حسن اور اس کی قوتِ اظہار میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اردو شعر و شاعری کے ہندوستانی لب و لہجے کی لے پر فارسیت ضرور چھائی رہی تھی مگر بقول سکسینہ میر و مصحفی کے زمانے تک اس پر ہندوستانی ماحول کی نقش گری صاف نظر آتی ہے۔ مختلف دوروں کے چند شاعروں کے اشعار دیکھیے۔ ان کے اشعار کے پس منظر میں جو تہذیب جھلکتی ہے وہ قطعاً ہندوستانی ہے۔

دل مرا تم کو تو لٹکا ہے دسہرے کی بتاں
فتح ہے سال بھر اس کی جو اسے لوٹے گا (قائم)

دوش کیا دیجئے چور کو قائم
بند گھر کا میں آپ در نہ کیا (")

سانولا مکھڑا، رسیلے نین، البیلی ہے چال
ایسے پیارے پر فغاں کیونکر نہ دیوانہ ہوں (فغاں)

مجھے کیا دیکھ کر تو تک رہا ہے
ترے ہاتھوں کلیجہ پک رہا ہے

خدا کے واسطے اس سے نہ بولو
نشے کی لہر میں کچھ بک رہا ہے (حاتم)

جس گھڑی گھورتے ہو غصہ سے
نکلے پڑتا ہے پیار آنکھوں میں (آثر)

دل جلوں کا ہے دل کی لاگ علاج
آگ کے جوں جلوں کا آگ علاج (")

کب تلک دھونی جمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا (میر)

ہر اشک کو مری مژگاں سے یہ علاقہ ہے
کہ جوں ستار کی کھونٹی سے تار باندھ دیا (مصحفی)

دل میں سما رہا ہے یوں داغِ عشق اپنے
جس طرح کوئی بھونرا ہووے کنول میں بیٹھا (انشا)

ثمر کیا آم کا ہے شاخِ مژگاں
ہمیشہ اشک کا ٹپکا لگا ہے (امانت)

تیرے مریضِ لب کی دوا جب تلاش کی
گولر کا پھول باغ میں عناب ہو گیا (بحر)

نہ سمجھا تھا کہ ان طوقوں میں پھر مجھ کو پھنساؤ گے
کروگے چوڑیاں ٹھنڈی تم آکر میرے مدفن پر (نامعلوم)

اس طرح سے کتے کی آواز سے شگون لینا، دھونی رمانا، آسن مار کے بیٹھنا، دریا میں نہانا، گرہن دان دینا، ماتھے پر صندل لگانا، بسنتی کپڑے پہننا، گلال اڑانا، عنقا کی بجگہ گولر کے پھول کو استعمال کرنا، گھی کا چراغ جلانا، تیجا کرنا، رخصت کے وقت پان دینا، ملہ کر پانی پینا، نشانی کا چھلا دینا، چوڑیاں پہننا، شوہر کے مرنے پر چوڑیاں ٹھنڈی کرنا اور اس طرح کے

وہ سرے الفاظ وتراکیب اپنے اندر ایک ہندوستانی فضا، یہاں کے ہندو اور مسلمان گھرانوں کے رسم ورواج کا پس منظر اور ایک زبردست ہندوستانی لب ولہجہ رکھتے ہیں۔ یہ انداز کسی بدیسی زبان کے نہیں ہو سکتے۔ یہ ساری کا فرادائیاں تو کسی اپنی ہی زبان کی ہو سکتی ہیں۔ یہ فضا نہ صرف غزلوں میں بلکہ اردو شاعری کی تمام اصناف میں پائی جاتی ہے۔ مثنویوں میں بھی قصے، طور طریقے، اشخاص وکردار سب سے ہندوستانیت ٹپکتی ہے اِلّا ماشاء اللہ۔ صاحب شعر الہند لکھتے ہیں کہ "اردو مثنویوں میں سب سے زیادہ مشہور مثنوی بدر منیر ہے اور اس میں ناچ رنگ کے جلسے، گانے بجانے کے ٹھاٹھ، باغوں اور ہر قسم کی محفلوں کے سے سواریوں کے جلوس، مکانوں کی آرائش، شاہانہ لباس اور جواہرات اور زیورات وغیرہ کا بیان بالکل ہندوستانی طریقے کے موافق کیا گیا ہے۔" ایک مثنوی کے چند شعر دیکھئے۔

پرستاروں نے یہ اس کو بنایا   جہاں میں حور جنت کر دکھایا
گجھوری گوندھی وپاکیزہ چوٹی   کہ سب اہل نظر کی جان لوٹی
جو ٹیکا اس کے ماتھے پر لگایا   قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا
جب اس کے کان میں پہنایا جھمکا   پریشاں ہو گیا عقد ثریا
پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا   وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں دمکا

بہت اس کے سوا بھی اور گہنا
مناسب جس جگہ تھا اس نے پہنا

میر آثر کی مثنوی "خواب وخیال" کے الفاظ وتراکیب وتشبیہات اور اس کے نیچے ہندوستانی فضا کو درج ذیل چند اشعار میں دیکھئے۔

مانگ موتی سے بھری دے ہے بہار   جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار
ناک ہے یا کہ ایک توتا ہے   چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
کبھی جاتی نہیں کمر کی لچک   پانی پیتے نے کب یہ ایسی لیک
ہے شب ماہ دل پہ یوں پیارے   جیسے کوڑھی کو چاندنی مارے

یوں سیہ مست جھولے آتے ہیں   مست جوں ہاتھی ہولے آتے ہیں
ہر طرف آن کے مچاویں دھوم   جس طرح مکھیاں کریں ہیں ہجوم
اب جو دانتوں کی باتیں چلیاں ہیں   کیا کہوں موتیا کی کلیاں ہیں

یہ یہاں تک ہوا کہ مرثیے جن میں عموماً واقعات کربلا اور اشخاص واقعۂ کربلا کا ذکر اور ان کی خصوصیات اور عورتوں کے بین وغیرہ کو بیان کیا جاتا ہے ان میں شان ہندوستانی ہی ہے۔ ہندوستانی فضا اس طرح رچی بسی نظر آتی ہے کہ یہی بعض معترضین مرثیہ کے نزدیک اس کی خامی ہو جاتی ہے۔ بقول مولانا عبد السلام ندوی کے "مراثی میں جو واقعات مرقوم ہوئے ہیں ان کا تعلق اگرچہ تمام تر عرب سے ہے لیکن ان میں بھی ہندوستانی شان علانیہ نمایاں ہے۔ مثلاً ہمارے مرثیہ گویوں نے اہل حرم کے عادات اور مراسم شرفائے ہندوستان کی مستورات کے مطابق فرض کئے ہیں اور شادی و غمی کے متعلق جس قسم کے مراسم و عادات یہاں جاری ہیں وہی تمام مرثیوں میں مذکور ہیں۔" اس عجمی فضا اور تاثر کے خلاف جذبہ یہاں تک تھا کہ "آغا جو اشرف تلمیذ آتش نے فارسی زبان کے وہ تمام الفاظ چھوڑ دیئے تھے جن پر عاشقانہ اور رندانہ مضامین کی بنیاد قائم تھی" (شعر الہند)

بلاشبہ فارسی اور عربی کے الفاظ داخل کرنے اور ہندی کے الفاظ خارج کرنے کا کام اصلاحِ زبان کے نام پر آہستہ آہستہ ہوتا رہا اور بیچ بیچ میں ایسے شاعر بھی ہوتے رہے جنہوں نے اردو کی ہندوستانی فضا برقرار رکھی مگر دھیرے دھیرے ناسخ کے عہد تک ایسا کیا گیا کہ اسے بالکل مریا ایرانی بنا لیا گیا جس سے اہل فارس بھی کسی حد تک محظوظ ہونے لگے بقول میر

"تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے   سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ"

ولی کو شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے سے قبل دکنی اردو قطعاً ہندوستانی فضا لئے ہوئے تھی مگر شاہ صاحب موصوف کے مشورے سے ولی دکنی نے فارسی الفاظ و تراکیب استعمال کرنا شروع کر دیا مگر اس کے باوجود ہندی لفظ بھی فارسی کے ساتھ جا بجا ملتے ہیں جو بعد میں متروک ہونے لگے۔ یہی حال امیر خسرو کے یہاں بھی ہے مگر بقول رام بابو سکسینہ "امیر خسرو کے یہاں بعض شعر

ایسے بھی ہیں جس میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو بشکل اردو کہے جا سکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال ہوئے ہیں۔ شعرائے عالمگیری میں موسوی خاں فطرت، مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا عبدالغنی قبول اور محمد شاہی عہد تک کے شعراء مثلاً قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں اور شاہ سعداللہ خاں گلشن وغیرہ اگرچہ فارسی کے شاعر تھے مگر منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اردو میں بھی شعر کہہ لیتے تھے جس کی فضا سوائے دو چار الفاظ فارسی کے آجانے سے قطعاً ہندی اور ہندوستانی ہوتی تھی۔ حاتم، تاجی، یکرنگ، مضمون اور آبرو وغیرہ تک آتے آتے "گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکنی شعراء کے ان میں زیادہ ہے۔ مقامی رنگ گو کہ بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ہندی دوہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے" (سکسینہ) مرزا مظہر جانِ جاناں، میر، درد، سوز، قائم، یقین، بیان، ہدایت، قدرت، تاباں اور ضیاء وغیرہ کے زمانے میں بھی اگرچہ فارسیت کا غلبہ ہوتا جاتا ہے مگر اشعار سے جھانکتی ہوئی تہذیبی فضا قطعاً ہندوستانی ہوتی ہے اسی بیچ میں خالص ہندوستانی شاعر نظیر اکبرآبادی کا بھی غلغلہ بلند ہوتا ہے مگر فارسیت اور ایرانی تہذیب و شرافت کچھ ایسی غالب ہوتی جاتی ہے کہ انھیں شاعر تسلیم کرنے میں بھی لوگوں کو عار آتا ہے۔ اثر، حسن، جرأت، انشاء، مصحفی، ناسخ، آتش، حسرت اور رنگین کے عہد تک آتے آتے ہندی کے اچھے برے سبھی الفاظ چن چن کر خارج کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور ظفر تک اس کا تہذیبی پس منظر بھی عجمی دھندلکوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس اصلاحی کوشش میں اگرچہ کم و بیش سبھی کا حصہ رہا مگر حضرت ناسخ نے اصلاح کے پردے میں جو فارسیت داخل فرمائی اس نے زبان اردو کو فارسی کا بالکل چربہ بنا کے ڈال دیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ "میر و مرزا نے زبان کی اصلاح کا کوئی ضابطہ اور دستور العمل نہیں بنایا تھا لیکن ناسخ نے شعر و سخن کے متعلق نہایت متشددانہ اصول اختیار کئے اور قدماء کی بعض ترکیبیں اور ایسے الفاظ بھی متروک قرار دیے جن کا وہ نعم البدل تو کیا بدل بھی پیدا نہ کر سکے"۔ اور بقول سکسینہ کے بعض ہندی اور بھاشا کے لفظ جو خارج کئے گئے بدنما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک ان کی متحمل بھی

نہ ہو سکتی تھی مگر ان کے یک قلم نکال دیئے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچا۔ ؛ یا جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اردو کے قبضے میں ایک عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے فارسیت کے غلبے سے اب خارج ہو گئے" (تاریخ ادب اردو)۔ زبان میں لین دین تو ہوتا ہی ہے۔ بغیر اس کے کسی زبان میں حسن و رعنائی، وسعت و عالمگیری اور . . . ۔ اظہار و ابلاغ کی قوتیں پیدا نہیں ہوتیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسری متمدن قوموں اور ترقی یافتہ زبانوں کا اتنا اثر اپنے اوپر ڈال لیا جائے کہ اپنی زبان کو اپنے ملک کے سرمائے، اس کی خصوصیات اور ملکی رسم و رواج سے بیگانۂ محض بنا دیا جائے۔ انکھیاں، من، کال، پیا، ساجن، سنسار، درشن، جگ، درس، درپن، تن من، گلنا، جی، پرے، مہندی کے رنگ، بن کہے، تیرے بن، ہاتھ یا پاؤں پھیلانا، ڈلک، بکھرنا، تڑک جانا، چھب، چھاتی بھر آنا اور جھمکا وغیرہ ایسے الفاظ ہیں کہ جن کو متروک قرار دینے سے اردو کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ حالانکہ ان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو نثر میں اب بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور بدلے ہوئے حالات کے تحت اشعار میں بھی لوگ استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ نظیرؔ اکبر آبادی نے جس ہندوستانی فضا کو اپنی نظموں میں پروان چڑھایا اسے بدیسی کہنے کی آج تک کسی میں جرأت نہ ہو سکی۔ اصل میں بے چارے الفاظ کے انتخاب اور اس کے استعمال میں چوٹ کھا گئے اور رطب و یابس سب کچھ بھر دیا۔ اس ناہمواری اور کھردرے پن نے ان کے دامن شاعری کو بھی نوچ ڈالا اور عجمی فضا میں پروردہ فارسی داں شعرائے اردو اور فارسی زدہ تذکرہ نگاروں نے ان کے فنی مرتبے کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن میرؔ کی شعری خدائی میں الفاظ کے انتخاب و استعمال ہی نے استقامت کی جلوہ گاہیں بخش دیں اور ان کی غزلوں کی سلطنت کی سبھی ہندوستانی زبانیں خراج گذار ہو گئیں۔ اور ان کے تذکرہ نگاروں کو بھی جا بجا ان کے کچھ اشعار کی پستی پر ناگواری کا احساس ہوا مگر "پستش بغایت پست بلندش بغایت بلند" کہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرؔ اپنے عہد کی "اصلاحِ زبان" سے متاثر نہیں ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں فارسی کی تبعیت پر انھیں مسرت سی محسوس ہوتی ہے اور

بسے عزت کہتے ہیں کہ "مارسے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ" - مگر مجموعی طور پر ان کے یہاں ہندی کے ایسے خوبصورت، سبک اور پیارے الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ اشعار کی ہندوستانی فضا مسموم نہیں ہونے پاتی۔ فارسی الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں بھی انھوں نے کافی حسنِ انتخاب سے کام لیا ہے۔ اور ظاہر ہے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان جو انھوں نے استعمال کی ہے ہندوستانی ہی ہو سکتی تھی۔ شعر کا خواص پسند ہونا اس کی آفاقیت اور عالمگیری پر دلالت کرتا ہے مگر "مجھے گفتگو عوام سے ہے" کہنے والا ان کے رسم ورواج، ان کی تہذیب اور ان کی تمدنی قدروں کو پس منظر میں لائے بغیر کبھی کے دل ودماغ پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ میر نے جو زبان استعمال کی ہے اس پر کم سے کم منافقت کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں خلوص اور سادگی ہے۔ بات کا فطری انداز ہے۔ ان کی زبان مبالغے کی زبان نہیں ہے۔ میر نے اپنی مثنوی "در جشن ہولی" میں ہندوستانی فضا اور ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے یہ سب کچھ اپنی اور اپنے اُس ماحول کی بات کہی ہے جس سے وہ نامانوس نہیں۔ "مثنوی اعجازِ عشق" میں نل دمن کی ہندوستانی داستان محبت کو پیش کرنا بھی ان کی شاعری کے ہندوستانی لب ولہجے کی دلیل ہے۔ ایک معمولی نگاہ میں بھی میر کے اشعار سے ایسے الفاظ چنے جا سکتے ہیں جو خالص ہندوستانی فضا کی پیداوار ہیں اور جن کو میر نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ الجھاؤ، جنجال، ماٹی، ٹھور ٹھکانہ، تنک، جھوٹے بھی نہ پوچھنا، دوپہر کا رونا، کان دینا، موتی پرونا، ٹک آنکھ لڑانا، جی، سدھارنا، دھوم، سناٹا، دھونی رمانا، آسن، پوجنا وغیرہ۔ ایک شعر دیکھئے۔

پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو
اب کس طرح اطاعت ان کی کروں خدایا

میر کو جس چیز نے شعری بلندی عطا کی وہ یہی ان کی سادگی اور خلوص اور ہندوستانی لب ولہجے کی حلاوت پر ان کا ایمان ہے۔ میر کے یہاں جو سوز وگداز، دردمندی، آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی

ان اشعار میں جو شعریت پائی جاتی ہے وہ بھی انھیں خوبصورت ہندوستانی الفاظ کے خوبصورت استعمال ہی کی وجہ سے ہے۔ ایک شعر اور دیکھئے۔

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

یہاں پر لفظ 'دھوم' کے استعمال نے شعر کو جو رعنائی اور اثر بخشا ہے کسی اور لفظ کے استعمال سے وہ چیز نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اور یہ لفظ اپنی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے قطعاً ہندوستانی ہے۔ میر کا یہ اندازِ شعر اور ان کے لب ولہجے کی یہ لے بعد کے شعراء نے برقرار نہیں رکھی خصوصاً ناسخ نے جو مہم شروع کی اس نے اور غالب نے جو ان کی قابلیت کے معتقد تھے اس لب ولہجے پر عجمی اور ایرانی لے کو غالب کر دیا اور اس کوشش میں چونکہ غالب کی فلسفیانہ تخئیل، گہرائی اور گیرائی اور ان کی پوری ذہنی صلاحیتیں شامل تھیں اس لئے بعد کے آنے والے شعراء کے لئے یہی مشعلِ راہ بن گئی۔ غالب میر کے معتقد تھے مگر ناسخ کے واسطے سے۔ اور بجائے میر کا انداز اختیار کرنے کے وہ ناسخ کی مہم کے سرخیل بن گئے۔ اس کی وجہ چاہے یہ رہی ہو کہ وہ جس ماحول کے پروردہ تھے اور ان کو جو اہلِ علم ساتھی میسر آئے وہ سب فارسیت کے قائل تھے اس لئے ان کی شاعری میں ہندوستانی لب ولہجہ برقرار نہ رہ سکا۔ عجمی تسلط کی وجہ سے ان کے اشعار ہندوستانیوں کے لئے نامانوس ہو گئے۔ میر کی بزرگی کا اعتقاد اپنی جگہ پر مگر اس اعتقاد کو عملی شکل نہیں دی گئی۔ غالب نے مرزا صائب اور بیدل کی پیروی کی اور مجموعۂ اردو کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اردو شاعری میں میر کے بعد غالب ہی وہ دیو قامت شاعر ہیں جو اس میں انقلابی تبدیلیاں لاسکتے تھے۔ اگر وہ اس کو ہندوستانی بنانے کی طرف توجہ کرتے تو آج اردو پر یہ الزام نہ دھرا

جاسکتا کہ اس کا ذہن اور اس کا لب ولہجہ بھی بدیسی ہے"۔ غالب شیفتہ کی طرح اس فن شریف کو
خواص کے لئے مخصوص سمجھتے تھے۔ ان کے شعر خواص پسند ضرور تھے مگر انھوں نے کبھی عوام سے
گفتگو نہیں کی۔ اس سے نہ صرف اردو کی اجنبیت بڑھ گئی بلکہ اس میں تصنع بھی پیدا ہو گیا۔ اور اس کی
فطری ترقی جس طرح ہو سکتی تھی وہ نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ لوگ جھوٹ بول رہے
ہوں۔ سچائی کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ اسی وجہ سے اس میں سادگی، اصلیت اور فطری جوش
مفقود ہو گیا۔ جس کا احساس حالی کو شدت سے تھا اور جسے انھوں نے اپنے حالات کے دباؤ
کے تحت پھر سے ابھارنے کی کوشش کی اور اس میں خاصے کامیاب بھی رہے۔ حالی نے
اپنے اس نظریۂ شعر کے تحت جو انقلابی نظمیں کہیں ان میں جوش، سادگی اور اصلیت بھرپور
ہے۔ اسی لئے بے نمک کی کھچڑی ہونے کے باوجود یہ صحتمند اور پرکشش ہے۔ اس میں جو اثر ہے وہ
اس مبالغہ آمیز اور فارسی زدہ شاعری میں نہیں ہے۔ "برکھا رت"، "مناجات بیوہ" اور "چپ کی
داد" میں جو ہندوستانیت ہے وہ اردو کی غالب زدہ شاعری میں قطعاً نہیں۔ اور اسی لئے مولوی عبدالحق
نے اس زبان کے بارے میں گاندھی جی سے سفارش کی تھی کہ اسے ہندوستان کی سرکاری زبان بنا لیا
جائے۔ اگر اردو شاعری کی یہ ہندوستانی فضا اور اس کی یہ لے برقرار رہتی تو حالات آج کچھ سے
کچھ ہوتے مگر افسوس یہ ہے کہ ایسا نہ ہو سکا اور غالب اور ان کے ہم نواؤں نے اردو شاعری کے
جو جھاڑ فانوس جلائے اس کے سامنے حالی کا یہ دیا نہ ٹک سکا۔ حالی کے جلائے ہوئے اس دیئے
میں اسماعیل میرٹھی نے تیل بتی ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ بچوں اور نصابی کتابوں کے شاعر ہو کے
رہ گئے۔ پھر عظمت اللہ خاں نے ہندی گیتوں اور نظموں کے ذریعہ اس کو ابھارنا چاہا مگر وہ غزل
کی گردن ہی کو بے تکلف مارنے میں الجھ کے رہ گئے۔ چکبست نے حب وطن اور وطن کے ہر ذرہ
کو دیوتا بنا کر اس کی فضا کو ہندوستانی بنانا چاہا مگر زبان انھوں نے غالب ہی کی مستعار لی۔ اقبال
نے وطن کے ترانے گائے مگر وہ اتنے بڑے فلسفی تھے کہ اردو زبان ان کے اظہار کے لئے
تنگ معلوم ہوئی اور وہ فارسی زبان کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ غالب کے بعد اقبال کی دیوتائی

ہی میر کی ہندوستانیت کو ابھار سکتی تھی مگر وہ زبان کو ثانوی چیز سمجھتے رہے۔ اس لئے اپنی "پیامبری" کے لئے زبان کی حدود میں رہنا پسند نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعراء نے شاعری میں اشتراکیت اور بین الاقوامیت پیش کرنے کی کوشش زیادہ کی اس کو ہندوستانی بنانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ آزادی کے بعد اردو شاعروں کو اس کا احساس ضرور ہوا اور انھوں نے میر کا انداز، میر کی روایات اور اس کی ہندوستانی فضا کو اجاگر کرنے کی کوشش ضرور کی مگر اسے منظم نہ کر سکے۔ آرزو لکھنوی کی "سریلی بانسری" مست کر دیتی ہے اور ہندوستانی ماحول میں پہونچا دیتی ہے جیسے کہ انشا کی "رانی کیتکی اور اودے بھان" پہونچا دیتی ہے مگر اس طرح کنکریاں مارنے سے غالب اور ناسخ کے جگائے ہوئے ہاتھی پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ فراق نے البتہ اردو شاعری کو ہندوستانی لب و لہجہ دینے کی کوشش کی مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس زبان میں خلوص اور سچائی پیدا کی جائے اور پھر اسے وہی جامع مسجد اور چاندنی چوک والی اردو بنانے کی کوشش کی جائے جو خواص پسند ضرور ہو مگر عوام سے گفتگو کرتی ہو۔ اردو زبان میں بے پناہ صلاحیت ہے، اِسے اپنی صلاحیت سے کام لینے کا موقع دینا چاہیئے۔

"عنوان چشتی صاحب ایک اچھے غزل گو ہیں وہ غزل کی نشتریت ہی کے قائل نہیں ہیں اُس حُسن نزاکت کے بھی قائل ہیں جو پھول کی پتّی کی طرح ہیرے کے جگر کو کاٹ دیتی ہے اور اپنی غزل میں یہ حسن انھوں نے مترنم بحروں، شگفتہ قافیوں اور ہلکی پھلکی زبان کے ذریعہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"
(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی

ذوقِ جمال

(عنوان چشتی کی غزلوں کا معیاری انتخاب)

کتابت و طباعت معیاری۔ کاغذ بہترین۔ مجلّد مع رنگین گرد پوش

قیمت صرف ۳ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

سید احتشام احمد ندوی

فن جرح و تعدیل
(محدثین کا ایک عظیم کارنامہ)

علمائے حدیث نے سند کے ساتھ روایت کا ایسا علمی اور صحیح طریقہ ایجاد کیا کہ جس میں شبہ کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ ہر مسئلہ میں کہنے والے تک متصل سند کا طریقہ ایسا عصر عباسی میں رائج ہوا کہ تمام ادبی، علمی اور تاریخی کتابیں اسناد سے پُر ہیں۔ ایک نسل دوسری نسل سے بالکل متصل اسناد کے ساتھ اس طرح روایت کی عادی ہوگئی کہ کذب کے امکانات اس صورت میں بہت کم رہ گئے جب کہ راوی صحیح ہوں۔ مثلاً ہم کو بخاری کی صحت میں کوئی شبہ نہیں اس لئے کہ اس کو صحیح و ثقہ راویوں کے حوالہ سے متصل سندوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایسا علمی امتیاز ہے جو دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہیں۔ اس طرز کا علمی اور یقینی طریقہ نہ تو کسی قوم کی جماعت علماء میں موجود ہے اور نہ کسی قوم کی مذہبی کتابوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ بعض جدید مؤرخین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اخبار و روایات کی صحت کا اس سے بہتر کوئی علمی طریقہ موجود نہیں۔

سند حدیث کے سلسلہ میں راویوں کے حالات ان کی عدالت و ثقاہت اور کذب و نسیان کو معلوم کرنا اور انھیں بنیادوں پر ان پر تنقید کرنا محدثین کے یہاں ایک ضروری علم قرار پایا جس کو "علم جرح و تعدیل" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ علم راویوں کو پرکھنے کے لئے وجود میں آیا جس میں محدثین کے غیر معمولی التفات کو دخل ہے جو ان کو راویوں کی جانب تھا وہ اپنے معاصرین کے احوال سے تو خود واقف تھے مگر ان راویوں کے حالات جو گذر چکے تھے جد و جہد کر کے دوسروں سے دریافت کرتے تھے۔ راویوں کے بارے میں وہ اپنی رائے کو بلا کسی تذبذب کے

عمل کر ظاہر کرتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے نزدیک خدا کے دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مدافعت تھی۔

راویوں کے بارے میں تنقید کا طریقہ بہت ابتدائی دور سے نظر آتا ہے۔ اس کا مقصد کبھی راوی کی ثقاہت کو پختہ کرنا ہوتا ہے اور کبھی اس کی کمزوریوں کو نمایاں کرنا۔۔ تابعین اور اور ان سے متصل زمانہ میں یعنی دوسری صدی ہجری میں جو علماء جرح و تعدیل نظر آتے ہیں ان میں معمر (۱۵۳ھ) ہشام دستوائی (۱۵۴ھ) اوزاعی (۱۵۴ھ) ثوری (۱۶۱ھ) حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) اور لیث بن سعد بہت ممتاز ہیں۔ ان لوگوں کے بعد ایک دوسرا طبقہ سامنے آتا ہے جس میں ابن مبارک (۱۸۱ھ) فزاری (۱۸۵ھ) ابن عیینہ (۱۹۷ھ) اور وکیع بن الجراح (۱۸۷ھ) شامل ہیں۔ اس طبقہ میں سعید بن قطان (۱۸۹ھ) اور عبدالرحمان بن مہدی (۱۹۸ھ) علماء حدیث میں ممتاز اور جرح و تعدیل کے ماہر گذرے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے جن احادیث کو صحیح قرار دیا ان پر امت نے اعتماد کیا اور جن کو ضعیف قرار دیا ان کو تسلیم کیا۔ اس طبقہ کے بعد یزید بن ہارون (متوفی ۲۰۶ھ) ابوداؤد الطیالسی (۲۰۴ھ) عبدالرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ) اور ابوعاصم النبیل ابن مخلد (۲۱۲ھ) نے بحیثیت علماء جرح و تعدیل کے شہرت حاصل کی۔

یہ ان علمائے جرح و تعدیل کا ذکر تھا جنھوں نے اس موضوع پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ اگرچہ ان کے اقوال جستہ جستہ دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔ اب تصنیف و تالیف کا دور آتا ہے اس دور میں یحیی بن معین (۲۳۳ھ) احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) محمد بن سعد کاتب الواقدی صاحب طبقات متوفی (۲۳۰ھ) اور علی بن المدینی (۲۳۴ھ) ممتاز علماء حدیث میں تھے۔

مذکورہ حضرات کے بعد محدثین کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے جس میں امام بخاری، امام مسلم، ابوزرعہ، ابوحاتم اور ابوداؤد السجستانی علم جرح و تعدیل میں امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ساتویں صدی ہجری تک برابر علمائے حدیث راویوں کی جرح و تعدیل میں مصروف رہے حتی کہ کوئی ایسا راوی ملنا مشکل ہو جائے گا جس کا احادیث کی کتابوں میں ذکر آیا ہو اور اس پر جرح و تعدیل

کتابوں میں بحث نہ کی گئی ہو۔ جرح وتعدیل کی کتابوں میں ایک ایک راوی پر مفصل بحثیں موجود ہیں۔

علم جرح وتعدیل کی کتابیں تین طرح کی ہیں:

۱۔ وہ کتب جو صرف ثقات کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۲۔ دوسری قسم کتابوں کی وہ ہے جو ضعیف راویوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۳۔ تیسری قسم ایسی کتابوں کی ہے جن میں صحیح وضعیف دونوں طرح کے راویوں پر کلام کیا گیا ہے۔

ابن حبان نے کتاب الثقات لکھی۔ ابن قطلوبغا (۸۷۹ھ) نے چار جلدوں میں "الثقات" تالیف کی۔ خلیل بن شاہین کی "الثقات" بھی قابل ذکر ہے۔ بخاری، نسائی، ابن حبان، دارقطنی، عقیلی، ابن جوزی اور ابن عدی نے ضعیف راویوں پر الگ کتابیں لکھیں، امام بخاری نے ضعیف وثقہ دونوں طرح کے راویوں پر تین کتابیں لکھیں۔ تاریخ الکبیر حروف معجم کے لحاظ سے مرتب کی الاوسط اور الصغیر سنہ کے اعتبار سے۔ ان کتب کے علاوہ کتاب الجرح والتعدیل مؤلفہ ابن حبان اور جرح وتعدیل مؤلفہ ابن ابی حاتم بھی مشہور ہیں۔ اس فن میں الطبقات الکبری مؤلفہ ابن سعد بھی اچھی کتاب ہے لیکن سب سے بہترین اور ثقہ وضعیف راویوں کے حالات پر محیط کتاب "التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل" حافظ ابن کثیر کی ہے۔

علمائے جرح وتعدیل کے اصولوں میں باہم بہت فرق ہے۔ بعض بہت سختی سے کام لیتے ہیں۔ بعض اپنی تنقیدوں میں معتدل ہیں اور کچھ علماء بہت نرمی برتتے ہیں۔ متشددین میں ابن معین، قطان، حبان اور ابوحاتم ہیں۔ معتدل ناقدین حدیث میں امام احمد، بخاری اور مسلم ہیں۔ نرمی برتنے والوں میں ترمذی، حاکم اور ابن مہدی وغیرہ ہیں۔ یہی بنیادی سبب ہے کہ علماء کی رائیں ایک ہی راوی کے بارے میں مختلف ہوگئی ہیں۔ ہر ناقد اپنے متعین کردہ اصولوں کی روشنی میں حدیث کو پرکھتا ہے مثلاً ایک ناقد اس راوی کو قبول نہیں کرتا

جس نے زندگی میں ایک بار بھی جھوٹ بولا ہو دوسرا اس شرط پر اس کی حدیث قبول کرلیتا ہے جب کہ اس کی توبہ ثابت ہو جائے ۔

احادیث کے راویوں کے تنقید کے اصولوں میں اس اختلاف کا اصل مظہر فقہائے امت کے اختلافات ہیں، محدثین اور امام ابوحنیفہ کے اختلافات میں بھی انھیں اصول تنقید کو دخل ہے ۔

احادیث کے اصول تنقید کے اختلافات کی وجہ سے علمائے حدیث نے طے کر دیا ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ کوئی ناقد اپنے خیال یا اصول کی حمایت میں کسی حدیث کو مجروح قرار دیدے لہٰذا وہی جرح قابل اعتنا ہوگی جس میں حدیث کے مجروح ہونے کے اسباب کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہو۔ حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ جرح اس کی قبول کی جائے گی جو اس کو پوری شرح وبسط سے پیش کرے ۔

(ملخص از السنۃ مصنفہ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی)

ماہنامہ جامعہ کی تاریخ اشاعت

ماہنامہ جامعہ معمولاً ہر ماہ کی ۵ یا ۶ تاریخ کو پوسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی خریدار کو کوئی شمارہ نہ ملے تو اسی مہینے میں اطلاع فرما دیں۔ شکایتوں کی تعمیل مقررہ تاریخوں میں ہی کی جائے گی ۔

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

The Monthly
APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
SYRUP
for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
THE

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۴ | بابت ماہ نومبر ۱۹۶۶ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب
ڈاکٹر سلامت اللہ
ڈاکٹر سید عابد حسین
ضیاء الحسن فاروقی

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ضیاء الحسن فاروقی

یونانی تہذیب کا پھیلاؤ

(ارسطو اور سکندر کے بعد)

سکندر اعظم کی قیادت میں مقدونیہ کے عروج سے یونانی دنیا کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، اب شہری ریاستوں کا زمانہ ختم ہوتا ہے، اُس فلسفے اور علم کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے جو شہری ریاستوں خصوصًا ایتھنز کی تہذیبی ترقی کی بنیاد تھی، ادب اور فن کا وہ نشاط ختم ہوجاتا ہے جو ایتھنز کی جمہوریت اور آزادی کی دین تھی، اب یونانی تہذیب پھیلتی ہے، متاثر ہوتی ہے اور متاثر کرتی ہے ایشیا اور افریقہ کے اُن علاقوں کو جنھیں یونانی جاہل غیر ملکیوں کا علاقہ کہتے تھے، حیرت ہوتی ہے کہ فلسفے اور علم کی عظیم الشان ترقی کے باوجود یونانیوں کا دامن تہذیبی برتری کے اس شرمناک احساس سے پاک نہیں تھا جو انسانوں کو "مہذب" اور "جاہل" کی اصطلاحوں میں تقسیم کرتی ہے، حالانکہ یونانیوں نے خود ایک زمانے میں انھیں علاقوں سے علم وحکمت کی روشنی حاصل کی تھی۔

یونانی تہذیب کے پھیلاؤ کے اس زمانے کو "ہیلینی عہد" کہا جاتا ہے، یہ عہد شروع ہوتا ہے مقدونی غلبہ سے اور ختم ہوتا ہے کلیوپیٹرا کی موت کے بعد مصر پر رومیوں کے قبضہ سے۔ سکندر نے کوئی دس سال کی مختصر مدت میں، ایشیائے کوچک، شام، مصر، بابل، ایران، سمرقند، باختر اور پنجاب کو فتح کر لیا اور اپنی عظیم شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی۔ سکندر کی شخصیت عجیب و غریب تھی، اُس کی رگوں میں فلپ کا خون تھا اور اسے اپنی ماں پر بھی ناز تھا جو اپنے آپ کو

اچیلیز کے خاندان کا بتاتی تھی۔ اُس نے جب ایشیائے کوچک پر یلغار کی تو یہ محسوس کیا کہ وہ اُس کام کی تکمیل کر رہا ہے جو اُس کے اجداد نے ٹرائے (Troy) میں شروع کیا تھا، اپنی فتوحات کے دوران اس نے ایلیڈ کی وہ جلد کبھی اپنے سے جدا نہیں کی جس پر ارسطو کے تشریحی نوٹ تھے، رات میں یہ کتاب اُس کے خنجر کے ساتھ تکیہ کے نیچے رکھی جاتی تھی، یہ دونوں چیزیں گویا علامت تعین مقصد اور حصول مقصد کے وسیلے کی۔

ارسطو سکندر کا اتالیق رہ چکا تھا، فلپ کی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا فلسفہ کا علم حاصل کرے، تاکہ اس سے وہ بہت سی باتیں سرزد نہ ہوں جو وہ خود کر چکا تھا اور جس کا اُسے افسوس تھا، سکندر فلسفی تو نہ بن سکا لیکن وہ ایک حد تک "یونانی" ضرور بن گیا، وہ یونانی ادب کا قدردان تھا اور یونانی تہذیب پر رشک کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ رنگ و نشاط کی ایک محفل میں اُس نے دو یونانیوں کو جو اس محفل میں شریک تھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اس وقت تم ان مقدونیوں کے درمیان بیٹھے ہو، کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ وحشیوں کے درمیان تم دونوں نیم دیوتا کی مانند ہو۔" سکندر عالموں اور فنکاروں کی صحبت پسند کرتا تھا اور دن بھر کی شمشیر زنی کے بعد جب اسے رات میں کچھ سکون ملتا تھا تو عالموں سے تبادلۂ خیالات کرتا تھا، سائنسی تحقیقات کی وہ ہمت افزائی کرتا تھا اور اس پر وہ کافی رقم خرچ کرتا تھا۔ شاید ارسطو کی تجویز پر دریائے نیل کے منبعوں کا کھوج لگانے کے لئے اس نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ سکندر میں کمزوریاں بھی تھیں اور خوبیاں بھی، تاریخ نے ان کمزوریوں اور خوبیوں سے متعلق بہت سی داستانیں اور واقعات محفوظ کر لئے ہیں۔ یہاں انھیں بیان کرنا موضوع سے دور جانا ہوگا، اس کی فتوحات کی کہانی بھی دلچسپ ہے لیکن اس کی تفصیل بھی بے محل ہوگی، بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے ۳۳ سال کی عمر میں اس عہد کی سب سے بڑی شہنشاہیت قائم کی اور اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہا کہ یونانی تہذیب کی برکتیں دور دور تک بکھیر دے۔ اس طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یونانیوں کو اپنی تہذیبی برتری کا احساس تھا، ارسطو نے اہل یونان

کی ترجمانی کی تھی جب یہ کہا تھا کہ شمال کی قومیں بہادر اور جوشیلی ہیں، جنوب کی مہذب، لیکن یونانی ہی
تنہا ایسے ہیں کہ جوشیلے، بہادر اور مہذب ہیں۔ افلاطون اور ارسطو اہل یونان کو غلام بنانے کے حق
میں نہیں تھے جبکہ غیر مہذب اجنبیوں کو غلام بنانا جائز سمجھتے تھے۔ سکندر نے جو پورے طور پر یونانی
نہیں تھا، اس احساس برتری کو ختم کرنے کی کوشش کی، اس نے "غیر ملکی اور غیر مہذب" شہزادیوں
سے شادی کی اور اپنے مقتدر مقدونی افسروں کو شریف خاندان کی ایرانی عورتوں سے شادی کرنے
پر مجبور کیا (ایشیا اور افریقہ میں اس نے اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے جو "یونانی" شہر
آباد کئے ان میں ان مردوں کی تعداد زیادہ تھی جو ایونیا اور ایشیائے کوچک کے مغربی علاقوں
اور دوسرے یونانی جزیروں سے نو آبادکاروں کی حیثیت سے آئے تھے) اس لئے ظاہر ہے کہ انھوں
نے مقامی عورتوں سے شادیاں کی ہوں گی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنجیدہ اور سوچنے والے دماغوں میں
یہ تصور جاگزیں ہو گیا کہ نوعِ انسانی ایک ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہوگا کہ شہری ریاست اور
کسی حد تک یونانی نسل سے وفاداری کا جذبہ کم ہوا ہوگا، رواقیوں (Stoics) نے جس فلسفے اور
تصورِ حیات کی تبلیغ کی اس میں وسیع المشربی اور تمام دنیا کو ایک سمجھنے پر بہت زور دیا جاتا تھا، لیکن
رواقیوں سے پہلے ہی سکندر کی فتوحات کی بدولت عملی طور پر یہ خیال مقبول ہو چلا تھا۔ یونانیوں اور غیر یونانیوں
میں تہذیبی لین دین کی ابتدا خاصے بڑے پیمانے پر اسی دور سے ہوئی، غیر یونانیوں نے یونانی علم و
سائنس کی طرف توجہ کی اور کچھ حاصل بھی کیا، یونانیوں نے بھی غیر یونانیوں کے طور طریقے اپنائے اور ان
کے عقیدے اور توہمات سے متاثر ہوئے، مثلاً ایران اور مصر میں شہنشاہ کا مرتبہ الوہی امتیازات کا حامل
تھا، سکندر نے کچھ اسی طرح کا مرتبہ حاصل کیا اگرچہ مقدونیہ کے جنرل اور سپاہی اسے سکندر ہی سمجھتے
رہے۔

یونانی تہذیب بنیادی طور پر شہری تہذیب تھی، یونانیوں نے جو نئے شہر آباد کئے وہ بہت جلد تمدنی
اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ ان شہروں کے تاجروں کے طبقہ نے تجارتی شاہراہوں پر اپنے قافلے
بھیجنے شروع کئے اور ایتھنز، اسکندریہ اور پنجاب کے شہر سب ایک رشتہ میں منسلک ہو گئے، ان تجا

قافلوں کے ساتھ اور بہت کچھ یونانی آبادکاروں کی معیت میں علم اور تہذیب نے بھی سفر کیا، تجارت پہلے بھی ہوتی تھی لیکن اب صورت حال ذرا مختلف تھی، اب برسوں تک ان علاقوں میں ایڈمنسٹریشن کی نوعیت بھی ایک تھی، اس لئے سفر کی انتظامی رکاوٹیں، جو کچھ بھی اس عہد میں ہوتی تھیں، ایک حد تک کم ہوگئی تھیں اور یونانی تہذیب کے اثرات پھیلنے میں آسانیاں تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ مشرقی بحیرۂ روم ایک ایسا علاقہ بن گیا جہاں صدیوں تک تجارت اور تہذیبی لین دین کا کام بڑے پیمانے پر جاری رہا اور یونان کے زوال کے بعد اسی کے سواحل پر یونانی علوم وفنون کے مرکز قائم ہوئے۔ سکندر نے مشرق کا لباس پہنا اور اس طرح گویا ظاہری اور داخلی دونوں لحاظ سے مشرقیت نے مغربی دنیا میں نفوذ کرنا شروع کیا۔ ایک خیال یہ ہے کہ سکندر اعظم کی موت سے "ایک عہد" ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کی فتوحات کے برگ وبار اس کی بے وقت موت کے بعد سامنے آئے اور در حقیقت یہ ایک عہد کا آغاز تھا، کئی لحاظ سے یہ بات صحیح ہے، یونان کی آزاد جمہوریتیں ختم ہوگئیں، سولن، پیریکلیز، سقراط، افلاطون اور ارسطو کا ایتھنز نہیں رہا، لیکن یونانیت زندہ رہی، اس نے نئے ملک فتح کیے، ایک سامراج قائم ہوا، اس سامراج نے سیاسی سرحدیں مٹادیں اور آمد ورفت کے وسیع ذرائع، رسل ورسائل کے دور دور تک پھیلے ہوئے وسائل، نوآبادیوں کی چہل پہل اور تجارت وصنعت کی گہما گہمی کی شکل میں امکانات کی نئی دنیائیں سامنے آئیں، یونانیوں کی حوصلہ مندیوں میں ابھی نشاط کی کیفیت باقی تھی، ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں یونانی ایشیا، افریقہ، ایپیرس اور مقدونیہ میں وارد ہوئے، ایونیا کی قسمت کا ستارہ ایک بار پھر چمکا، اور ہیلینی خون، زبان اور تہذیب ایشیائے کوچک کے دور دراز علاقوں میں، فونیقیا اور فلسطین میں، شام اور بابل ہوتی ہوئی دجلہ وفرات کو پار کرکے باختر اور ہندوستان تک پہونچی، اس سے پہلے کبھی اور "یونانیت" نے زندگی اور نشاط کا ایسا ثبوت نہیں دیا تھا، کبھی اور یونانی ادبیات، علوم اور فنون کو اتنے بڑے پیمانے پر ایسی فتح نہیں حاصل ہوئی تھی۔

یونانی تہذیب کے پائدار اثرات کا یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ ایشیائی ذہن کے قرطاس پر،

سیکڑوں برس بعد میکابیوں کی کتاب میں اُس
سکندر کی جو تصویر ابھری وہ آج تک محو نہیں ہو سکی۔
سے وہ آج بھی زندہ
کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ مسلمانوں کی روایات میں افسانوی ہیرو کی حیثیت
کہتے ہیں، مثلاً سکندر علی
ہے یہاں تک کہ مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کے نام بھی سکندر۔
سکندر بخت وغیرہ۔

اُس کے دو
سکندر اعظم کی موت کے بعد یونانی سامراج کی وحدت باقی نہ رہ سکی،
، دونوں کے حامی موجود تھے
بچے تھے، ایک بہت چھوٹا تھا اور دوسرا ابھی پیدا نہیں ہوا تھا
کا کون وارث ہوگا
لیکن بستر مرگ پر جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کے بعد اس کی عظیم سلطنت
ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خانہ جنگی
تو اس نے جواب دیا: "جو سب سے زیادہ طاقتور ہوگا"
کا یوروپی حصہ اینٹی
ناگزیر تھی، یہ خانہ جنگی اور انتشار ظہور میں آیا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی سامراج
جس نے اسکندریہ کو اپنی راجدھانی
گونس کے وشار کو ملا، بطلیموس (Ptolemy) کے حصہ میں مصر آیا
آخر میں وہ کامیاب ہوا،
بنایا، سیلوکس کو ایشیائی حصہ پر قبضہ جمانے کے لیے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں،
اس کے بعد انطاکیہ اُس کے خاندان
اس نے اپنی جنگی مصروفیتوں کے سبب کئی راجدھانیاں بدلیں لیکن
جن کا مقصد
کا دارالحکومت قرار پایا۔ ان سب نے سکندر اعظم کی اُن کوششوں کو فراموش کر دیا
ان سب کی حکومتیں فوجی استبداد
یونانیوں اور غیر یونانیوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنا تھا،
مصر میں
پر قائم تھیں جو متعدد دیسیوں اور کرائے کے یونانی سپاہیوں کے سہارے چلتا رہا۔
جب رومیوں نے
قدرے استحکام تھا لیکن ایشیا میں لڑائیوں کا سلسلہ اُس وقت بند ہوا
اور باختر کے یونانیوں
مغربی ایشیا پر قبضہ کر لیا، اس عرصہ میں ایران کو پارتھیا والوں نے چھین لیا تھا
جس کے
کا کوئی تعلق مغربی ایشیا کے یونانیوں سے باقی نہیں رہا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں،
جس نے ہندوستان
بعد اُن کا زوال بہت تیزی سے ہوا، باختر کے یونانیوں میں ایک حکمراں مینیندر ہوا
سے گہرے تھے
کا ایک وسیع علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس حکمراں کے تعلقات بودھوں
ملتے ہیں جو اُس
پالی اور چینی زبانوں میں ایک بودھ سنت سے اُس کے اُن مکالموں کے ترجمے

یونانی زبان میں قلمبند ہوئے تھے، کہا جاتا ہے کہ مینینڈر نے بودھ دھرم قبول کر لیا تھا۔ گاندھارا آرٹ میں یونانی اور ہندوستانی خصوصیات گلے ملتی نظر آتی ہیں۔

بابل کا علاقہ "یونانیت" سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ دجلہ کے کنارے سلیوسیا نام کا جو شہر بسایا گیا تھا اور جس نے ۱۵۰ ق م کے قریب بڑی شہرت پائی، اس میں حضرت مسیح کی پیدائش کے سو سال بعد تک یونانی ادارے موجود تھے۔ میسوپوٹامیا کے پورے علاقے میں یونانی زبان ادب اور تہذیب کی زبان بن گئی تھی اور یہ صورت عربوں کی فتوحات تک باقی رہی۔ یہی صورت شام میں بھی پیش آئی اور وہاں کی شہری آبادی "یونانیت" کے رنگ میں رنگ اٹھی، لیکن شام کا وہ علاقہ جو جوڈیا کے نام سے مشہور تھا یونانی اثرات سے محفوظ رہا، اس کی وجہ زراعت پیشہ یہودیوں کی قدامت پسندی اور وہ احساس برتری تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ جماعت سمجھتے تھے اور اپنی نسل، عقائد اور طرز فکر میں کسی قسم کی آمیزش گوارا نہیں کرتے تھے۔ یونانیت اور یہودیت کی یہ کشمکش تہذیبی نقطۂ نظر سے بڑی دلچسپ رہی ہے اور اس کے دور رس نتائج نکلے ہیں، لیکن یہاں اس داستان کے چھیڑنے کا موقع نہیں۔

یونانی تہذیب کی شاندار کامیابی کی مادی علامتیں یوں تو بہت تھیں لیکن اس سلسلہ کا شاہکار اسکندریہ کا شہر تھا۔ سکندر اعظم سینائی کے ریگستان کی راہ سے مصر میں داخل ہوا تھا، وہاں پہونچ کر اس نے بڑی سرعت سے مصریوں کا دل اس طرح جیتا کہ ان کے دیوی دیوتاؤں کا پورا احترام کیا، مصریوں نے اسے ایرانی حکومت کے مقابلہ میں اپنا نجات دہندہ تصور کیا، اس نے اہل مصر کے اس احساس کو اپنے حق میں استعمال کیا اور ایک دوسرا ریگستان عبور کر کے سیوا (Siwa) کے نخلستان میں جا پہونچا اور آمون دیوتا کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھائے، وہاں پجاریوں نے اس کا شاندار استقبال کیا اور تمام پرانی رسموں کے ساتھ فراعنۂ مصر کی طرح اس کی تاجپوشی کی۔ وہاں سے وہ نیل کے ڈیلٹا کی طرف واپس ہوا اور غالباً یونانی تاجروں کی تجویز پر اس نے شہر اسکندریہ کی داغ بیل ڈالی، یہی شہر بعد میں بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر یونانی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ تجارتی

نقطۂ نظر سے اس ساحل وقوع بہت مناسب تھا، یورپ اور ایشیا کی آئے دن کی لڑائیوں اور
خانہ جنگیوں سے یہ علاقہ محفوظ بھی تھا، تہذیب و تمدن اپنی ترقی کے لئے سکون و اطمینان چاہتے ہیں۔ اس
شہر کی فضا اس کے لئے سازگار تھی، تیسری صدی ق م میں یہ شہر اپنے عروج کو پہونچ چکا تھا، بطلیمی خاندان
کے حکمراں علم و فن کے قدرداں تھے، ان کی سرپرستی میں یہ شہر عالموں کا شہر بن گیا، اُس عہد کے مشاہیر
علم و دانش کی ایک بڑی تعداد اسکندریہ پہونچی اور بحیرۂ روم کے نیلے آسمان اور نشاط انگیز ہواؤں
کے دامن میں انھوں نے فکر و نظر کا حق ادا کیا، ریاضی نے روما کے زوال کے عہد تک اسی شہر کو
اپنی آماجگاہ بنائے رکھا، آرکیمیڈیز نے اسی شہر میں تعلیم پائی تھی، اراتاستھنیز یہاں کی مشہور لائبریری
کا مہتمم خاص تھا۔ سائنس اور ریاضی کے شعبۂ علم میں یہاں جو کام ہوا وہ پہلے کے کاموں سے کسی طرح
کم درجہ کا نہیں تھا، یہ زمانہ درحقیقت تخصص کا تھا، اس لئے اس شہر میں کوئی فلسفی ایسا نہیں تھا
جس نے کوئی نیا اصول یا نظریہ پیش کیا ہو، اقلیدس، ارسٹارکس، آرکیمیڈیز اور اپالونی اُس اپنی ریاضی
ہی پر قانع اور مطمئن تھے۔

اسکندریہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اُس عہد میں بھی اور بعد میں بھی مورخوں کی
توجہ کا مرکز رہا، اور اس طرح اس کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہوگئیں، یہ شہر ایک
خاص پلین کے مطابق بسایا گیا تھا اس لئے اِس میں وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں مہیا تھیں
جنھیں اس وقت کی متمدن دنیا سوچ سکتی تھی، اس شہر کی آبادکاری میں یونانی مذاق پورے
طور پر جلوہ گر تھا اور اسی لئے اس سطح ارض پر اس پایے کا کوئی دوسرا شہر غالباً نہیں تھا، ول ڈیورنٹ
نے اپنی کتاب "سویلیزیشن کی کہانی" کی پہلی جلد کے دوسرے حصہ میں کئی مورخوں کے حوالے سے اس
شہر کی ایک ناتمام لفظی تصویر پیش کی ہے لیکن اسی سے اس کی نمایاں خصوصیات کا بہت کچھ اندازہ
ہو جاتا ہے۔ اس کی آبادی عہد جدید کے کسی دارالحکومت کی طرح، مختلف عناصر پر مشتمل تھی، کل
آبادی کی تعداد چار لاکھ اور پانچ لاکھ کے درمیان ہوگی، اور اس میں اہل مقدونیہ، یونانی، مصری،
یہودی، ایرانی، اہل اناطولیہ، شامی، عرب اور حبشی سبھی تھے، یہاں "دولت، کھیل کے میدان

فوج، گمبیر نیلا آسمان، نمائش گاہیں، فلسفی، سائنسدان اور عالم، شاعر اور ادیب، قیمتی دھاتیں، صحتمند خوبصورت نوجوان، شاہی محلات، سائنس اکیڈیمی، لائبریری، طرح طرح کی نفیس شرابیں اور حسین عورتیں ـــــ سب کچھ موجود تھا" (ول ڈیورنٹ بحوالہ ہیروڈوٹس) اپنی ان تمام خصوصیتوں کے علاوہ ایک بات اس شہر میں اور تھی، وہ یہ کہ اس شہر میں جلد ہی یہودیوں کے خلاف جذبۂ منافرت پیدا ہوا، اس میں یہودیوں کی مذہبی اور نسلی علاحدگی پسندی کے ساتھ معاشی و تجارتی رقابتوں کا بھی دخل تھا، تجارت کے میدان میں یہودیوں کا مقابلہ کوئی اور جماعت نہیں کر سکتی تھی۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ ایتھنز کے زوال کے بعد فلسفے اور ڈرامے کو وہ عروج نہیں حاصل ہوا۔ لیکن علم و ادب کی دوسری اصناف یونانی دنیا کے دوسرے شہروں میں پھلی پھولیں۔ ایتھنز ختم ہو رہا تھا اور مغرب کی یونانی بستیاں، علاوہ سراکیوس کے، انحطاط پذیر تھیں لیکن ایشیا اور افریقیہ کے یونانی شہروں میں مادی اور تہذیبی ترقی کا سارا سامان جمع ہو گیا تھا۔ پولی بی اس (Polybius) نے جو اپنے وسیع علم، مورخانہ ژرف بینی اور محتاط رایوں کی وجہ سے مشہور ہے، اس زمانے کی فنی، ادبی اور سائنسی ترقی کا ذکر بڑے جوش سے کیا ہے۔ یونانی زبان کے رشتۂ اتحاد کے سبب اُن علاقوں میں جہاں مشرقی بحیرۂ روم کے نیلے پانی، کیف پرور ہواؤں اور سندر آکاش کے طفیل ایک رومانی کیفیت ملتی ہے ایک تہذیبی یکجہتی پیدا ہو گئی جو تقریباً ایک ہزار سال تک مشرق قریب کا طرۂ امتیاز رہی۔

اس عہد میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، کئی سو مصنفین ایسے ہیں جن کے نام معلوم ہیں، نامعلوم مصنفوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں، اتنے بڑے پیمانہ پر تصنیفی سرگرمیوں کا تقاضا یہ تھا کہ لائبریریاں قائم ہوں، امیروں اور عالموں کے ذاتی کتب خانے وجود میں آئیں، لیکن اس زمانے کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ٹولمی خاندان کے حکمرانوں کی دلچسپی اور توجہ کے سبب اسکندریہ کا مشہور کتب خانہ تھا جو وہاں کے عظیم الشان عجائب گھر کا ایک حصہ تھا۔ اس کتب خانے میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں، پٹولمی سیوم نے حکم دیا تھا کہ اسکندریہ میں جو کتاب آئے گی وہ اس کتب خانے میں رکھی جائے گی اور وہ اس طرح کہ کتاب کی نقل ہو گی، اصل کتاب کتب خانہ کے ذخیرہ میں شامل ہو گی

اصل ان کی نقل ملک کے پاس ہوگی۔ اس حکمران سے متعلق یہ قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اُس نے ایتھنز کی حکومت کو لکھا کہ وہ سوفکلیس اور یوری پیڈیز وغیرہ کے مخطوطات اسکندریہ کو مستعار دے دے اور ضمانت کے طور پر نوے ہزار ڈالر کے لگ بھگ (یعنی اس قیمت کا رائج الوقت سکہ) بھجوا دیے، اُس نے اصل نسخے رکھ لیے اور اُن کی کاپیاں بھجوا دیں اور اہلِ ایتھنز کو لکھا کہ وہ ہرجانہ کے طور پر پوری رقم رکھ لیں۔ جس کتب خانہ کا ذخیرہ اس طرح اکٹھا کیا گیا ہو اس کی علمی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتب خانے کے مہتمم ہونے کی تمنا اس زمانے کے بڑے بڑے عالموں کو رہتی تھی، ایک اور بات بھی تھی، جس دانشور پر بادشاہ کی نظرِ کرم ہوتی تھی وہی اس کا مہتمم مقرر ہوتا تھا کیونکہ اس کتب خانے کا مہتمم ولی عہد شاہزادہ کا اتالیق اور استاد بھی ہوتا تھا۔ کتب خانے کے جن مہتموں کے نام محفوظ رہ گئے ہیں وہ اپنے زمانے کے علمی حلقے میں ممتاز تھے، رہوڈس، سیرین، اسکندریہ، بزنطین، ساموتھریس جیسے دور دراز مقامات کے مشاہیرِ علم و ادب اس کتب خانے کے مہتمم ہوئے، اس سے یونانی تہذیب کے اتحاد اور پھیلاؤ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتب خانے سے وابستہ کتنے افراد ہوں گے جو مختلف کام کرتے ہوں گے، مضامین کے اعتبار سے کتابوں کی تقسیم تھی، کتابیں نقل کرنے کے لئے سیکڑوں آدمی تھے، قیمتی نسخوں اور نادر مخطوطوں کی دو دو تین تین کاپیاں کرائی گئیں۔ اسکالروں کی ایک جماعت تھی جو متون کا تنقیدی جائزہ لیتی تھی، اور ملحقات کو اصل سے الگ کرتی تھی، ان میں سے کئی ایسے تھے جنھوں نے علم و ادب کے مختلف شعبوں کی تاریخیں لکھیں، کئی ایسے تھے جنھوں نے علمی و ادبی شاہکاروں کو ایڈٹ کیا اور ان کی شرحیں لکھیں، بزنطین کے ارسٹوفینس نے قدیم تصنیفوں کے جملوں اور فقروں کو بڑے حروف اور اوقاف کے استعمال سے الگ الگ کیا، اس سے عبارت کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگئی۔ اس سے پہلے یہ کام کسی نے نہیں کیا تھا، بلاشبہ یہ ایک ادبی انقلاب تھا۔ اسکندریہ کے عالموں نے ادبی تنقید کا آغاز بھی کیا اور اس میدان کا کوئی گوشہ بھی اُن سے نہیں چھوٹا۔ ا

نے گرامریں اور لغتیں بھی مرتب کیں اور زبان کے معیار بھی مقرر کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ عالموں اور دانشوروں کا زمانہ تھا اور اسکندریہ، فلسفے کو چھوڑ کر، یونانی دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔

لیکن اس تہذیبی و علمی ترقی کے باوجود مجموعی طور پر اخلاقی حالت زبون تھی، شہریت اور شہری حقوق و فرائض کا وہ احساس جو یونان کی شہری ریاستوں کی جان تھا، معدوم ہوگیا تھا، منچلے اور خودغرض لوگوں کے علاوہ عام لوگوں کے لئے پبلک معاملات میں اب کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ ان دولت مندوں کے لئے جو اقتدار کی خواہش نہیں رکھتے تھے، زندگی پھولوں کی سیج تھی، عالموں میں خوشامد کا جذبہ بہت زیادہ تھا اور خوشامدی عالم، شاعر اور ادیب بڑے مرتبے تک پہونچ جاتے تھے، سیاسی انقلاب کے باعث جو حکمراں اور حکومتیں بدلتی تھیں تو خوشامدی عالموں کے دوسرے گروہ پر بادشاہ کی نظر عنایت ہوتی تھی، اس طرح تحفظ اور اطمینان کی صورتیں مفقود تھیں، اکثر پورے پورے شہر تباہ ہوجاتے تھے، ان حالات میں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ "قسمت کی دیوی" کے پجاریوں کی تعداد روز افزوں تھی، سکندر کے بعد سیاسی اعتبار سے یونانی دنیا میں انتشار اور ابتری کی حالت تھی، نئے سیاسی مسائل جو ایشیا اور افریقہ کی سرزمین پر ابھرے ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت یونانی ذہن میں نہیں تھی۔ یونانیوں کے مقابلہ میں رومی کم آگاہ اور غیر شائستہ تھے لیکن سیاسی اعتبار سے وہ کامیاب تھے، انھوں نے کم ازکم ایک مستحکم نظم و نسق قائم کیا۔ شہری ریاستوں کی بدنظمی قابل برداشت کہی جاسکتی ہے لیکن اہل مقدونیہ کے ہاتھوں جو سیاسی انتشار اور بدنظمی پھیلی وہ بڑی بھیانک تھی، بہتر نظم و نسق نہ ہونے سے سماجی بے چینی بھی بڑے پیمانہ پر پھیلی، آزاد مزدوروں کی اجرت بہت گر گئی کیونکہ غلام مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ کم اجرت پر دستیاب تھے، دوسری طرف ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں، عبادت گاہوں میں سونا جمع ہوتا رہا جبکہ نچلے طبقہ کے افراد کا افلاس بڑھتا رہا۔ آزاد مزدوروں پر زندگی اس درجہ تنگ ہوگئی تھی کہ انھوں نے کرایے کے سپاہیوں کا مشکل اور خطرناک پیشہ اختیار کرنا شروع کیا اس لئے کہ

خطرات کے ساتھ اس میں امکانات بھی تھے لڑائیوں میں مال غنیمت اچھا خاصا ہاتھ لگتا تھا، اکثر شہر
کے شہر لوٹ لئے جاتے تھے اور حسد پیدا کر کے صورت حال اور اپنے موافق بنالی جاتی تھی۔

افسوس ہے کہ یونانی ذہن نے بدھ مت، زردشتی مذہب اور یہودی عقائد کے مقابلہ
میں کالڈیا اور بابل کے عقیدوں اور توہمات کو قبول کیا، خاص طور سے علم نجوم اور سحر اور جادو کی طرف
یونانی متوجہ ہوئے اور یہ معاملہ مرض کی حد تک پہونچ گیا۔ بادشاہوں کے متعلق تو یہ بات سمجھ میں
آتی ہے کہ انھیں یہ یقین ہو سکتا تھا کہ ستاروں کی آنکھیں اُن کی طرف نگراں رہتی ہیں، لیکن عام لوگ
بھی اس فریب میں مبتلا ہو گئے، یہاں تک کہ فلسفیوں نے بھی اس عقیدہ میں حصہ لیا۔

اس طرح جو ایک عام افراتفری پھیلی تو اخلاقی پستی نے سر ابھارا، اگر یہ یقین ہو جائے کہ
کل نہ معلوم کیا ہو تو کفایت شعاری اور سادگی کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے، ایمانداری میں کوئی فائدہ
نہیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ جس کے ساتھ ایمانداری برتی جارہی ہے وہ ضرور دھوکا دے گا،
آدرش جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کی قدر نہیں اور نہ اس کی کامیابی کی امید ہے، اپنی جاذبیت
کھو دیتا ہے، سچائی اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی جہاں یہ صورت ہو کہ بے وفائی اور انحراف ہی
میں جان کی سلامتی اور خوشحالی ہے۔ یہاں صوفی سنتوں کی بات نہیں جو اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں،
جو لُٹ کر بھی ایمانداری کا دامن نہیں چھوڑتے، جو آئیڈیل کی بے قدری سے ہمت نہیں ہارتے، جو
بے وفاؤں کے ساتھ بھی وفاداری کرتے ہیں، فریبیوں کے ساتھ بھی سچائی سے پیش آتے ہیں اور
دشمنوں سے بھی محبت کرتے ہیں، مگر ایسے مردانِ خدا کتنے ہوتے ہیں، یہاں بات ہے عام
انسانوں کی، اور عام انسانوں کی اخلاقی حالت اُس عہد میں اچھی نہیں تھی، بلکہ حالات کے
دباؤ سے کتنے اچھے لوگ تھے جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گئے۔

یہ صورت حال تیسری صدی قبل مسیح کی ہے۔ دانشوروں کے طبقہ میں بھی رجائیت ختم ہو چکی
تھی، ایک طرح کی قنوطیت اور آئندہ کل کا خوف غالب ہو رہا تھا، سماج کو بہتر بنانے اور انسان
کو خیر اور عمل کی راہ دکھانے کا حوصلہ کسی میں نہیں ملتا، ضمیر کی آزادی کا راگ بے شک الا

جاتا تھا لیکن فرد کے ضمیر اور جماعت کے ضمیر کے مابین کسی رشتۂ اتحاد کی تلاش کا پتہ نہیں ملتا، ہر شخص اپنے طور پر اسی میں مبتلا تھا کہ اس پر بدنصیبی کا سایہ نہ پڑنے پائے، اجتماعی زندگی بے چینیوں سے محفوظ رہے اس کی پرواہ کسی کو نہیں تھی، علم الاخلاق پرانی کتابوں میں موجود تھا، لیکن اس کے اجتماعی مضرات سے بحث کرنے کے بجائے اس کو انفرادی سود و زیاں کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا، دانشوروں کی جب یہ حالت ہو تو ظاہر ہے کہ کلبیوں اور متشککوں کے نظریے ہی فروغ پا سکتے تھے۔

پروفیسر محمد مجیب

جامعہ ملیہ کی رپورٹ

جناب امیر جامعہ، جناب ل کاتوکر صاحب۔ خواتین اور حضرات،

مجھے اس وقت آپ کے سامنے جامعہ کی ایک سال کی رپورٹ پیش کرنا ہے یعنی یہ بتانا کہ اس سال کے دوران میں کیا ہوا اور کیا نہیں ہو سکا۔ جو ہوا وہ کیسے ہوا اور جو نہیں ہو سکا اس کا سبب کیا تھا۔ تعلیم کے لیے مناسب انتظام کی ضرورت ہوتی ہے اور ان وسائل کی جو اس انتظام کے لیے درکار ہوں مگر شاید تعلیم کی اصل قدریں نصاب، بجٹ، عمارتوں اور طالب علموں کی تعداد بیان کرنے سے نظر کے سامنے نہیں آتی ہیں اور اس وقت ہندوستان میں تعلیم گاہوں اور طالب علموں کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہہ کر بہت تسلی ہوتی ہے کہ جامعہ میں کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے میں نے اس رپورٹ کو تیار کرتے وقت رجسٹرار صاحب سے کوئی مدد نہیں لی بلکہ یہ سوچا کہ شاعر کا یہ مصرع ہمارے حسب حال ہے یا نہیں کہ

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے

منزل کا ذکر بے موقع نہیں ہے۔ ایک سال سندیں تقسیم کرنے کے بعد جب پھر اسی طرح سندیں تقسیم کرنے کا وقت آتا ہے تو واقعی محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک منزل سے چل کر دوسری منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا یہ احساس زمین کی گردش پیدا کرتی ہے یا کوئی اور طاقت، کوئی اور جذبہ، کوئی اور تڑپ، جسے شاعر کی طرح ہم بھی عشق کہہ سکتے ہیں۔

جامعہ کو جب سے یونیورسٹی کا اسٹیٹس ملا ہے نئے استادوں کا تقرر ہوتا رہا ہے۔ ان میں سے بعض خود چلے گئے بعض کو خود ہم نے رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ بیشتر اس طرح آئے اور

رہے کہ جیسے انھیں ایک اجنبی شہر میں کسی جان پہچان والے کا گھر مل گیا ہو اور گھر اور گھر والوں کی کیفیت دیکھ کر وہ اسے اپنا گھر سمجھنے لگے ہوں۔ مجھے ایک زمانہ یاد ہے جب جامعہ میں نئے اور پرانے کا فرق کیا جاتا تھا اور نئے لوگوں کو پرانے بننے میں خاصی مدت لگتی تھی۔ ہمارے لئے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ اب پرانے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا حق زیادہ ہے اور نئے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا حق کم ہے سب میں ایک برابری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جامعہ کا شمار غریب اداروں میں ہوتا ہے اور شاید ایک عرصہ تک ہوتا رہے گا لیکن بزرگوں نے قناعت کی جو تعلیم دی ہے اس کا بھی ہم پر اثر ہے اور تجربہ سے ہم نے معلوم کیا ہے کہ اس قناعت کی وجہ سے چاہے وسائل میں اضافہ نہ ہو آدمیت کی جو دولت ہے وہ ضرور بڑھتی رہتی ہے۔ ہمارے یہاں جو نئے استاد آتے ہیں وہ دیکھتے ہوں گے کہ یہاں جو اثر ہے وہ یہیں کے لوگوں کا ہے۔ ہم لالچ میں آکر اپنی تعلیمی خودداری کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ ہم جب استاد کا انتخاب کرتے ہیں اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب اس کی اپنی قابلیت کی بنا پر ہوا ہے اور اسی وجہ سے اس کو خیال رہتا ہوگا کہ اپنے ساتھیوں میں قابلیت اور انسانی خوبیوں کے ذریعے امتیاز حاصل کرے۔ اسی وجہ سے شاید یہ خیال بھی ہوتا ہوگا کہ جو لوگ اس آزاد جمہوری جماعت میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں ان کے طریقے کو سمجھا اور اپنایا جائے اور ہم میں وہ ہم آہنگی پیدا ہو چلی ہے جو ہمارے کام میں مضبوطی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔

دلی یونیورسٹی اور اس کے مختلف کالجوں کی شہرت اور ان کے تعلیمی معیار کو دیکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ جامعہ نگر اوکھلا دلی سے بہت دور سمجھا جاتا ہے، ہمیں اس کی امید نہ کرنا چاہئے کہ اچھی سے اچھی قابلیت رکھنے والے طالب علم بڑی تعداد میں ہمارے یہاں داخلے کے خواہش مند ہوں گے لیکن تعلیمی بستی میں رونق صرف علمی قابلیت سے پیدا نہیں ہوتی جیسے گھروں میں اجالا ماں باپ اور بچوں کی صورت شکل سے ہی نہیں ہوتا۔ ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے یہاں طالب علم چاہے اپنے شوق سے آئے یا مجبوری سے، یہاں آجانے کے بعد اس کا جی رفتہ رفتہ چاہنے لگتا ہے کہ ہمارے تہذیبی لباس کو اپنا لباس بنا لے اور بعض اس لباس کو پہن کر اپنی شکل ساتھ کے

آئینے میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں خود اپنی شکل دیکھنے کا شوق نہ ہو تب بھی دوسرے تو
بہر حال اسے دیکھتے ہی ہیں اور اس حسن کو جو پرانے تہذیبی فن کاروں کے بنائے ہوئے زیورمل
کا حسن ہے پسند بھی کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے لڑکے کم آئیں گے جو اپنی ذہانت کو اپنا سرمایہ
سمجھ کر اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ ایسی لڑکیاں اور بھی کم آئیں گی
جو تعلیم کے زمانے کو موڈرن اور فیشنیبل بننے کا موقع سمجھتی ہیں۔ ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی دنیا سے
ہم بہت دور ہیں اور اسے ہم اتنا پسند بھی نہیں کرتے کہ اس کے قریب آنا چاہیں۔ لیکن مجھے
ڈر ہے کہ اگلے سال داخلوں کے وقت ہمیں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ ہم کسی شعبے میں اور خاص
طور سے کالج میں طالب علموں کی تعداد اتنی بڑھانا نہیں چاہتے کہ وہ ہمارے قابو میں نہ رہیں اور
داخلوں کے لئے نمبروں کو معیار بنا کر ہم کسی امیدوار سے کہیں گے کہ ہم تمھارا داخلہ نہیں کر سکتے
اس لئے کہ میٹرک یا ہائر سکینڈری میں تم نے بہت کم نمبر حاصل کئے ہیں تو وہ جواب دے گا کہ میں
امتحان پاس کر کے اس کے آگے کے امتحان پاس کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں تو انسان ہوں اپنے
اندر انسانیت کے گن پیدا کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے آپ کے یہاں کی تعلیم بہت ضروری
معلوم ہوتی ہے۔ کیا آپ میری یہ آرزو پوری نہیں کر سکتے۔ ایسے امیدواروں کی پشت پر ان کے ماں
باپ بھی ہوں گے جو اس وجہ سے بہت دکھی ہیں کہ ان کے بچوں اور بچیوں کو بھیڑ بکریوں کا گلہ سمجھا
جاتا ہے اور ان کے چرواہے کبھی سائے میں بیٹھ کر سو جاتے ہیں کبھی آپ ہی آپ ڈنڈا اچھالنے لگتے ہیں
کبھی بے پروائی میں چرانے کے لئے ایسی جگہ لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں نام کو بھی گھاس پتی
نہیں ہوتی۔ ایسے امیدواروں کو ہم کیا جواب دیں گے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بس اس کی
امید کرتا ہوں کہ ہم صبر اور خوش اخلاقی کا حق ادا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

عشق کی اس منزل کو ہمارے استادوں کے شوق اور ہم آہنگی اور طالب علموں کے
چلن اور اثر لینے کی صلاحیت نے روشن کر دیا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں راستے کی دشواریاں اور
زیادہ صاف نظر آرہی ہیں لیکن ہمیں شکر ادا کرنا چاہئے کہ یہ روشنی مختلف راستوں سے
ہمارے دلوں تک پہنچ رہی ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے ہمیں اپنی دشواریاں نظر کا فریب معلوم

ہونے لگیں اور ہم زیادہ یقین اور ہمت کے ساتھ عشق کی اگلی منزلوں تک بڑھنے لگیں۔

ایک زمانے میں کہا جاتا تھا اور شاید صحیح بھی تھا کہ عشق آدمی کو ہر قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ ہمارے حصہ میں جو عشق آیا ہے اس کے ساتھ گرہستی کی شرط لگی ہوئی ہے اور اسی شرط کو پورا کرنا سب سے مشکل ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ جن کی مدد کے بغیر یہ شرط پوری نہیں ہو سکتی اپنے قاعدوں کو دیکھتے ہیں۔ ہمارے عشق کو نہیں دیکھتے۔ اس جگہ جہاں کانووکیشن کا جلسہ ہو رہا ہے اسکول کی عمارت ہونی چاہئے تھی جس کا نقشہ ہم نے تیس پینتیس برس پہلے بنوایا تھا اور جسے ہم نے اب اپنی ضرورتوں کے مطابق بدل کر منظوری کے لئے پیش کیا ہے۔ بدلنے کے بعد نقشے کے مطابق عمارت بنانے میں قریب پندرہ لاکھ خرچ ہوں گے اور جتنی دیر یہ سوچنے میں لگے گی کہ یہ پندرہ لاکھ کہاں سے آئیں اتنے ہی زیادہ روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔ مدرسوں کے جو ہوسٹل ہیں ان کا خرچ ہم نے یہ سوچ کر مقرر کیا تھا کہ ہوسٹلوں میں رہنے والے بچے امیر گھرانوں کے نہ ہوں گے۔ اب گرانی کی وجہ سے اتنے لوگ امیر ہو گئے ہیں کہ ہم خرچ بڑھا کر بھی ایک کی جگہ دو بلکہ دو کی جگہ چار ہوسٹلوں کو آباد رکھ سکتے ہیں مگر نئے ہوسٹل بنانے کے لئے نہ ہمارے پاس روپیہ ہے نہ شاید کہیں سے مل سکے گا۔ لڑکیوں کے لئے صرف ایک ہوسٹل ہے اور ہمارے یہاں لڑکیوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم اگر ایک ہوسٹل اور بنا سکیں تو اس وقت ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کو جو تکلیفیں ہیں وہ دور ہو جائیں گی لیکن ہم نے مجبور ہو کر لڑکیوں کا ہوسٹل بنانے کی تجویز کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ استادوں کے مدرسہ میں جگہ کی بہت تنگی ہے۔ کالج میں نئی عمارت بننے کے باوجود بھی تنگی رہے گی اور اب یہ فکر سوار ہے کہ سائنس کی تعلیم کے لئے جلد سے جلد الگ عمارت بنوائی جائے۔ اسی سلسلے میں بی کالج کے لئے ہوسٹل کی ضرورت بیان نہ کروں تو گویا جامعہ کا ایک اہم تعلیمی مقصد نظر انداز ہو جائے گا۔ یو جی سی کی اسکیم کے مطابق ہمیں ایک اسٹوڈینٹس ہوم بھی بنانا چاہئے۔ آخر میں اس دشواری کا ذکر کر دوں جو استادوں کے لئے اس منزل کو واقعی عشق کی منزل بنا دیتی ہے۔ ہم پوری کوشش کرنے کے باوجود استادوں کے لئے مکان نہیں بنوا سکے ہیں اور اب معلوم ہو گیا ہے کہ جب تک زمین خریدنے کے لئے روپیہ نہ ہوگا ہم دو چار مکان بھی نہ بنوا سکیں گے۔ ہمارے استاد یا تو ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں گذارا

کرتے ہیں جو ہم انھیں پیش کر سکتے ہیں یا بھاری کرایہ دے کر ایسے ہی چھوٹے کرے خود حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کام کا شوق باقی رہنا عشق نہیں تو کیا ہے۔

ہم خدا جانے کیوں برسوں تک یہ سمجھتے رہے کہ ہمارا کوئی طالب علم مرکزی کتب خانہ کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اس کی الگ سے فیس ادا نہ کرے اور کوئی اس کی طرف سے ضمانت نہ لے۔ اب ہماری غلط فہمی دور ہو گئی ہے اور کتب خانہ میں بہت زیادہ طالب علم نظر آتے ہیں۔ ادھر بجٹ منظور کراتے وقت ہمیں مجلس مالیات کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ جامعہ تعلیمی ادارہ ہے، اس کے کتب خانوں میں کتابیں ہونی چاہئیں اور ریڈنگ روم میں رسالے۔ وزارت تعلیم سے اب بھی کتابوں کی خریداری کے لئے بہت کم ملتا ہے اور یو جی سی بھی شاید ہمارے ساتھ ایسی فیاضی نہیں برتتی جیسی کہ قانونی یونیورسٹیوں کے ساتھ، پھر بھی کتابوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور اسی کے ساتھ پڑھنے کا شوق بھی۔

جناب امیر جامعہ۔

جامعہ کا نیا دستور آج سے عمل میں آ رہا ہے۔ یہ دستور دوسری یونیورسٹیوں کے قاعدے قانون سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے اور اسے نافذ کر کے ہم گویا اعلان کر دیں گے کہ قانون قاعدے کے اعتبار سے ہم میں اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس طرح ہم نے ان مقاصد کو خیرباد کہا ہے جن کی خاطر جامعہ قائم ہوئی تھی اور زمانے کے ہاتھوں شکست کھا کر تسلیم کر لیا ہے کہ جامعہ کو اچھی تعلیمی خصوصیات کا قومی تعلیمی ادارہ بنانے کی خواہش غلط تھی۔ کیا ہم نے ایثار اور قربانی کے حوصلے کو ترک کر کے دنیا سے جو کچھ مل سکے اسے وصول کر لینے کا ارادہ کیا ہے۔ کیا ہم اب یہ دیکھیں گے کہ جتنی تنخواہ ملتی ہے کہیں اس سے زیادہ کام تو نہیں لے لیا جاتا یا وہ شخص جو کام کے بدلے تنخواہ لیتا ہے کہیں اپنے حق سے زیادہ تو وصول نہیں کر لیتا۔ کیا ہم میں اب وہ یگانگت نہیں رہے گی جو ایک ساتھ مصیبتیں جھیلنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کو بس اپنی فکر ہو گی کہ کم سے کم کام کر کے زیادہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرے۔

جناب والا۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا نیا دستور سب کی مرضی

سے بنا ہے۔ اس کی وجہ سے جامعہ کے مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جامعہ کے حیاتی اراکین کی نمائندگی مجلس منتظمہ میں کم ہو گئی ہے تو اس کے بجائے وہ لوگ مجلس میں آ گئے ہیں جن پر جامعہ کے اہم تعلیمی اور انتظامی کاموں کی ذمہ داری ہے اور جن کے مشورے کے بغیر کوئی بڑے فیصلے کرنا جامعہ کے حق میں مفید نہیں ہے۔ سرکاری گرانٹ انجمن کے فیصلے کے مطابق قبول کی گئی اور جب مالی ذمہ داری پوری پوری حکومت نے لے لی تو یہ لازمی تھا کہ اختیارات ایسی مجلسوں کے ہاتھوں میں آ جائیں جو تعلیم اور انتظام کے سارے کام کرتی ہیں اور جنھیں حکومت اپنے قاعدوں کے مطابق ذمہ دار مانتی ہے۔ دوسری یونیورسٹیوں کے سے قاعدے بنانے میں جامعہ کے کارکنوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے اور ایسے فیصلے جو بطور خاص کئے جاتے تھے اور بعد میں الجھنیں پیدا کرتے تھے اب بہت کم ہوتے ہیں۔ نفعی بحث کرنے والا یہ ضرور کہے گا کہ اب جامعہ میں اسلامی رنگ نہیں رہا مگر آپ کو یاد ہو گا کہ اب سے چالیس برس پہلے بھی نفعی بحث کرنے والے کہتے تھے کہ جامعہ اسلامی ادارہ نہیں ہے اور اس وقت بھی ہم نے گوارا نہیں کیا کہ دین کی روشنی کو قانون کے پردے میں چھپایا جائے۔ رہا ایثار اور قربانی کا جذبہ سو اسے ہم نے کبھی ہاتھوں کی ہتھکڑی اور پاؤں کی زنجیر نہیں بنایا ہم سے کبھی دنیا دار خوف کھا کر نہیں بھاگتے تھے اور دینداروں سے ہم نے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کی۔ اپنے اس رویے کی وجہ سے ہم ریاکاری کی بلا سے بچے رہے اور اب اگر کہا جاتا ہے کہ تنخواہ اور گریڈ دوسری مراعات کے لحاظ سے ہم میں اور دوسری یونیورسٹیوں کے استادوں اور کارکنوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ دیتے ہیں کہ جی ہاں اب ایسا ہی ہے۔ ہم پہلے کم تنخواہوں پر راضی تھے اور اب زیادہ پر راضی ہیں۔ ہمیں پہلے جفاکشی پر ناز نہیں تھا کام کو کام سمجھ کر کرتے تھے۔ اب بھی کام کو کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ جفاکشی کی ضرورت نہیں رہی تو اس کا غم کیوں کریں۔

اب اجازت دیجئے کہ جس شعر کے پہلے مصرع سے میں نے رپورٹ شروع کی تھی اس کا دوسرا مصرع بھی پڑھ دوں کہ جس حقیقت کا اب تک ذکر نہیں ہوا ہے وہ بھی بیان ہو جائے

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقش کف پا آخر شب

پروفیسر بی، جی، غفوروف

نہرو اور اُن کی شخصیت

پروفیسر غفوروف روس کے مشہور عالم، ماسکو میں انسٹی ٹیوٹ آف ایشیا کے ڈائرکٹر اور علوم شرقیہ کے ماہر ہیں، امسال ستمبر میں یونسکو کے زیر اہتمام نئی دہلی میں نہرو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں مختلف ملکوں کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ پروفیسر غفوروف نے اس کانفرنس میں جو تقریر کی اس کے ایک حصہ کا خلاصہ درج ذیل ہے، یاد رہے کہ ۱۴ نومبر پنڈت نہرو کی پیدائش کا دن ہے۔

مدیر

جواہرلال نہرو کا نام سوویت یونین میں بہت مشہور ہے۔ مزدور اور کسان، عالم و طالب علم اور تمام پیشوں سے تعلق رکھنے والے مرد اور عورتیں، پیار اور احترام سے یہ نام لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جواہرلال نہرو کو جو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے وہ سوویت عوام کے اس جذبۂ دوستی کا واضح اظہار ہے، جو وہ ہندوستان کے برادرانہ عوام کے لئے محسوس کرتے ہیں۔ جواہرلال نہرو، اپنے ملک کے ایک عظیم فرزند تھے۔ نہرو اپنے عوام کی بہترین خصوصیات، ان کی صدیوں قدیم تہذیب، دانائی اور امن و انکساری سے پیار کے جذبے کا زندہ پیکر تھے۔

جس کو بھی جواہرلال نہرو کو دیکھنے کا موقع ملا ہے اس کے ذہن میں ان کے شریفانہ روحانی چہرے، ان کی مہربان مسکراہٹ اور ان کی تیز نظروں کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ ان کی برف جیسی سفید ٹوپی، ان کی سیدھی سادی روایتی شیروانی اور ان کے بٹن ہول میں لگا ہوا ہمیشہ تروتازہ گلاب ہم سب کو یاد ہے۔

نہرو کی ظاہری شخصیت، ان کی داخلی دنیا، ان کی فطرت اور ان کی امنگوں سے مکمل مطابقت

رکھتی تھی۔ وہ اپنے ملک کے روشن مستقبل کے مجاہد تھے۔ انھوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف اور دنیا کی تمام قوموں کے درمیان امن اور دوستی کے لئے جدوجہد کی۔

جواہر لال نہرو نے امن و ترقی کے استحکام میں جو حصہ ادا کیا، اس سے ہم اپنے ملک میں بخوبی واقف ہیں اور اس کی بہت ستائش کرتے ہیں۔

قومی آزادی کی جدوجہد کے رہنما کی حیثیت سے ان کے غیر معمولی اہم رول اور ہندستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے انھوں نے جو زبردست کام انجام دیا اس سے بھی ہم بخوبی واقف ہیں۔

جواہر لال نہرو کا نام سوویت عوام کو اس لئے بھی پیارا ہے کہ وہ ہندستان اور سوویت یونین کے عوام کے درمیان دوستی اور تعاون کے زبردست حامی تھے۔

نہرو کی جو تصانیف روسی زبان میں شائع ہوئیں ان میں 'میری کہانی'، 'تلاش ہند' اور ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے متعلق تقریریں شامل ہیں جو سوویت عوام میں بہت مقبول ہوئیں۔ کئی اہم سوویت شخصیتوں ادیبوں اور فنکاروں نے حقیقی ستائش کے جذبے کے ساتھ نہرو کے بارے میں لکھا۔ سوویت مفکرین ان کی زندگی اور کام کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لیتے ہیں۔ سوویت یونین میں ہم اس بات کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان دوستی کے بندھنوں کو مضبوط بنایا جائے اور ترقی دی جائے۔

جواہر لال نہرو کے متعلق سوچتے ہوئے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں ہی انھوں نے کتنی زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ عوام کے ذہن پر انھوں نے کتنا روشن تاثر چھوڑا، اور عصری دنیا کے اہم ترین مسائل کے تصفیہ کے سلسلہ میں انھوں نے کتنا زبردست اثر ڈالا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جواہر لال نہرو ایک ذہین اور بے مثال شخصیت، بہت زیادہ باصلاحیت انسان، گہری دانائی، تبحر علمی، جوشیلے مزاج، آہنی عزم اور زبردست کشش کے مالک تھے۔

ان کو شخصی طور پر جاننے والوں میں اکثر اس کی شہادت دیں گے مگر اس کا سب سے بہترین ثبوت تو خود ان کی متنوع سرگرمیوں سے ملتا ہے۔ نہرو کو ہم ایک مفکر کی حیثیت سے، مضمون نگار کی حیثیت سے، ڈپلومیٹ کی حیثیت سے، سیاستداں کی حیثیت سے اور عوامی تحریک کے رہنما کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

ان ساری صلاحیتوں اور سرگرمیوں کے بھرپور تنوع کے باوجود ان کے پاس کوئی ایسی چیز بھی تھی جس نے انہیں اعلیٰ کردار کا مالک بنا دیا تھا اور وہی ان کی شریفانہ روح کی اصل بنیاد تھی۔ وہ چیز کیا تھی؟ کئی لوگوں نے اس سوال پر غور کیا ہے اور ہر ایک نے اس کا ایک الگ جواب اور الگ وضاحت پیش کی ہے میں بھی اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

جواہر لال نہرو ایک عظیم انسان دوست تھے اور وہ بھی اس لفظ کے وسیع تر مفہوم میں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے لئے پیار اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی ستائش ان کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔

نہرو نے لکھا تھا "انسان کا یہ جذبہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ انسان نے زمانہ قدیم سے اپنی لاتعداد ناکامیوں کے باوجود، اپنی زندگی اور اپنا سب کچھ ایک تصور کے لئے، سچائی کے لئے، ایقان کے لئے، ملک کے لئے اور عزت کے لئے قربان کردیا ہے۔ وہ تصور بدل سکتا ہے مگر قربانی کا جذبہ بدستور باقی رہتا ہے اور اسی وجہ سے انسان کے لئے بہت کچھ معاف کردیا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر سے امید کا اٹھ جانا ناممکن ہے۔ تباہیوں کے درمیان میں بھی اس نے اپنے وقار کو یا ان قدروں کو جنھیں وہ عزیز رکھتا ہے اور اپنے اعتماد کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے"۔ (تلاش ہند۔ صفحہ ۱۱)

نہرو کی انسان دوستی، انسان سے مجرد محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہے اور وہ صرف اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی تعریف تک ہی محدود نہیں تھی۔ ان کی انسان دوستی کے اس سے بھی زیادہ گہرے معنی تھے۔ انسان کا حال اور مستقبل، ایک آزاد شخصیت کی تشکیل جو بھرپور اور ہم آہنگ طور پر ترقی پائے، اس سے نہرو کو تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے تعلیم، تہذیب اور سائنس کے مسائل سے گہری دلچسپی ظاہر کی۔ پنڈت نہرو ہماری صدی کو سائنس کا عہد، انسانی ذہن کی لامحدود ترقی اور جمہوریت و انسان دوستی کا عہد قرار دیتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ جواہر لال نہرو یہ بھی جانتے تھے کہ ہر فرد کا مستقبل، اس کے ملک اور اس کے عوام کے مستقبل سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ فرد کی نشوونما اور ذہنی تشکیل پر سماج اور عوام کا بھرپور اثر پڑتا ہے۔ فرد پر سماج کا یہ اثر شدید قسم کے

کو ہو کتی اور اس کو مفلوج بناتی رہیں اور لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کو مفلسی کا شکار بنا کر، فاقہ کشی ان کی قسمت میں لکھ دی ۔ نہرو اپنی ساری زندگی کے دوران ، استبداد اور عدم مساوات کے سب سے بڑے دشمن رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی جبکہ ہندوستانی عوام آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے ، نہرو نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ سیاسی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد اہم اقدامات کرنے ہوں گے ، تاکہ ہندوستانی عوام کی ہمہ جہتی سماجی ، معاشی سیاسی و ذہنی ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں ۔ ملک کی صنعتی ترقی ، پبلک سیکٹر کا قیام ، پانچسالہ پلانوں پر عمل درآمد ، زراعت کی ترقی اور ہندوستان کے قومی کلچر کی ترقی جیسی بنیادی پالیسیوں کی تشکیل اور عملدرآمد کے ساتھ آزاد ہندوستان میں نہرو کا نام ہمیشہ وابستہ رہے گا ۔

جواہرلال نہرو ہمیشہ اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے ۔ لیکن ان کی نظر میں ، ہندوستان کا مستقبل ، ساری دنیا اور ساری انسانیت کے مستقبل سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ان کے ملک کو تعمیر تخلیق کے لئے سازگار حالات کی ضرورت ہے ۔ نہرو کا کہنا تھا کہ اگر تشویش و پریشانی کی ماری دنیا کو جنگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو مستقبل کے نئے ہندستان کے سارے خواب ملیا میٹ ہو جائیں گے ۔

عالمی تہذیب کے مستقبل سے بھی نہرو کو گہرا تعلق خاطر تھا ۔ انھوں نے واضح طور پر اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ بنی نوع انسان کی اعلیٰ ترین انسان دوست امنگوں کی تکمیل انسانیت ، ادر ہر قوم اور ہر فرد کی ترقی کے لئے امن ضروری ہے ۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا "امن کی حفاظت اور اس کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کی حفاظت ہمارا فریضہ ہے ۔ آیئے کہ اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے ہم اپنی توانائیوں کو یکجا کریں اور ایک دوسرے سے رفاقت و طاقت حاصل کریں" ۔ (جواہرلال نہرو کی تقریریں ، صفحہ ۱۳۶)

نہرو کے اندر کے انسان دوست نے جنگوں کے خلاف ، جنگ بازی کے جذبے اور تباہی کے خلاف محض اس لئے بغاوت نہیں کی تھی کہ جنگیں افراد اور قوموں کی تخلیقی قوتوں میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور مادی قدروں کو تباہ کر دیتی ہیں بلکہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ جنگجویانہ ذہنیت انسان کی روح کو مجروح کرتی اور ذہنی طور پر اسے گھٹیا بنا دیتی ہے ۔ انھوں نے کہا "ہم نے

ایک عظیم تہذیب کی تعمیر کی ہے اور اس کی کامیابیاں قابل قدر ہیں۔ اور ان سے مستقبل میں اور زیادہ عظیم کامیابیوں کی امید پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگرچہ یہ مادی کامیابیاں بہت عظیم ہیں، اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تہذیب و تمدن کی اصل بنیاد سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ کلچر اور تہذیب و تمدن کا تعلق انسان کے ذہن اور اس کے رویہ سے ظاہر ہوتا ہے، ان مادی علامتوں سے نہیں جو ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں تہذیبی عمل رک جاتا ہے اور ہم انسانی ذہن کے کسی وحشیانہ دور میں واپس ہو جاتے ہیں۔" (جواہرلال نہرو کی تقریریں، صفحہ ۱۴۳)

نہرو نے بڑی سرگرمی کے ساتھ امن کی حفاظت کی۔ اس کے استحکام کے طریقوں کی تلاش کی اور انھیں پالیا۔ آزادی کے بعد سے اپنی موت تک، ہندستان کی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے نہرو نے ہندستان کی خارجہ پالیسی کو مرتب کرنے اور اس پر عمل کرنے میں شخصی طور پر حصہ لیا۔ انھوں نے ناوابستگی کی پالیسی کو مرتب کرنے اور اس کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا اور اس پالیسی کو ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم راستہ قرار دیا۔ انھوں نے مکمل اور عام ترک اسلحہ، نیوکلیائی ہتھیاروں پر پابندی اور ملکوں کے درمیان جھگڑوں کے پرامن تصفیہ کی ہمیشہ تائید کی۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ نہرو نے پرامن بقائے باہم کو ہمارے عہد میں، بین الاقوامی تعلقات کا ایک بنیادی اصول قرار دیا تھا۔ جنگ کے خلاف امن کے لئے اور مختلف سماجی نظام رکھنے والے ملکوں کے درمیان پرامن بقائے باہم کے لئے نہرو نے جو کوشش کی ہم سوویت یونین میں اس کی بہت قدر کرتے ہیں۔

جواہرلال نہرو کی خارجہ پالیسی اور ان کا کام انھیں ہندوستان کی صدیوں پرانی انسان دوستی اور امن پسندی کی روایات کے پیرو کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

انھوں نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا "مجھے توقع ہے کہ جہاں ہندستان تمام مادی شعبوں میں بلاشبہ عظیم حصہ ادا کرے گا، وہیں وہ ہمیشہ انسان دوستی کے جذبے پر بھی زور دے گا اور مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس وقت دنیا جس تصادم سے دوچار ہے، اس میں بالآخر انسانی جذبے کو ہی ایٹم بم پر برتری حاصل ہوگی" (ہندستان کی خارجہ پالیسی۔ منتخبہ تقاریر صفحہ ۱۳)

ہندوستان کے اس عظیم فرزند، جواہرلال نہرو نے درحقیقت اپنے عہد، اس کی بڑھتی ہوئی رفتار، تبدیلیوں اور موڑ، ماضی کے ساتھ اس کے رشتوں اور اس کے تعمیری اثر اور اس کی حرکت کے رجحان و سمت کو محسوس کر لیا تھا۔ نہرو نے ہمیشہ اپنے ملک کے عوام کی انقلابی سرگرمیوں پر بھروسہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے وقت کا ساتھ دیا اور وہ اپنے عہد کے فرزند تھے۔ وہ انسان کے حقوق آزادی اور تکمیل کی جدوجہد سے پوری طرح باخبر تھے تاکہ انسانوں کی ہرلحاظ و ہمہ جہتی ترقی کے حالات پیدا کئے جائیں، یہ جدوجہد اس وقت بھی جاری ہے۔

اس طرح اگر ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے جواہرلال نہرو کی شخصیت کی آج کی دنیا میں اتنی اہمیت ہے تو ہمارا جواب ہوگا انسان دوستی، ترقی، آزادی، مساوات اور عدل و انصاف کی فتح کے لئے اُن کی مسلسل کوشش، اور اگر ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ اُن کی شریفانہ شخصیت اور کردار کی خصوصیت کیا تھی تو ہمارا جواب ہوگا انسانوں کے لئے پیار، ترقی سے پیار۔

روش صدیقی

رباعیات

سب نقشِ قدم، چھپا دئے ہیں میں نے
سجدوں کے نشاں مٹا دئے ہیں میں نے
جب سے دیکھا ہے خلوتِ دل میں تجھے
لاکھوں پردے گرا دئے ہیں میں نے

خوابِ شبِ ہجر بھول جانے دے مجھے
اب حسرتِ دید کو جگانے دے مجھے
فردا نے پہن لیا، لباسِ امروز
اے حسنِ ازل! نقاب اٹھانے دے مجھے

کونین سے دور جا کے دیکھا ہے تجھے
شمعِ امکاں بجھا کے دیکھا ہے تجھے
کیا ذکر یہاں نگاہِ دل کا اے دوست
میں نے سب سے چھپا کے دیکھا ہے تجھے

کیا مرگ ہے کیا حیات، میں کیا جانوں
کیا ہے پسِ کائنات، میں کیا جانوں
اے حلقۂ زلفِ دوست عمر تو دراز
کہتے ہیں کسے نجات، میں کیا جانوں

شمس تبریز خاں آروی

جگر کا اسلوب تغزل

("آتش گل" کے آئینہ میں)

دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے کبھی جگر

حُسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی لطیف تر

جگر رئیس المتغزلین، جگر شہنشاہ تغزل، جگر سرمست الست، جگر حُسن شناسِ ازل، جگر شاعر محبت، جگر محرم حُسن و عشق، یہ سب تعارفی جملے اپنی جگہ صحیح اور درست مگر ایک تعارف ان سب سے آسان، عام فہم اور خاص الخاص یہ ہے کہ انھیں "آتش گل" کا شاعر کہدیا جائے یہ کہا اور اُن کا تعارف مکمل ہوگیا، اس آبرومند اور عظیم شاعر کا رُخ روشن روشنی میں آگیا، جیسے فردوسی اپنے شاہنامہ، سعدی اپنی گلستان، حافظ و خسرو اپنے دیوان، عرفی و نظیری اپنی غزل میر و غالب اپنے اردو دیوان سے زندہ ہیں اور زیادہ تر انھی حیثیتوں سے متعارف، عجب نہیں کہ جگر کے ریاض شعر کی بہار بھی "آتش گل" ہی سے تر و تازہ رہے۔ نظریۂ ارتقا عالم آب و گل کے لئے صحیح ہو یا نہ ہو عالم فکر و خیال میں تو ایک عام بات ہے، ایک ذی شعور، بالغ النظر، اور حساس شاعر و مفکر ہر وقت تصادم افکار کی کشمکش دیکھتا ہے اور عبرت و بصیرت حاصل کرتا ہے اور ہر بعد اپنے کو عالم معنی کے نئے اور بلند مقام پر پاتا ہے جہاں کی جلوہ طرازیاں پچھلی منزل کی نقش آرائیوں کو ماند کر دیتی ہیں، شعر کا بنیادی جذبہ حسن و عشق ہیں، احساس حسن اور شعور محبت دونوں ہی مل کر شعر کی تخلیق کرتے ہیں، شاعر جب کسی چیز سے یا زندگی کے کسی رُخ سے متعلق اظہار خیال کرتا ہے تو تحت الشعور میں یہی جذبات کارفرما ہوتے ہیں، یہ تعلق اور

جذباتی لگاؤ، عظمت، اہمیت، اور عشق و محبت کے مختلف مظاہر میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ تاثیر و تاثر کی کمی زیادتی، شاعر کے اسی جذباتی تعلق کی کمی بیشی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ شاعر کے "دل گداختہ" کا شدید تاثر ہی تاثیر کی بنیاد ہے اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

در اصل باغ سخن کی بہار ہی خونِ جگر کی تردستیوں سے ہے:

ریاضِ شعر کی خونِ جگر سے آبیاری کر جو یہ کر لے تو پھر بادِ خزاں سے کچھ نہیں ہوتا
غزل سوزِ دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے فقط رنگینیٔ حسنِ بیاں سے کچھ نہیں ہوتا

یہ جذبۂ محبت اپنی فکر و نظر کی پستی و بلندی کے ماتحت، شجر و حجر سے، باغ و چمن سے، در و دیوار سے، دیارِ یار سے، رخ و گیسو، کاخ و کو اور من و تو سے متعلق ہوتا رہتا ہے، یہی تعلق وطن، قوم، خاندان، انسان، کائنات سے گذر کر خالقِ کائنات تک جا پہنچتا ہے، محبت عالمگیر ہی نہیں ہمہ گیر بھی ہے، ارض و سما، موت و حیات، کائنات و ورائے کائنات، حقیقت و مجاز، زندگی اور بعد زندگی کے ہر رخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، صحیفۂ فطرت کا کوئی گوشہ اور کائنات قدرت کا کوئی گوشہ اس کی جلوہ آرائیوں سے خالی نہیں، جگر بھی تو کہہ گئے ہیں:

یہ فلک یہ ماہ و انجم یہ زمین یہ زمانہ ترے حُسن کی حکایت مرے عشق کا فسانہ

عشق و محبت کی اپنے متعلقات کی وجہ سے مختلف تقسیمیں کی جاتی ہیں مگر بڑی تقسیمیں دو ہی ہیں حقیقت و مجاز، محبوب اصلی اور معشوق حقیقی کی ذات و صفات کے ماسوا کے تمام تعلقات مجاز کے ذیل میں آتے ہیں، عشق مجاز باوجود اپنی ہیچ مائگی، تہی دامنی، اور بے بساطی و بے ثباتی کے عشق حقیقی کے کبھی کبھی متوازی اور بالکل ساتھ ساتھ چلتا ہے کہ مبتلائے مجاز اپنی خود فریبیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے:

رق الزجاج ورقت الخمر
فتشابہا فتشاکل الامر

بحرِ عشق کے یہ دونوں دھارے دل کے سرچشمہ سے نکلتے ہیں مگر باہمی امتیاز قائم رہتا ہے،

دیکھنے میں تو کوئی خاص فرق و امتیاز نظر نہیں آتا مگر ان کی معنوی کیفیات اور باطنی خصوصیات بالکل ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں :

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

عشقِ مجاز بھی دیارِ عشق میں شرک و گناہ سے کم نہیں مگر یہ ابتلا ئے عام خواص کو بھی پیش آکر رہتی ہے، حُسنِ حقیقت کے عاشقِ صادق حضرت ابراہیمؑ بھی منزل تک پہنچنے سے پہلے، ستاروں کی چمکوں آفتاب کی کرنوں اور ماہتاب کی تجلیوں میں کھو گئے مگر جیسے ہی پردۂ شب چاک ہوا آفتابِ حقیقت گریبانِ سحر سے طلوع ہوگیا، غبارِ مجاز ہٹا اور کعبۂ حقیقت سامنے آگیا، راہِ مجاز کی واماندگیوں کے بعد تجلیاتِ عشق کی چشمکیں شروع ہوتی ہیں جہاں حقیقت و مجاز کبھی ہم رنگ و ہم شکل ہو جاتے ہیں ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود — گاہ اُلجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں

یہ سالکِ طریق ہی کی کوتہ نظریاں ہوتی ہیں جو حقیقت کا تابناک رخ سامنے نہیں آنے دیتیں ورنہ حُسنِ حقیقت تو روش روش پر بے نقاب ہے :

برچہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ

جُرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرستِ ماست

عارفوں کا کہنا ہے المجاز قنطرۃ الحقیقۃ ، صلاحیت مند طبیعتیں اپنی سلامتیٔ طبع، اور فطری استعداد کی دستگیری سے بھٹکنے نہیں پاتیں، اور ایک نہ ایک دن رہروِ مجاز بھی منزلِ حقیقت تک پہنچ ہی جاتا ہے :

رہرواں را خستگیٔ راہ نیست — عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

رندی و ہوسناکی کی لغزشیں کبھی رہنما بن جاتی ہیں، اور اس راہ کی مستانہ خرامیاں ہی کام آجاتی ہیں :

؎ غش کھا کے داغؔ یار کے قدموں پہ گر پڑا — بے ہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

عشق و محبت کی راہ میں صلاحیت و استعداد درکار ہوتی ہے تیز گامی یا سبک خرامی سے یہ راہ طے نہیں ہوتی جاذبۂ توفیق، اور دستِ غیب جب چاہے اپنی طرف کھینچ لے اور جس راہ سے چاہے خود تک پہنچادے۔ ع

تو و تطع منازلہا من و یک لغزش پائے

عشق و ہوس کے انسانی جذبات اس حد تک مشترک ہوتے ہیں کہ امتیاز مشکل ہوجاتا ہے، حقیقت و مجاز دونوں کے شیدا بیخودی و سرمستی، جذب و جنوں، جوش و خروش، شیفتگی و فریفتگی کا یکساں مظاہرہ کرتے ہیں مگر دونوں کا فرق و امتیاز عاشق بقدرِ ظرف ہی محسوس کرتا ہے دوسرے بے نیازِ عشق و ہوس اس کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں:

عاشق نہ شدی، محنت الفت نہ کشیدی کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید؟

عرفائے طریق اور صوفیائے کرام انہی جذبات و احساسات کا رُخ مجاز سے حقیقت کی طرف موڑ دیتے ہیں، پرواز اور شوقِ سفر پورے زور شور سے جاری رہتا ہے صرف سمت سفر بدل جاتی ہے، مجاز کی بھول بھلیوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹا کر حقیقت کی سیدھی شاہراہ پر لگا دیا جاتا ہے جہاں پہنچ کر سالک بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

اور پھر شاہدِ رعنائے حقیقت کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے کفر کو بہ یک جنبشِ نگاہ ایماں بنا دیا۔ ع

کفر آوردم و در عشق تو ایماں بُردم

یہ خوش بختی کبھی کبھی سامنے آتی ہے جب زلفِ گرہ گیر ہی بامِ حقیقت کے لئے کمند بن جاتی ہے اور نامۂ غیبؔ کی نکہت عطر بیز کسی "مشکیں کلالہ" کے حلقۂ گیسو سے آنے لگتی ہے:

آں نافۂ مراد کہ می خواستم زغیبؔ در چینِ زلف آں بُتِ مشکیں کلالہ بود

جگر بھی انہی خوش نصیبوں میں تھے جو مجاز کے رستے منزل حقیقت تک پہنچے، اور ایک لغزش پاہی سے سارے مرحلے طے ہو گئے۔ رندی و ہوسناکی نے آگ بھڑکائی، ہوائے مجاز نے ہوا دی، اس طرح گرمیٔ سینہ کا سامان ہوا اور وہ "صحبت عشق" کے محرم راز ہو گئے۔ جگر کی یہ تبدیلی ان کی صحت ذوق، سلامتی طبع اور فطری حقیقت پسندی کے ہاتھوں ہوئی مگر اس میں بہت کچھ دخل حضرت اصغر کی عارفانہ صحبت، اور شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری کی طبیعت کو بھی تھا، جس پر مزید جلا، مولانا سید سلیمان ندوی اور اعظم گڈھ کی صحبتوں سے بھی ہوئی، علما، صوفیا، اور دوسرے اہل دل حضرات سے جگر کو ایک نسبت خاص تھی جو اندر اندر اپنا کام کرتی رہی۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب لکھتے ہیں:

"..... اس زمانے میں انھیں اپنی غزلوں میں رندانہ سرمستی اور عارفانہ معنویت کا احساس ہوا، یہ ان کے ذہن کا تعمیری دور ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس میں وہ اثرات نمایاں طور پر شامل ہیں جنھیں میں علیگڈھ، اعظم گڈھ اور اصغر کے اثرات سے تعبیر کرتا ہوں۔ اسی زمانے میں انھیں اپنے جوہر بھی نظر آئے۔ خودشناسی کی اس منزل میں فن کا دامن بھی ان کے ہاتھ میں آ گیا..... اس وقت جگر کی عمر ۲۸، ۳۰ کے درمیان تھی، اصغر، سلیمان ندوی، اقبال سہیل، مرزا احسان احمد، رشید احمد صدیقی اور دوسرے ادیبوں، شاعروں کی صحبت میں ان کے ذہن پر جلا ہو رہی تھی۔۔ ان محترم دوستوں اور بزرگوں کی صحبت میں جگر کو جدید فنی غزل گوئی کے اسرار و رموز کا علم ہوا۔ حیات و کائنات پر نظر ڈالنے کے طریقے ہاتھ آئے، نفس مذہب اور تزکیۂ باطن پر غور کرنے کے راستے دکھائی دئے، انھیں صحبتوں کے بعد سے جگر حسن و عشق کے مسائل بیان کرنے میں تصوف کے رموز و علامات سے کام لینے لگے۔ اور مذہب و اخلاق کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرنے لگے جو "رندی و ہوسناکی" کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، ان کی بیخودی میں جس ہشیاری کی نمو ہو رہی تھی وہ عالمانہ کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان زندہ کتب خانوں سے زندہ اور گہرے روابط کا نتیجہ تھی..... شعلۂ طور کا دور چہارم اور آتش گل اسی شعور کا نتیجہ ہیں۔"

(جگر کی شاعری، موثرات و محرکات، فروغ اردو جگر نمبر ص۲۵۶)

"شعلۂ طور" کی لپک اور لہک، چمک دمک اور تب و تاب اپنی جگہ مسلم مگر "آتش گل" کی لطافت و نزاکت، تمانت و حرارت، رنگ و نکہت، دوامیت اور ماورائیت کا عالم ہی کچھ اور ہے "حسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی بلند تر" "شعلۂ طور" کی آتش سیال بھی گرمیٔ طبع کا سامان رکھتی ہے مگر "آتش گل" سے نچڑی ہوئی شراب لطیف کی خوشگواریوں کے کیا کہنے؟ اسے تو خمستانِ ازل، اور میخانۂ الہام کے مست الست ہی سے پوچھئے ؎

لطفِ ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی

لطفِ زبان اور حسنِ بیان، نورِ معنی، روشنیٔ خیال، جمالِ ہیئت اور جلالِ ماہیت، حسنِ طبیعت، اور سوز دروں، جب شعر میں ڈھلتے ہیں تو جگر کی شاعری وجود میں آتی ہے۔ جس سے "شعلۂ طور" کی لپک، اور "آتش گل" کی لطیف چمک عیاں ہوتی ہے۔ اور ان کی شاعری نور و سرور بن کر دل و نظر پر چھا جاتی ہے، اور جو عارف و عامی، رند و صوفی، بے دل و صاحب دل دونوں کو متاثر و مسحور کرتی ہے ؎

برنگ اربابِ صورت را، بو اصحابِ معنی را

"شعلۂ طور" کا دور چہارم اور "آتش گل" وہ آخری نقطۂ عروج ہے جہاں جگر کی حسنِ مساعی سے غزل پہنچ گئی ہے۔ شعلۂ طور "حقیقت و مجاز" کا سنگم تھا جہاں دونوں دھارے گلے مل رہے تھے، آتش گل بحر عرفاں ہے جہاں شراب معرفت و محبت بہتی ہے۔ ایک گلستانِ معنی ہے جہاں کی ہوائیں بھی محبت کی خوشبو میں بسی ہوئی ہیں جہاں کی فضا پر صرف معرفت، حقیقت اور محبت چھائی ہوئی ہے جہاں حسن و عشق ہیں، ناز و نیاز ہیں، حرف و حکایت ہیں، اسرار و رموز ہیں، نور و نکہت ہیں، سارے راز و اسرار بے حجاب، تمام جلوے بے نقاب، اِدھر سے پرستش اُدھر سے پرسش، اِدھر سے عبادتِ بے نہایت، اُدھر سے لطفِ بے غایت، اِدھر سے انفعال، اُدھر سے استقبال، اِدھر سے عشق کی نیازمندیاں، اُدھر حسن کی نازبرداریاں، اِدھر عشق کی سرمستیاں، اُدھر حسن کی سرشاریاں، ؎

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں	ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
جس رنگ میں دیکھا اسے وہ پردہ نشیں ہے	اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

مجھ کو سب معلوم ہے افسانۂ برق و کلیم　　　میرے دل کا ذرہ ذرہ وادیٔ ایمن میں تھا

یہی وہ عالم ہوتا ہے جہاں ازل و ابد ٹھہرے ہوئے ملتے ہیں، جہاں حجاب دوئی اٹھ جاتا ہے، اور غیب حضور، اور شنید، دید اور ہست و بود، وجود شہود میں بدل جاتے ہیں لسان الغیب حافظؒ نے اسی مقام سے کہا تھا:

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند　　　وندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

اسی شبستانِ حقیقت میں خسروؒ نے بھی ایک نورانی رات کے چند لافانی لمحات گذارے تھے:

خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسروؔ　　　محمدؐ شمع محفل بود، شب جائے کہ من بودم

خود جگرؔ نے اس "مقام بے مقام" کی نشاندہی کی ہے:

اول اول ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں
آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا

"شعلۂ طور" میں حقیقت و مجاز کے جلوے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں ارضیت کے ساتھ ماورائیت کی زیریں لہریں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں، مگر وہ خالص، بے لوث، بے میل شراب زلال، "آتشِ گل" ہی کے پیمانہ میں ملتی ہیں۔ جگر نے شعلۂ طور کا معنی خیز عنوان رکھا تھا جو ان کے روحانی مستقبل کی خبر دے رہا تھا:

ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر　　　نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

اور پہلی غزل تو ان کے رنگِ طبع اور افتادِ مزاج کی صاف غمازی کر رہی تھی:

تجھی سے ابتدا ہے تو ہی اک دن انتہا ہوگا
صدائے ساز ہوگی اور نہ سازِ بے صدا ہوگا

"شعلۂ طور" کی گرمی سے شراب سخن پہلے ہی سے کیف آور تھی، "آتشِ گل" کی نرم آنچ نے اسے دو آتشہ بنا دیا۔ تاڑنے والوں نے شعلۂ طور دیکھ کر ہی "آتشِ گل" کے شاعر کے خط و خال پہچان لئے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے فراست ایمانی سے اس نورِ عرفانی کو دیکھ لیا تھا جو جگرؔ کے کلام میں جھلک

۔ا تھا، لکھا تھا:

جگر کی شاعری میں نہ زلف وشانہ، نہ سرمہ وآئینہ، نہ ہوس بالائے بام، نہ شکایت منظر عام ...
وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا اشتیاق نظر ہے، وہ اس کے حجاب کو اپنے
رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر اٹھا نہیں سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے
مگر دیکھ نہیں سکتا ... جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے
اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک، اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی
شاہراہ کو، اور مےخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقیٔ کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے
جگر بہ ظاہر سرشار، مگر درحقیقت بیدار ہے۔ اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہوشیار ہے
اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو

"دوستاں عیب نظربازیٔ حافظ مکنید — کہ من او را ز محبان خدا می بینم"

(۷، مئی ۱۹۳۳ء)

ایک غزل میں جگر عمر رفتہ پہ ماتم کرتے ہیں اور مجاز کی طلسم بندیوں کے شکوہ گزار ہیں:

یہ راز ہم پہ ہوا نہ افشا کسی کی خاص اک نظر سے پہلے
کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی، ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے

یہ زندگی خاک زندگی تھی گداز قلب و جگر سے پہلے
ہر ایک شے غیر معتبر تھی، ترے غم معتبر سے پہلے

کہاں یہ شورش، کہاں یہ مستی، کہاں یہ رنگینیوں کا عالم؟
زمانہ خواب و خیال سا تھا، ترے فسون نظر سے پہلے

مری طبیعت کو حسن فطرت سے ربط باطن نہ جانے کیا تھا
مری نگاہیں کبھی نہ اٹھیں، طہارت چشم تر سے پہلے

ہمیں تھے کیا جستجو کا حاصل، ہمیں تھے کیا آپ اپنی منزل
وہیں پہ آکر ٹھہر گیا دل، چلے تھے جس رہ گزر سے پہلے

کہاں تھی یہ روح میں لطافت، کہاں تھی کونین میں یہ وسعت

حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

اپنے اس روحانی انقلاب کے بعد "حقیقت و مجاز" کے فرق و امتیاز کو اس طرح واشگاف کرتے ہیں:

سودا جو اب ہے سر میں وہ سودا ہی اور ہے ——— اس کا چمن ہی اور ہے صحرا ہی اور ہے

جو حسن شش جہت سے نہ سیراب ہو سکی ——— محسوس اب ہوا وہ تمنا ہی اور ہے

خود حسن، استعارہ ہو جس کے جمال کا ——— وہ جانِ حسن حسنِ سراپا ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند ——— شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے

صورت میں یہ فروغ یہ جذب و کشش کہاں ——— در پردہ کوئی شاہدِ معنی ہی اور ہے

یہ حسنِ رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا جگرؔ

کیا کیجئے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے

عالم خاک سے عالم پاک، عالم آب و گل سے عالم دیدۂ دل کی طرف پرواز کرنے کے بعد کہتے ہیں:

شاہد و ساقی و بہار سے دور ——— یعنی ہر کیف مستعار سے دور

ہے خزاں اپنی ہر خزاں سے الگ ——— ہے بہار اپنی ہر بہار سے دور

خطرۂ موت ہے نہ فکر حیات ——— نشہ ہی نشہ ہے خمار سے دور

پرتوِ حسنِ ذات سے نزدیک ——— سایۂ زلفِ تابدار سے دور

ایک حقیقت خیال سے برتر ——— اک جہاں چشم روزگار سے دور

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں

حسن ہے نقصِ اعتبار سے دور

"آتش گل" کی پہلی غزل نشۂ عرفاں سے سرشار و مخمور ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہر حقیقت کو باندازِ تماشا دیکھا ——— خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

جستجو میں تری یہ حاصلِ سودا دیکھا ایک ایک ذرہ کا آغوشِ طلب وا دیکھا

ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا جو یہ کہہ دے کہ ترا حسن سراپا دیکھا

دلِ آگاہ میں کیا کہیے جگر کیا دیکھا
لہریں لیتا ہوا اک قطرے میں دریا دیکھا

ایک عارفانہ غزل کے چند شعر اور جن میں یہ رنگ اور گہرا ہو گیا ہے:

شعر و نغمہ، رنگ و نکہت، جام و صہبا ہو گیا زندگی سے حسن نکلا اور رسوا ہو گیا

اور بھی آج اور بھی ہر زخم گہرا ہو گیا بس کر اے چشمِ پشیماں کام اپنا ہو گیا

اس کو کیا کیجے زبانِ شوق کو چپ لگ گئی جب یہ دل شائستۂ عرضِ تمنا ہو گیا

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے تھے دفعتاً ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا محوِ روئے لیلیٰ ہو گیا

عشق کی فراموش کاریاں، اور محبت کی وفا شعاریاں دونوں رُخ ایک ہی غزل میں نکھر گئے ہیں:

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا، مجھے یہ بھی نہ رہا یاد شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے اب تک وہ اک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

مذکورہ غزلوں کا تقریباً ہر شعر اس لائق ہے کہ اس پر الگ اور مستقل بحث کی جائے اور اس کے حسن کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے۔ مگر اس قسم کی تشریح سے اندیشہ ہے کہ ان غزلوں کی وحدتِ تاثر اور یکرنگیٔ تاثیر کو صدمہ پہنچے گا۔ یوں بھی جو حسن گلدستہ میں ہے وہ پھولوں کی انفرادیت میں

نہیں اور نہ پھولوں کا حسن اس بد مذاق کی تاب لا سکتا ہے کہ برگ گل کو اوراق پریشاں بنا کر ان کا تجزیہ کیا جائے، اور پھول کی نزاکت و لطافت، رنگ و بو الگ کر کے اسے دیکھا جائے۔

جگر کی شاعری پر کچھ نقادوں کو ایک اعتراض ہے کہ ان کے یہاں فکر خیز اور خیال انگیز اشعار نہیں ملتے، جگر اکثر الفاظ سے کھیلتے ہیں، اور معنی کی تکرار کرتے ہیں اور ان کی غزلوں کا بھرم اور وقار ان کی جادو جگانے والی آواز اور ان کے مسحور کن ترنم پر ہے۔ آج جبکہ نغمہ کا تعلق ان کی غزلوں سے باقی نہیں اور وہ جادو جگانے والی آواز کئی سال ہوئے گم ہو چکی ہے۔ ان کی غزلوں کی مقبولیت اس بات کی بھرپور تردید ہے، پھر بھی ہم جستہ جستہ جگر کے فکر انگیز اشعار پر نگاہ ڈالتے ہیں، آتش گل کی پہلی غزل کا ہر شعر اپنی جگہ فکر انگیز ہے خصوصاً پہلا شعر:

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

فکر و نظر کے کتنے دریچے کھول دیتا ہے۔ اسی معنی میں ایک اور غزل کا شعر ہے:

جلوہ بقدر ظرف نظر دیکھتے رہے   کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے

ایک اور شعر جس کی تشریح میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے:

حسن تو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق   کار معشوقانہ کرتا ہی رہا

ایک اور خیال انگیز شعر جسے اہل محبت ہی سمجھ سکتے ہیں:

حجاب عشق کو اے دل بہت غنیمت جان   رہے گا کیا جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا

اسی غزل کا مقطع کچھ کم فکر خیز نہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے   جب تک ہمارے پاس رہے، ہم نہیں رہے

جگر صاحب اسے فلسفیانہ رُخ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

کمالِ قرب بھی شاید ہے عین بُعد جگر   جہاں جہاں وہ ملے میں وہاں وہاں نہ رہا

"نئے انسان کی نادانی اور کافی نعمتی کا رونا روتے ہیں:-

یہ تو نے کیا کیا اے ناداں، فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں

جب تک انساں پاک طینت ہی نہیں
علم و حکمت، علم و حکمت ہی نہیں

وہ محبت، وہ عداوت ہی نہیں
زندگی میں اب صداقت ہی نہیں

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر
ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

نہیں جاتی کہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

ایک غضب کا فکر انگیز شعر جو ایک نیا تجربہ بھی ہے:

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

"نئی زندگی" پر اظہار خیال ہے:

وہی ہے زندگی لیکن جگرؔ یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

"نئے زمانہ" پر ماتم کرتے ہیں:

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالم انسانیت پر بار ہو جائے

ہلکی بحر میں کس سادگی سے مختلف مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں:

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت
اپنے ہی جلوے اپنے ہی سائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگائے، ہاتھ نہ آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

جگرؔ موت و فنا کے متعلق ایک واضح نظریہ رکھتے ہیں، نہ اس سے ڈرتے ہیں نہ بدکتے ہیں بلکہ

اسے بھی حسن و عشق کا ایک مقام سمجھتے ہیں اور حیاتِ نو کی تمہید قرار دیتے ہیں :

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ   موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا   موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر   عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

طولِ غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر   ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں؟

شاد کا نوک زبان شعر ہے۔ کشمکش حیات کے ایک رخ کو بے نقاب کیا ہے :

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

جگر کہتے ہیں :

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقین کی بات ہے   جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا

بلند فکر عرفی نے کہا تھا :

ز نقص تشنہ لبی داں، بعقل خویش مناز   دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

جگر بھی اسی فکر کا اظہار کرتے ہیں :

جنوں کم، جستجو کم، تشنگی کم   نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم

پھول وہی، چمن وہی فرق نظر کا ہے   عہدِ بہار میں تھا، دورِ خزاں میں کیا نہیں

تہذیب نو کے مارے ہوئے نئے انسان کی نفسیات سے جگر خوب واقف ہیں اور طنز کے بھرپور نشتر لگاتے ہیں :

غضب ہے، قہر ہے انسان کی یہ بوالعجبی   خود اپنا دوست بہت کم زیادہ تر دشمن

نئے انسان کی نادانی اور کافر نعمتی کا رونا روتے ہیں

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

اہل نظر جانتے ہیں کہ جگر کا اسلوب تغزل ان کے معاصرین کے تغزل کا نچوڑ ہے پھر.......
بھی امتیاز کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ اصغر حسن کے شاعر ہیں اور جگر عشق کے، حسرت محبوب کے اور جگر
محبت کے، فانی غم پسند کرتے ہیں اور جگر عرفان غم ـــــ اور اگر ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر حرف
آخر کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جگر کا کارنامہ "عرفان محبت" ہے۔ یہی وہ خصوصیات جن کی وجہ سے
رشید احمد صدیقی صاحب نے پیش گوئی کی تھی کہ:

" بیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے ان دبستانوں سے اصغر اور فانی معرض خفا میں
آگئے۔ اصغر کے پیرو ان حق بھی معدوم ہونے لگے ہیں، اب صرف جگر رہ گئے ہیں۔ بنا ت
خود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ بحرانی و ہیجانی دور میں غزل جگر ہی کے سہارے بڑھے
گی، جگر کی شاعری میں وہ عناصر ہیں جو اس دور کے آشوب و آزمائش میں غزل کو تب و تاب
دیتے رہیں گے۔"

رشید صاحب کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، "آتش گل" کی غزلیں اس کی شاہد ہیں، اہل نظر
اس کے گواہ ہیں۔

رضیہ محسنی

مثنویات میر پر ایک نظر

اردو مثنوی کی تاریخ خاصی پرانی ہے ۔ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا عام رواج ہونے سے بہت پہلے دکن میں کثرت کے ساتھ مثنویاں لکھی جا چکی تھیں ۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے دکن کی پہلی اردو مثنوی "کدم راؤ اور پدم" ہے جو بہمنی دور کے مشہور شاعر نظامی کی تصنیف ہے ۔ اس کے بعد دکن کے جن شعرا نے مثنوی نگاری کی طرف توجہ کی ان میں اشرف بیابانی، نصرتی، وجہی، غواصی قابل ذکر ہیں ۔ ان لوگوں نے "چندر بدن مہیار" "قطب مشتری" "طوطی نامہ" "پھول بن" جیسی مشہور مثنویاں لکھیں ۔ شمالی ہندوستان میں میر سے پہلے اور ان کے زمانے میں بھی چھوٹی بڑی مثنویاں لکھی جا چکی تھیں لیکن ان کا چرچا عام نہ ہو سکا اور نہ ان کی پیروی کی گئی ۔ خود میر کے زمانے میں سودا اور قائم نے مثنویاں لکھیں لیکن انھیں وہ مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جو ان کے قصائد اور غزلیات کو نصیب ہوئی ۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں میر وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مثنوی کی صنف کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی ۔ غزل کے تو وہ امام مانے ہی گئے اردو مثنوی میں بھی ان کا وہی مقام ہے جو سودا کا قصیدے میں ۔

شمالی ہندوستان میں میر نے مثنوی کو ایک فن کی حیثیت سے رواج دیا اور عرصہ تک ان کی مثنویاں دوسرے مثنوی نگاروں کے لئے نمونہ کا کام دیتی رہیں لیکن میر کی مثنویوں کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مثنوی کی اہم خصوصیات اور مثنوی نگاری کے اصول و آداب پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے ۔

اصناف شاعری میں مثنوی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کئے جا سکتے ہیں ۔ مثنوی میں زندگی اور معاشرت کے سب ہی پہلو اخلاق اور فلسفہ کے مسائل

تصوف کے رموز وحقائق اور مذہبی تصورات تفصیل سے ادا ہوسکتے ہیں اس میں منظر کشی اور انسانی فطرت اور جذبات کی ترجمانی کا بہتر موقع ملتا ہے۔ کسی داستان یا قصہ اور واقعہ کے بیان کے لئے تمام اصناف شاعری میں مثنوی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ مثنوی کی اس وسعت اور ہمہ گیری کا سبب یہ ہے کہ اس کا ہر شعر ردیف اور قافیہ کی پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ مثنوی کے لئے اشعار کی مقرر نہیں ہوتی۔ یہ مسلسل نظم ہوتی ہے جس میں ربط کلام اور حسن ترتیب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کسی مثنوی کی خوبی کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے واقعات کا خاکہ کس طرح قائم کیا ہے۔ واقعہ کی ترتیب کیسی ہے، کس طرح قصہ کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملائی گئی ہے، جس واقعہ کو پیش کیا گیا ہے اس میں کونسا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔

مثنوی نگار کو کردار نگاری کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے، مثنوی میں سیکڑوں اشخاص کا ذکر آتا ہے۔ امیر غریب جوان بوڑھے بچے مرد عورت نوکر چاکر عالم جاہل وغیرہ وغیرہ۔ ان مختلف افراد کے اخلاق و آداب بول چال لباس مزاج کی کیفیت کو ایسے منفرد انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کردار اپنی نمایاں خصوصیات کے ساتھ ابھر کر پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔ اس کے لئے شاعر کو باریک سے باریک باتوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔

کردار میں اتحاد ہونا بھی ضروری ہے، ہر شخص کا ایک خاص کردار ہونا چاہئے۔ کسی فرد کے لئے ایک بار جو بیان دیا جائے بعد میں کوئی بات اس کے متضاد اور منافی نہ ہو۔ مثنوی نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ واقعہ نگاری کا بھی خاص خیال رکھے۔ واقعات کے جزئیات پر نظر رکھی جائے مثلاً اگر کسی شہزادے کا ذکر آئے تو اس کی شجاعت، جاہ وحشم، اس کے مزاج کی کیفیت اس کے عادات و اطوار پر بھی نظر ہونی چاہئے۔ اکثر معمولی سی بات سے واقعہ کی تصویر اس طرح کھنچ جاتی ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے سے بھی وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ واقعہ نگار کا فرض ہے کہ واقعہ کو اس طرح پیش کرے کہ دل میں اتر جائے۔ جذبات نگاری بھی مثنوی کی اہم خوبی ہے انسانی فطرت اور جذبات کا اظہار اس انداز میں ہونا چاہئے جو پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

زبان وبیان میں برجستگی و بے ساختگی بھی مثنوی کی خصوصیت ہے، مثنویوں میں واقعات تو وہی ہوتے ہیں جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں لیکن بعض شاعر اپنے تخیل کی آمیزش اور منفرد انداز بیان سے اس میں جان ڈال دیتے ہیں۔ یہ وہ اصول و آداب ہیں جو کسی مثنوی کا معیار متعین کرتے وقت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

میر نے چھوٹی بڑی، ۳۰ مثنویاں لکھیں۔ ان کی عشقیہ مثنویوں کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی مثنویوں میں موضوع کے اعتبار سے کافی تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے لیکن نسبتاً عشقیہ مثنویاں زیادہ اہم ہیں۔ میر کے یہاں جو سوز و گداز ہے وہ محض تخیلی اور جمالیاتی اثر کا نتیجہ نہیں، بلکہ میر نے اپنے ذاتی تجربۂ عشق اور اس سے متعلق واردات کو قلم بند کیا ہے میر کی عشقیہ مثنویاں ان کی ذاتی واردات قلب کی عکاس بھی ہیں اور اجتماعی ناسازگار حالات کا عکس بھی، وہ صرف ایک آپ بیتی ہی کی نہیں بلکہ جگ بیتی کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ان مثنویوں میں پاکیزہ جذبات سنہرے اور نیک خیالات کی بہتات ہے۔ میر کی مثنویوں کی اہمیت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس زمانے کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں جس زمانے میں میر نے مثنویاں لکھیں۔ اس وقت اردو پر فارسیت غالب تھی، شمالی ہند میں مثنویوں کا غالباً اچھا نمونہ موجود نہ تھا۔ میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں فارسی محاوروں کے ترجمے اور فارسی زبان کے بہت سے الفاظ جو اب متروک ہو گئے ہیں ملتے ہیں، میر کے مزاج میں شروع ہی سے خستگی اور برشتگی بسی ہوئی تھی۔ بچپن کے زمانے میں بھی کھوئے کھوئے رہتے تھے جو بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے اس کا عکس جس طرح ان کی غزلوں میں ملتا ہے اسی طرح ان کی مثنویوں میں بھی نمایاں ہے کیونکہ شاعر اپنے فن کے ذریعہ مخصوص عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ "اگرچہ شاعری براہ راست شخصیت کا آئینہ نہیں ہوتی بلکہ وہ حالات اور واقعات جو شاعر کو متاثر کرتے ہیں شاعری کی فانوس سے چھن چھن کر ہمارے سامنے آتے ہیں" شاعری مختلف لوگوں کے جذبات کا اظہار اپنی زبان میں کرتی ہے۔ میر کی عشقیہ مثنویاں اس کی مثال ہیں۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے عشقیہ مثنویاں کافی اہم ہیں۔ زبان کی سلاست و روانی برجستگی اور بے ساختگی قابل داد ہے۔ واقعات تو سادہ

ہیں لیکن شاعر نے اپنے تخیل کی آمیزش اور خوبصورت انداز بیان سے ان مثنویوں میں جان ڈالدی ہے۔

باوجود ان خوبیوں کے جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ان مثنویوں کے مطالعہ سے چند کمزور پہلو بھی سامنے آتے ہیں، مثلاً میر کے قصوں میں کوئی نیا پن نہیں ہوتا جہاں تک قصہ کی دلچسپی کا تعلق ہے واقعات سیدھے سادے ہوتے ہیں ان میں کوئی منفرد خصوصیت نہیں ملتی۔ میر کی مثنویوں کا ہر کردار ہمارے سامنے صرف ایک عاشق کی حیثیت سے آتا ہے جو کسی کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے رونا دھوتا رہتا ہے۔ اس کی وضع قطع، بول چال، مزاج کی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ان کی عشقیہ مثنویوں کا انجام زیادہ تر ہیرو ہیروئن کے خاتمہ پر ہوتا ہے۔ کردار نگاری بھی ان مثنویوں کی کمزور ہے۔ مثال کے طور پر میر کی عشقیہ مثنوی "شعلۂ عشق" کو ہی لے لیجئے۔ اس مثنوی کا ہیرو پرس رام ہے۔ اس پر اس کا ایک دوست عاشق ہو جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے لگتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد پرس رام کی شادی ہو جاتی ہے رفتہ رفتہ پرس رام دوست دیرینہ سے بے نیاز رہنے لگتا ہے۔ دوست کی شکایت پر پرس رام کہتا ہے کہ میری بیوی کچھ اس قدر مجھ سے مانوس ہو گئی ہے کہ وہ ایک پل کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ سن کر عاشق دیرینہ اس کی بیوی کی محبت کا امتحان لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ اس نے کچھ عرصہ کے بعد پرس رام کے مرنے کی جھوٹی خبر اڑادی کہ وہ دریا پر نہانے گیا تھا اچانک ڈوب کر ختم ہو گیا۔ اس خبر کو سن کر بیوی نے سرد آہ بھری اور زمین پر گر کر ختم ہو گئی۔ پرس رام نے جب بیوی کی موت کی خبر سنی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کیفیت ملاحظہ ہو:-

جگر غم میں ایک لخت خوں ہو گیا
اکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
کبھو یاد کر اس کو نالاں رہے
کبھی ٹک جو بھولے تو حیراں رہے

پرس رام کو ایک ماہی گیر سے پتہ چلا کہ رات کو دریا کے کنارے ایک شعلہ آسمان سے

انتہا ہے اور "پرس رام" "پرس رام" کہتا ہوا ساحل کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور پھر غائب ہوجاتا ہے یہ سن کر پرس رام دریا کی طرف روانہ ہوجاتا ہے اس کو وہی شعلہ نظر آتا ہے اور یہ اس کو پانے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور غائب ہوجاتا ہے۔ اس مثنوی کے کرداروں میں ہمیں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی بس جذبات کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔ جہاں تک کردار کے اتحاد کا تعلق ہے وہ ان کے یہاں پوری طرح نظر آتا ہے جس کردار کو پیش کرتے ہیں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو پہلے بیان کے متضا ہو۔

میر کی مثنویوں میں واقعہ نگاری کمزور نظر آتی ہے کیونکہ جس واقعہ کو وہ پیش کرتے ہیں اس جزئیات پر نظر نہیں رہتی مثلاً مثنوی "دریائے عشق" میں بھی ایک نوجوان کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے جو ایک مہ جبین پر عاشق ہوجاتا ہے لیکن لڑکی کے گھر والوں کو جب خبر ہوتی ہے تو لڑکی کو دایہ کے ساتھ ندی پار بھیج دیتے ہیں کہ اس طرح اس کا عشق ٹھنڈا پڑجائے گا۔ لیکن عاشق نامراد کو جب یہ خبر ہوتی ہے تو وہ بھی ساتھ ہولیتا ہے، دایہ اس نوجوان کو بہانہ سے دریا میں گرا دیتی ہے جب لڑکی کو اس کے جذبۂ عشق کا اندازہ ہوتا ہے تو وہ بھی واپس آتے وقت دریا میں گر کر وہیں پر جان دیدیتی ہے۔ مرنے کے بعد گھر والے آتے ہیں، دریا میں جال ڈالا جاتا ہے، دونوں کی لاشیں نکلتی ہیں۔ اس مثنوی میں اگرچہ اس نوجوان کے علاوہ کئی ضمنی کرداروں کا ذکر آیا ہے لیکن ان کے متعلق کوئی تصویر ہمارے ذہن میں نہیں بنتی۔ کیونکہ میر جزئیات پر نظر نہیں رکھتے۔

میر کی مثنویوں میں جذبات نگاری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے لئے ان کی مشہور مثنوی "خواب وخیال" کو ہی لے لیجئے۔ ایک زمانے میں میر کے جنون نے ایک عجیب ہی کیفیت اختیار کرلی تھی ان کو سرشام چاند میں ایک خوبصورت عورت دکھائی دیتی جو کہ رفتہ رفتہ چاند سے اتر کر میر کے پاس آکر بیٹھتی، رازو محبت کی باتیں کرتی اور صبح کے دھندلکے سے پہلے اوپر اٹھتی جاتی یہاں تک کہ پھر چاند میں جاکر غائب ہوجاتی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ میر کو جو چہرہ چاند میں نظر آتا تھا وہ یقیناً اسی عورت کا شبیہ تھا جس کے ساتھ ان کو میل خاطر تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو وطن چھوڑنا پڑا تھا اور جس کی یاد میں عمر بھر کھوئے کھوئے سے رہے۔ ان کی یہ جنونی کیفیت دیکھ کر عزیزودستوں

نے علاج معالجہ کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت معمول پہ آگئی۔ چاند سے پھر اس چہرے نے آنا یک قلم بند کر دیا۔ میر اس کیفیت کا ذکر کس انداز میں کرتے ہیں، ملاحظہ ہو ۔

خیال ان کا آئے کہ سُن ہو رہوں　　　تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں
مجھے آپ کو یوں ہی کھوتے گئی　　　جوانی تمام اپنی سوتے گئی
دکھایا نہ اس مہ نے تہ خواب میں　　　نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں
نہ دیکھا کبھی میر نے وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

میر نے بہت سی ایسی مثنویاں لکھی ہیں جن کا تعلق حسن وعشق کے جذبات سے نہیں بلکہ خارجی حالات اور واقعات سے ہے، مثلاً "در ہجو خانۂ خود"، "مرغ بازاں"، "شکار نامہ اول" قابل ذکر ہیں۔ شکار نامہ میں نواب آصف الدولہ کے شکار کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ اس میں جنگل، پہاڑ، دریائی جانور اور موسمی تبدیلیوں کا ذکر ہے۔ میر کے شکار ناموں کو پڑھ کر یہ تعجب ہوتا ہے کہ جس شخص کے لئے یہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی پائیں باغ کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اس نے خارجی موضوعات پر اس تفصیل کے ساتھ مثنویاں لکھیں لیکن میر کی اس قسم کی مثنویوں کو پڑھ کر یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے خارجی مضامین میں تخیل کی آمیزش سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ان مثنویوں میں خارجی مضامین ضرور ادا کئے ہیں لیکن ان کی مکمل تصویر نہ پیش کر سکے۔ کیونکہ ان کے یہاں خارجیت کم داخلیت غالب ہے۔

میر ہمیشہ اپنی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ کبھی فکر معاش اور کبھی فکر جاناں نے انھیں سانس لینے کی فرصت نہ دی۔ ان کی عشقیہ مثنوی خود اس کی غمازی کرتی ہے۔ زبان کی نرمی، انداز بیان کی معصومیت، بے ساختگی اور برجستگی، عاشقانہ جذبات کا بڑے موثر پیرائے میں مسلسل بیان، زبان کی سلاست و روانی، یہ بعض وہ خصوصیات ہیں جو ان مثنویوں کی اہمیت کی ضامن ہیں اور میر کا درجہ بحیثیت مثنوی نگار متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

(شریمتی) وجے چوہان
مترجم: رادھے شام پاٹھک

نوسو دن کی اندھیری رات

(ہندی سے ترجمہ)

ہم لوگ موسکوا دریا میں نہا کر لوٹے تھے۔ داچا میں بہار چھائی تھی۔ پیڑوں میں پکی ہوئی چیریز کے سرخ گچھے لٹک رہے تھے۔ آڑو اور خوبانیوں کے شگوفوں کی بھینی دلفریب خوشبو ہوا میں چھائی تھی۔ جھیل میں بطخیں قیں قیں کر رہی تھیں۔ سریوزہ اپنے ہندوستانی دوست لپّو کو لکڑی کا نیا چھوٹا گھر دکھا رہا تھا۔ جس میں اس کے کھلونے اور موٹر رکھی تھی۔ وہ بغیر مترجم اپنا کام چلا رہے تھے۔ جبکہ ہم لوگوں کو برابر "روسی ہندی بات چیت" کی پناہ لینی پڑتی تھی۔

انگوروں کی بیلوں سے ڈھکے گھنے کنج میں ویرا کھانا لگا رہی تھی۔ اس نے بڑی محنت کے ساتھ جارجین طریقے کا "طباقہ" پکایا تھا۔ ماسکو کے 'اراگوی' ریسٹوران کا "طباقہ"۔ تندوری مرغ کی یاد دلاتا تھا۔ ویرا نے ہمیں فون پر کہا تھا کہ وہ 'اراگوی' سے بھی بہتر کھانا بنائے گی اور لہسن کی چٹنی تیار کرے گی۔

لکتینسکی کچھ دن پہلے افغانستان سے لوٹے تھے اپنے کمرے میں پروجیکٹر لگا کر انھوں نے کابل کے قومی جشن اور افغانستان کے بازاروں کی تصویریں دکھائی تھیں۔ ہم نے انھیں بتایا تھا کہ ہندوستان اور افغانستان کی بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔

۱۔ روس میں دیہاتی بنگلے کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد جنگ کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دن پہلے ایک کتاب لکھنے کے سلسلے میں میں نے 'نورمبرگ' کے مقدمے کی پوری رپورٹ پڑھی تھی۔ 'بخینوالڈ' اور 'آؤش وتز' کیمپوں کی تصویریں مجھے لگاتار پریشان کر رہی تھیں۔ اور ایک خاص قسم کا ڈیپریشن (Depression) میرے دل پر چھایا تھا۔ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا۔ ہماری عظیم صدی میں کیا لوگوں کی کھالوں سے لیمپ شیڈ اور انسانوں کی چربی سے صابن بنائے گئے تھے۔ ہمارے ہوٹل میں ایک جرمن خاندان بھی تھا۔ اور ریتو ان کے بیٹے وولف گانگ سے کھیلا کرتا تھا۔ نہ جانے ان دنوں کیوں ان سے میرا بات کرنے کا جوش مدھم پڑ گیا تھا۔

میرے پتی مجھے سمجھاتے "آخر جرمنی نے ہائینے اور شلر بھی پیدا کئے۔ مارکس بابا بھی جرمن تھے اور زوایگ؟

سٹیفن زوایگ میرے محبوب ادیبوں میں سے ہیں۔ فاشزم کی تاریک رات میں اس حساس ادیب کو اتنا ڈیپریشن (Depression) ہوا تھا کہ انہوں نے امریکہ میں خودکشی کر لی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید نیا سورج کبھی نہیں نکلے گا۔

لکنیتیسکی نے کہا "آج کل میں رات بھر کام کرتا ہوں۔ اگلے مہینے میری لینن گراڈ ڈائریاں شائع ہو رہی ہیں۔

بے شمار روسی ادیبوں کی طرح لکنتیسکی بھی سپاہی بن کر مورچے پر گئے تھے۔ روسی لوگوں میں تاریخ کا جذبہ بڑا طاقتور ہے۔ انہوں نے اپنے ہر بڑے آدمی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بڑی حفاظت سے رکھی ہے، برے وقت کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے دی۔ ٹالسٹائی کے ماسکو کے گھر میں تو بچوں کی کاپیاں اور کوڈ ٹنک جوں کے توں رکھے ہیں۔ جب نپولین کی فوج قیمتی سامان لے کر روس سے بھاگنے لگی۔ تو کسانوں نے پیچھے سے ان پہ حملے کر کے اپنے دیش کی بیش قیمتی چیزیں اُن سے چھین لیں۔ ہر شاعر کا ایک ایک صفحہ احتیاط سے پیک کر کے لینن گراڈ کے باہر

دیکھ لیا۔ بہار ضرور آئے گی:

"میری صحت تباہ ہو گئی تھی۔ کھڑا ہوتا تھا تو سر میں چکر آتا تھا۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آواز آتی تھی۔ کبھی کبھی تو میں بھول جاتا تھا کہ ہمارے خوبصورت شہر پر بھی جنگ کی تباہی چھائی ہوئی ہے۔ میں صبح اٹھ کر کہتا ویرا دیر چکا آج تو کھیرے کا اچار کھانے کو جی چاہتا ہے:"

"ویرا کہاں تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ چھاپے ماروں کی ایک ٹکڑی میں شامل ہو گئی تھی۔ اس نے کئی مہینے جنگلوں میں بتائے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب میں نے ویرا کو دیکھا تو اسے مشکل سے پہچان سکا۔ اس کا وزن اسّی پونڈ رہ گیا تھا۔ اور وہ ہر وقت گرم پانی کی بوتل پیٹ پر رکھ کر لیٹی رہتی تھی۔ ہم دونو علاج کے لئے سوچی گئے۔ میری آنکھیں تو ٹھیک ہو گئیں لیکن ویرا کی آنتیں تباہ تباہ ہو گئیں۔ کئی سال تو منرل واٹر اور سر کو وشی ماج کے سوا کچھ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ابھی بھی ہر سال وہ علاج کے لئے کالزباد کے اسپا میں جاتی ہے۔

ویرا کے خاندان میں ساٹھ سے زیادہ رشتے دار جنگ میں مارے گئے تھے۔ ماں باپ بھائی بہن کوئی نہیں بچا۔ صرف ایک پھوپھی بچی ہے جو ہر سال گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے لئے ہمارے پاس آتی ہے۔

"پاویل کھانا تیار ہے۔" ویرا کی آواز سنائی دی۔

"شرمیٹیوو" ہوائی اڈے سے اڑ کر ایک جہاز داچا کے اوپر سے گذرا۔

توپولیو ستو چیتری۔ توپولیو ستو چیتری، سیر یوژا اور لیوتا تالیاں پیٹ پیٹ کر چلا رہے تھے۔

۱۔ پھٹے ہوئے دودھ کی ایک مٹھائی کا نام ہے۔

۲۔ روسی زبان میں TU 104 ہوائی جہاز کا نام ہے۔

اس کے بعد دلی اور ماسکو کے نام پر نیوا اور گنگا کے نام پیغام بھیجے گئے۔
آخر میں کلنیکی نے ٹوسٹ تجویز کیا۔ سرلویزا اور لیتو کے مستقبل کے لئے۔
دونوں بچوں نے لیمونیڈ کے گلاس اٹھا کر آپس میں ٹکرائے۔
"پاپا میں کاسموناٹ بنوں گا۔" سرلویزا نے کہا۔
"میں بھی کوس موس جاؤں گا۔" لیتو بولا۔

اس کے بعد دونو بچے جنگل میں جا کر گلوٹتے چننے کا پروگرام بنانے لگے۔ ہنسی سے کھلے اُن کے چہروں کو دیکھ کر میں اُن کے مستقبل کا تصور کرنے لگی۔ وہ ضرور کسی دن چاند ستاروں میں جائیں گے اور جنگ کی سیاہ رات کبھی ان کی زندگی میں نہیں آئے گی۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: ویال پریس دہلی

کوائف جامعہ

یوم تاسیس اور کانووکیشن

۲۹ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو جامعہ کے یوم تاسیس اور کانووکیشن کے جلسے منعقد ہوئے۔ اس سال یوم تاسیس کا جلسہ انجمن طلبائے قدیم کے اہتمام میں منعقد ہوا تھا، اس لیے تقریریں اور مضامین کا انداز پچھلے جلسوں سے ذرا مختلف تھا مگر بنیادی طور پر تمام اداروں کے اشتراک اور تعاون کے ساتھ یہ دن منایا گیا۔ صبح سویرے شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کا جھنڈا لہرایا، اور تمام طالب علموں اور استادوں نے اسے سلامی دی۔ اس کے بعد طالبات نے جناب شفیع الدین نیّر صاحب کا مشہور ترانہ پیش کیا۔ اس کے بعد جلسہ منعقد ہوا، جس کا آغاز قرآن حکیم کی تلاوت کر ہوا، پھر طالبات نے جامعہ کا ترانہ پیش کیا۔ اس کے بعد امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ موصوف جامعہ کے قدیم طالب علم بھی ہیں، ان کا پیغام حسب ذیل ہے :

"جامعہ کے یوم تاسیس پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس دن بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور کا خطبہ کانوں کو پھر سنائی دینے لگتا ہے۔ بڑے خلوص اور ولولے کے دن تھے وہ۔ اس کیفیت کو قائم رکھنا، کچھ بدلی ہوئی شکل ہی میں سہی، جامعہ کے مستقبل کو روشن بنانے اور قومی زندگی میں اس کے مقام کو متعین کرنے میں بہت مددگار ہو سکتا ہے۔ جامعہ کے پرانے ساتھیوں اور نئے متعلقین کو یہ دن مبارک ہو"

سب سے پہلے ابتدائی دور کے ایک قدیم طالب علم جناب رانا جنگ بہادر صاحب نے بڑی پرجوش تقریر کی، اس کے بعد ایک اور قدیم طالب علم عبداللطیف اعظمی نے جامعہ اور اس کے طلبائے قدیم کے باہمی رشتے پر ایک مختصر مضمون پڑھا۔ اس کے بعد جناب انور صدیقی صاحب لکچرر جامعہ کالج نے "جامعہ کی ادبی شخصیتیں" اور جناب عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے "جامعہ اور اساتذہ کی تربیت" پر مضامین پڑھے۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب (شیخ الجامعہ) نے تقریر فرمائی اور جامعہ کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کا ذکر کیا۔ اس جلسے کے مضامین انشاءاللہ جامعہ کے آئندہ شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔

شام کو کانووکیشن منعقد ہوا، جس کی صدارت امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے فرمائی اور مشہور انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" کے ایڈیٹر جناب ایس ملگاؤنکر صاحب نے خطبہ پڑھا۔ کانووکیشن کا آغاز جناب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رپورٹ سے ہوا، جسے جامعہ کے اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ جناب ملگاؤنکر صاحب کے خطبے کا ترجمہ اگلی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

(عبداللطیف اعظمی)

APPROVED REMEDIES for QUICK RELIEF

for
COUGHS & COLDS
CHESTON
SYRUP

for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS

TONIC FOR
STUDENTS & BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON

for
FEVER & FLU
QINARSOL

for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI

PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla
BOMBAY 8

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے | قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۵۴ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۶ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

ایس ایل گاؤکر

جامعہ کا خطبۂ کانووکیشن

۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

آپ اپنے شیخ الجامعہ کی اس صلاحیت سے تو بخوبی واقف ہی ہیں کہ جب وہ کسی سے کوئی بات منوانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اس شخص کے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں رہتی، چنانچہ مجھے بھی ہتھیار ڈالنا پڑا، لیکن اسی وقت سے جب میری کمزوری پر اُن کا ارادہ غالب آیا، مجھے یہ حیرانی ہے کہ آخر اُن کی نگاہِ انتخاب مجھ پر کیوں پڑی؟ پبلک لائف سے میرا کوئی تعلق نہیں، کسی ادارے کا میں رکن نہیں، میں کسی ایسی پوزیشن میں بھی نہیں کہ جامعہ ملیہ کے ترقی کے منصوبوں کے سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں، جب صورت یہ ہے تو آپ کے بلند مقصد کے حصول میں کیا کام آسکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں رسمی تعلیم و تربیت سے بھی کم و بیش بے بہرہ ہوں کیوں کہ اسکول میں میں چند جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا اور پھر ان چند برسوں میں بھی میں کچھ زیادہ ممتاز طالب علم نہیں رہا۔ ہاں ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ غالباً پروفیسر مجیب یہ چاہتے تھے کہ وہ آپ کے سامنے میری مثال پیش کریں اور آپ کو بتائیں کہ اگر آپ نے میری طرح اپنی جوانی کے قیمتی وقت کو ضائع کیا تو آپ کا حشر کیا ہوگا۔

میں نے یہ جو کچھ کہا ہے حقیقت ہے، کیوں کہ آگے چل کر جب مجھ میں کچھ سمجھ آئی تو میں نے اپنے اندر نظم و ضبط کی وہ کمی محسوس کی جو باضابطہ تعلیم کی ڈسپلن اور مشق سے پیدا ہوتی ہے۔

لیکن آج جب ہم اپنے چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں تو طالب علموں میں جس چیز کی سب سے زیادہ کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہی ڈسپلن ہے، جامعہ ملیہ جیسے ادارے میں جہاں استادوں اور طالب علموں کے خوش گوار تعلقات ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں، آپ بھی ہم میں سے بہتوں کی طرح طلبہ کے حالیہ ذہنی

اضطراب کے مظاہرے سے ضرور فکرمند ہوں گے۔ بدقسمتی سے یہ اضطراب جوانی کے جوش کا وہ بے ساختہ اظہار بھی نہیں ہے جس سے ممکن ہے کہ ہمدردی اور نرمی کے رویّے کا خیال پیدا ہوتا، یہ اضطراب تو منظم سماج دشمن سرگرمیوں کا مظہر ہے اور اس کی مذمت ہر اُس شخص پر فرض ہے جسے تعلیم کی اعلیٰ قدروں کا لحاظ ہے۔
اس بات سے کسے انکار ہے کہ طالب علموں کی کچھ شکایتیں جائز ہیں، لیکن طالب علموں نے ملک کے بیشتر حصوں میں جس شرم ناک انداز سے ہنگامے کیے ہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ اگر ہمارے نظامِ تعلیم میں نہیں تو کم از کم ہمارے طریقۂ تعلیم میں کوئی بڑی خرابی ضرور ہے، میں بہرحال پہلے ہی اس کا اعتراف کر چکا ہوں کہ ایسے مسئلوں پر رائے دینے کا میں اہل نہیں، میں تو صرف اتنی جرأت کروں گا کہ ان مسئلوں کا ذکر سرسری طور پر کروں اور ان کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالوں جو میرے خیال میں تعلیم کے صحیح مفہوم کے منافی ہیں۔

مجھے وہ شام یاد ہے جب میں مرحوم وزیراعظم جواہر لال نہرو کے ساتھ تھا اور وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے، اُس دن اُن کے مالی کا لڑکا جس نے بی، ایس سی پاس کیا تھا ان سے ملنے کے لیے الٰہ آباد سے آیا تھا، اور اس بات کا خواہش مند تھا کہ پنڈت جی کسی مناسب ملازمت کے لیے اس کی سفارش کر دیں۔ پنڈت جی نے اُسے جواب دیا تھا کہ اُس کو خود اپنے لیے کوئی ملازمت تلاش کرنی چاہیے بالکل اسی طرح جیسے دوسرے ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان جو وزیراعظم کو نہیں جانتے، کرتے ہیں، اور پنڈت جی نے مجھ سے کہا کہ غالباً مالی کے لڑکے کو صرف کلرکی پر اکتفا کرنا پڑے گا کیونکہ اس میں سائنس داں بننے کی کچھ زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔

اس کے باوجود یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ انھیں اس پر فخر ہے کہ ان کے مالی کا لڑکا گریجویٹ بن گیا ہے، میں نے پنڈت جی سے پوچھا کہ جب آپ خود اسے مانتے ہیں کہ مالی کا لڑکا اُس شعبۂ علم میں کوئی خاص امتیاز نہ حاصل کر سکے گا جسے اس نے سیکھا ہے، تو کیا اس صورت حال میں کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم گاہوں سے نکالیں جو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں نہ کھپ سکیں، یہ خطرہ نہیں ہے، کہ تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ آیا ایسا نوجوان جو سائنس داں

بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا صرف اس بنا پر ایک کامیاب اور باوقار زندگی گزار سکتا ہے کہ اس کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا جس کا وہ اہل نہیں تھا اور جسے اُس نے اپنے ارادے کی شعوری کوشش سے نہیں بلکہ اس لیے حاصل کیا کہ وہ آخر تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کو آئندہ زندگی میں کون سی راہ اختیار کرنی ہے ۔

میں نے پنڈت جی سے یہ بھی کہا کہ ایک خراب سائنس داں کے مقابلے میں ایک اچھا مالی بننے میں زیادہ اطمینان اور سکون محسوس کرنا چاہیے اور یہ کہ تعلیم کا مقصد، اس کے اونچے معنوں میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہم میں سے ہر ایک کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ۔

ہمارے طریقۂ تعلیم میں اور کیا خرابیاں ہیں اس موضوع پر اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہوں گا ۔ ایک سیاسی مبصّر کی حیثیت سے میرے لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کے مقصد اور مزاج کو ہماری قومی خصوصیات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، ہماری تعلیم کی خرابیاں ہماری قومی کمزوریوں کا حصّہ ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ نوجوانوں کے ذہن اپنے گرد و پیش کے ماحول اور قوم کی موجودہ مزاجی کیفیت سے متأثر نہ ہوں، اور اس وقت قوم کی مزاجی کیفیت عبارت ہے انحراف اور مفاہمت، ناکامی اور افسردگی، اختلاف اور اضطراب سے، کہیں بھی قومی مقصد کی سمت و رفتار کے احساس کے آثار نہیں ملتے ۔ ہماری آزادی کے معماروں نے جن آدرشوں کو مشعل راہ بنایا تھا وہ کچھ اس طرح ختم ہو رہے ہیں کہ مہذّب سماجی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے ۔

مادی ترقی ہم نے چاہے کتنی ہی کیوں نہ کر لی ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد سے ہمارے اخلاقی معیار برابر گرتے رہے ہیں، ہر طرف بددیانتی اور اقربا پروری کا دور دورہ ہے، ذاتی فائدے کے لیے سیاسی طاقت کا بے محابا استعمال ہوتا ہے، مختلف بااثر گروہوں کے مفاد کی وجہ سے انتظامی مشینری میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے، کاروباری طبقہ اپنی حرص و ہوس میں ٹیکسوں سے بچنے کے لیے ہر ناجائز حربے کو روا رکھتا ہے، اور تمام سرکاری کاموں میں نااہلی اور بدانتظامی نظر آتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ صورت حال یہ ہے کہ ملک مستقل طور پر غذا کے معا

دوسرے ملکوں کا دست نگر ہو کر رہ گیا ہے اور وہ بھی ایسی شرطوں کے ساتھ یہ بیرونی امداد ملتی ہے کہ اس پر خیرات کا شبہ ہوتا ہے، اس سے قوم کے اعتماد اور قومی کردار کی بنیادیں خطرناک حد تک ہل گئی ہیں، ملک کی حکمراں سیاسی پارٹی جو گروہ بندیوں کا شکار ہے ایسی مشکلوں میں اُلجھ گئی ہے جو اس کی خود اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، وہ اپنی اخلاقی قوت کھو چکی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی طویل المعیاد پالیسی یا قومی فلاح و بہبود کا سوچا سمجھا راستہ نہیں ہے، اور جس طرح کی صورت حال سامنے آتی ہے اسی کے مطابق مصلحت کے طور پر مسئلوں کا عارضی حل نکال لیتی ہے، معاملات کو طے کرنے کے سلسلے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ حق آپ کی طرف ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ آپ اپنے مطالبے کے لیے کس قدر ہلڑ بازی اور منظم دھونس کا دباؤ ڈال سکتے ہیں، ایسے ماحول میں اگر اچھی شہریت کی ذمّے داریوں اور قانون کے احترام کی گنجائش نہ ہو تو کسی کو بہت زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

بے چینی کی موجودہ لہر کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ ناگزیر نتیجہ ہے اس بات کا کہ سماجی تنظیم کے نئے اور منصفانہ نظریوں سے ملک کی ہم آہنگی کا جو سلسلہ شروع ہو جانا چاہیے تھا اُسے ہم برابر ٹالتے رہے، ہمارے ملک میں نہ معلوم کتنی چیزیں ہیں جن میں تبدیلی کی ضرورت ہے، تاریخ کا عمل اس طرح سے نہیں رہا ہے کہ ایسی سوسائٹی وجود میں آتی جو انصاف اور پڑوسیوں کے حقوق کے احساس پر مبنی ہوتی، مزید براں ترقی کے جدید نظریے ہم تک کچھ اتنی دیر سے پہنچے کہ ہم انھیں توازن اور تسلسل کے ساتھ اپنے اندر نہیں سمو سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ہم تاریخ کی مختلف صدیوں اور ترقی کے کئی مرحلوں سے بیک وقت گزر رہے ہیں، یہ صورتِ حال کچھ ایسے طریقوں سے دباؤ ڈال رہی ہے کہ ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کے تمام گوشوں میں دوغلا پن پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ہمیں تبدیلی کی اشد ضرورت کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اس تبدیلی کا مناسب رُخ متعین کریں۔ ہر تبدیلی کو ترقی کا لازمی جزو سمجھ کر اس کا خیر مقدم کرنا اس بات کا اعتراف ہے کہ ہماری زندگی کی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہے، اور اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم میں خیر و شر کی اُن ابدی قدروں کا احساس باقی نہ رہے جن کے بغیر مہذب زندگی کا تصور ناممکن ہے۔

چنانچہ مسئلہ یہ نہیں کہ ہر تبدیلی کی مخالفت کی جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اسے ایسا رخ دیا جائے
کہ اس کی تخلیقی قوت سے ایک ایسے زندہ اور متحرک سماج کی تعمیر کی جائے جس کی بنیاد عدل و انصاف
پہ قائم ہو۔ اس کے لیے بڑی دانش مند اور ایمان دار لیڈر شپ کی ضرورت ہے، سوال یہ ہے کہ
یہ لیڈر شپ کہاں سے آئے۔ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ بہترین صلاحیتوں کے لوگوں کو قومی خدمت
کے میدانِ عمل سے مستقل طور پر الگ تھلگ رہنا پڑتا ہے۔ مختلف نمائندہ اداروں میں چناؤ کے لیے
جو امیدوار منتخب کیے جاتے ہیں وہ اس بناء پر منتخب نہیں ہوتے کہ ان میں قومی خدمت کی صلاحیت
ہے بلکہ سامنے یہ بات ہوتی ہے کہ وہ اپنے انتخابی حلقے میں ذات اور فرقے کے لحاظ سے کس حد تک
قابلِ قبول ہیں، انتخاب لڑنے کے لیے جس کثیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے اسے فراہم کرنے کی اُن میں
کتنی سکت ہے، انھیں کتنے صاحب حیثیت اور ممتاز لوگوں کی حمایت حاصل ہے اور اپنی مقامی
پارٹی مشین پر ان کو کتنا اختیار ہے اور یہ اختیار اکثر صورتوں میں پارٹی کی فرضی ممبر شپ کی
بنا پر حاصل ہوتا ہے۔

جلد ہی ہمیں عام انتخابات سے نبرد آزما ہونا ہے، سیاسی کشمکش کی گراوٹ کا ہمیں کچھ نہ کچھ
اندازہ ابھی سے ہے، تین ریاستوں میں کانگریس اختلاف و انتشار کا شکار ہے، مخالفین کا یہ بھی دعویٰ
نہیں کہ ان کے اختلافات کسی قومی مفاد پر مبنی ہیں، وہ لوگ جو کانگریس کی حکومت میں با اختیار رہ چکے
ہیں، جب اپنی پوزیشن سے ہٹا دیئے جاتے ہیں تو کھلم کھلا حکومت کی بدعنوانیوں پر حیرت کا اظہار
کرتے ہیں، مخالف پارٹیوں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے اور انھوں نے موقع پرستی سے کام لے کر آپس
میں گٹھ جوڑ کر لیا ہے، تمام سیاسی جماعتوں کے ہاتھ مالی وسائل کے سلسلے میں رنگے ہوئے ہیں اور یہ
شبہ عام ہے کہ نظریاتی اور مادی اعتبار سے غیر ملکی اثرات بھی کارفرما ہیں، ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ
قومی پالیسیوں کی خوبی یا کمزوری پر کوئی معقول اور مربوط بحث کی جائے، ہم نے دیکھا ہے کہ پارلیمنٹ میں
سیاسی بحثوں کا معیار کتنا پست ہو گیا ہے، اس سے بھی زیادہ پست صورتِ حال سے ہمیں
انتخابات کے دوران دوچار ہونا پڑے گا اور پھر اس وقت ہمارے مقدس رہنما اس بات پر

تعجب فرمائیں گے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی نظر اونچے مقاصد اور جدوجہد کے اعلیٰ معیاروں پر نہیں ہے۔

ہمارے انتخابات میں ذات پات اور فرقہ بندی کا کس حد تک دخل ہے اس کا ذکر مختصراً میں کر چکا ہوں، مناسب ہے کہ اس ادارے میں جو سیکولر آدرشوں کا امین ہے، ہم اقلیتوں کے مسائل کا بھی ذکر کریں۔ قانونی اعتبار سے تو ملک میں اقلیتوں کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں برتا جاتا، لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے عملاً بڑے پیمانے پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے علمبردار ہونے کی حیثیت مجھے حاصل نہیں ہے، لیکن ایک شہری کی حیثیت سے جو ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کی خواہش رکھتا ہے، میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا ہم اُس دس فیصدی آبادی کے تعاون کے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں جو قومی زندگی سے اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں جو حصہ وہ لے سکتی ہے وہ نہ لے سکے۔ ہندو تنگ نظری نے ادھر کچھ زیادہ جارحانہ انداز اختیار کر لیا ہے اور حکومت ایسے عناصر کو خوش کرنے پر مائل نظر آتی ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقلیتوں میں تنگ نظری نہیں ہے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو تنگ نظری کو جس قدر قانونی رعایتیں دی جائیں گی اسی قدر اقلیتیں اپنی تنگ نظری کے حصار میں سمٹتی جائیں گی اور ہماری قومی زندگی پر پسماندگی کی ایک موٹی تہہ جمتی چلی جائے گی۔ اور اس کا خمیازہ ہم اس طرح بھگتیں گے کہ ہماری قانون کی کتابوں میں ایک بنجر اور منفی سیکولرزم کا ذکر تو ہوگا لیکن ہم سچی انسانی اخوت کی بھرپور رنگا رنگی سے محروم ہوں گے۔

اقلیتوں کے مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور اس کا تعلق ہمارے بین الاقوامی تصور سے ہے جو اپنے پڑوسی ملک پاکستان سے مسلسل ناچاقی کی وجہ سے بڑی حد تک مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہماری تاریخ اور جغرافیہ ایک ہے، ہمارا سماجی اور تہذیبی ورثہ مشترک ہے، ہماری معاشیات ایک دوسرے پر منحصر ہے، لیکن اس کے باوجود دونوں ملکوں میں جس قسم کا تعلق آزادی کے بعد سے اب تک رہا ہے وہ قانونِ فطرت کے سراسر منافی ہے، اس کا الزام صرف ہندوستان ہی پر نہیں ہے لیکن دونوں میں بڑا ہونے کے ناتے ہندوستان کا یہ فرض ہے کہ وہ ذمے داری کا زیادہ

بوجہ اشتباہ، کیا ہم ایمان داری سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس ذمے داری کا حق ادا کیا ہے۔ تاشقند میں صلح و آشتی اور ہم آہنگی کے بہتر تعلقات کے ایک نئے عہد کے آغاز کی جو امیدیں بندھی تھیں وہ تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان جو تنازعات ہیں وہ بہت پیچیدہ ہیں، اور بلاشبہ انھیں سلجھانے کے لئے صبر اور خیر سگالی کے بے پناہ جذبے کی ضرورت ہوگی، لیکن المیہ یہ نہیں کہ کوئی حل نظر نہیں آتا۔ المیہ یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ دوستی، رفاقت اور ہمدردی کی راہ اختیار کرنے کی مخلصانہ خواہش نہیں دکھائی دیتی، حالاں کہ یہ بات واضح ہے کہ دونوں کی دوستی تیز رفتار ترقی اور خوش حالی کی ضامن ہے اور نا چاقی کا مطلب ہے ایک مسلسل افلاس اور پسماندگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پاکستان سے دوستی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر سال ہندوستان کے دفاعی اخراجات میں پانچ سو کروڑ روپے کی بچت ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ عظیم نقصان یہ دونوں ملک کب تک برداشت کرتے رہیں گے اور آخر کب تک دونوں میں اُس ذلت کے لیے مقابلہ ہوتا رہے گا جو غیر ملکی عنایتوں اور بیرونی دباؤ کے جلو میں در آتا ہے۔

کوئی اور جگہ ہوتی تو ایسے موقع پر شاید میں صورتِ حال کی اتنی مایوس کُن تصویر نہ پیش کرتا لیکن یہاں اس بھروسے پر میں نے یہ جُرأت کی ہے کہ آپ لوگوں کو جنھیں خوش قسمتی سے اس عظیم ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے اس نے آپ کی عمروں سے زیادہ ضبط و تحمل کی دولت بخشی ہے، جامعہ کی کہانی صبر و تحمل کی کہانی ہے، یہ کہانی ہے کارکنوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے عزم و استقلال اور نصب العین سے وفاداری کی جس نے ابتدائے عشق کی مصیبتوں کو کامیابی سے جھیلا اور سُرخ رُو رہی، آپ لوگ جو جامعہ ملّیہ میں ہیں، آپ کا تعلق عظیم رہنماؤں اور بے غرض استادوں سے رہا ہے اور آپ نے ان سے فیض حاصل کیا ہے، ان میں سب سے بڑی شخصیت آپ کے امیر جامعہ کی ہے جنھوں نے اپنے انکسار اور کردار کی بلندی کے سبب ملک میں اور ملک کے باہر وہ عزت حاصل کر لی ہے جس کا تعلق ان کے اعلیٰ سرکاری عہدے سے نہیں ہے، آپ کی رہنمائی کے لیے خدا انھیں تادیر زندہ رکھے۔ آج بھی آپ کے درمیان اُس چھوٹی سی جماعت

کا ایک فرد موجود ہے جو پوری سرگرمی اور مستعدی سے اس ادارے کی خدمت کر رہا ہے میرا اشارہ پروفیسر مجیب کی طرف ہے جنھیں کسی اور صورت میں اس بات کے لیے معاف نہ کرتا کہ انھوں نے مجھے ایسے منتخب اور ممتاز اجتماع میں دعوت دے کر اِس آزمائش میں مبتلا کیا۔

مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں نے جو جامعہ سے رخصت ہو رہے ہیں اپنے قیام کے دوران جامعہ کی جدوجہد اور کامیابی کی داستان سے یہ بڑا اسبق سیکھ لیا ہے کہ زندگی کی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں، بلکہ اہمیت ہے اُس ہمت اور استقلال اور بلندیِ کردار کی جسے آپ زندگی کو دیتے ہیں۔

آپ جس دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں وہاں آپ کو ان خوبیوں کی ضرورت ہوگی، ملک کے سامنے بے پناہ مسائل ہیں، ہماری اجتماعی زندگی میں شدید جذباتی کشمکش اور بڑا اضطراب ہے، لیکن آئیے ہم اُن چند نعمتوں کا ذکر کرلیں جو باقی رہ گئی ہیں۔ ہمیں تقریر کی آزادی حاصل ہے، تھوڑی بہت بے ضابطگیوں کے باوجود قانون کی حکومت ہے، اپنی ساری کوتاہیوں کے باوجود ہمارے رہنماؤں نے اپنی اصلاح و تنقید کے دروازے بند نہیں کیے ہیں۔ ہمارے جمہوری ادارے باقی ہیں، لیکن یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ادارے باقی رہیں گے اگر ہم نے ان میں نئی جان نہ ڈالی، یہ ایک چیلنج ہے اور میں جس کا تعلق اس نسل سے ہے جو اُس ورثے پر فخر نہیں کرسکتی جو آپ تک اس سے پہنچ رہا ہے، اس کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ اس چیلنج کا مقابلہ اپنا فرض سمجھ کر کریں۔

رشید احمد

ایک مسلم رام بھگت قدیم صوفی شاعر

علاء الدین وصالی

اودھیا اجودھیا قدیم سنسکرت ادب میں اتر کوشل اور ساکیت کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ قدیم ہند و دیومالا کے بموجب تخلیق کائنات کا یہی سب سے پہلا مظہر ہے، جو رام و لچھمن اور سیتا جیسی مقدس ہستیوں کا گہوارہ و مسکن رہا ہے، اور اپنی عظمت و تقدس کے لحاظ سے سارے عالم میں مشہور ہے۔ قدرت نے اسی سرزمین پر محبت و صداقت، اطاعت و فرمانبرداری، صبر و رضا اور وفاکیشی کا وہ عظیم الشان امتحان لیا ہے جو دنیا میں اپنی آپ نظیر ہے، اور جس کی داستان کو والمیکی کے جادو نگار قلم نے لافانی بناکر شہرت جاوداں حاصل کرلی ہے، اور جسے عہد اکبری میں ہندی کے مشہور کوی گوسوامی تلسی داس نے رام چرت مانس یا تلسی رامائن کے روپ میں منتقل کرکے عوام کے لئے غذائے روح مہیا کی ہے۔

قدیم ہند و دیومالائی عہد سے قطع نظر، عہد تاریخ میں بھی، یہ سرزمین بڑے بڑے رشی منی، فلسفی اور اہل کمال کا ملجا و ماویٰ اور پاکیزگی و طہارت نفس کا سرچشمہ رہی ہے۔ اپنے اپنے عہد میں یہاں اکثر بڑے بڑے ہندو مسلم عابد و زاہد، صوفی سنت اور رام بھگت گذرے ہیں۔ ان ہی میں ایک مسلم رام بھگت علاء الدین وصالی مصنف ترجیع بند امقیاں کا قصہ بھی یہاں مشہور ہے۔ جن کی نسبت روایت ہے کہ عہد قدیم میں اپنے وطن خراساں سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے۔ وہ بڑے صوفی، عارف باللہ اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کی نظم ترجیع بند امقیاں صوفیانہ شاعری کی ایک نادر مثال ہے۔ بعض ہندو اہل قلم سے روایت ہے کہ وہ پنجاب کے شہر ملتان میں رامائن کی کتھامیں سری رامچندر کے

حسن وجمال، ان کے ایثار وقربانی اور دیگر گوناگوں اوصاف کا حال سن کر ان کے نادیدہ مشتاق اور علاوہ شیدا ہو گئے تھے، اور یہی کشش ان کو سرزمین اجودھیا کھینچ لائی تھی۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی یاد الٰہی میں بسر کر کے سفر آخرت اختیار کیا اور پر مودھ بن اجودھیا میں آسودۂ خاک ہوئے۔

یہ روایت بعض بزرگوں سے سن کر راقم الحروف کو اس کی جانچ وتحقیق کا خیال پیدا ہوا، کیونکہ اس کا ذکر اردو زبان کی کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا تھا۔ چناں چہ اودھ کے حالات جن تاریخوں اور تذکروں میں لکھے گئے ہیں ان کی ورق گردانی شروع ہوئی، اور اپنے ایک اجودھیا باشی دوست کے ساتھ جو ہندی ادب اور تاریخ سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں خود پرمودھ بن واقع اجودھیا گیا، جہاں علاء الدین وصالی کی قبر بتائی جاتی ہے۔ خیال تھا ممکن ہے دستور قدیم کے موجب قبر پر کوئی لوح یا کتبہ وغیرہ ایسا موجود ہو جس سے صاحب مزار کے نام اور عہد وغیرہ کی کچھ نشاندہی ہو سکے مگر وہاں ایک مختصر احاطہ میں املی کے درخت کے سایہ میں ایک پرانی پختہ قبر کے سوا کوئی کتبہ یا دیگر علامت موجود نہ ملی، جس سے اہل مزار کا کچھ پتہ چلے۔

میرے رفیق پنڈت رام رکشا ترپاٹھی ایم اے ساکن اجودھیا ٹیچر ہندی فارسس انٹر کالج فیض آباد نے جو تاریخ اجودھیا پر کافی عبور رکھتے ہیں اور جنھوں نے "اجودھیا وگ درشن" نام کی ہندی میں ایک مختصر تاریخ اجودھیا کے مندروں اور مذہبی استھانوں کے حالات پر لکھی ہے۔ مجھے بتایا کہ ۱۹۳۷ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن الٰہ آباد کا ایک جلسہ گورنمنٹ انٹر کالج فیض آباد میں بصدارت بابو پرشوتم داس ٹنڈن آنجہانی (الٰہ آباد) و اچاریہ رام چندر شکل صدر شعبۂ ہندی بنارس ہندو یونی ورسٹی ہوا تھا۔ جس میں گرد ونواح کے اہل علم کا اچھا خاصا اجتماع تھا اور جس میں میرے رفیق ترپاٹھی جی بھی بحیثیت رکن مجلس انتظامیہ شریک تھے۔ بابو گوپال چندر سنہا چیئرمین ریسپشن کمیٹی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں سرزمین اجودھیا کی روحانی عظمت وبرتری کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کے جن قدیم مشاہیر اور بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کیا تھا ان میں شاہ علاء الدین وصالی مصنف ماسقیمان بھی تھے۔ ترپاٹھی جی نے کہا کہ علاء الدین وصالی کا نام فارسی رسم الخط سے پوری طرح آشنا نہ ہونے کے باعث بعض ہندو دوستوں نے ان کو غلطی سے

جلال الدین وصالی لکھ دیا ہے گو مصنف ماقیماں ہونے کی تخصیص سے اس غلطی کا آسانی سے انکشاف ہوجاتا
ہے کیونکہ مصنف ماقیماں علاء الدین وصالی تھے۔ ترپاٹھی جی اس باب میں میرے مزید اطمینان کے لئے
مجھے ایک ذی علم ہندو درویش بابا رام کمار داس کے پاس لے گئے جو اجودھیا کی شہری آبادی کے باہر کچھ دور
پرمنی پربت کے مشہور تاریخی ٹیلے کے پاس جنگل میں بالکل یکہ و تنہا ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں رہتے
ہیں۔ درویش مذکور ہندی اور سنسکرت کے ایک بڑے عالم بتائے گئے۔ میں نے حیرت انگیز مسرت سے
دیکھا کہ ان کے مکان کی بالائی منزل پر تین چار کمرے ہندی اور سنسکرت کی قدیم و جدید مطبوعہ اور قلمی کتابوں
اور مخطوطوں سے بھرے ہوئے ہیں اور یہاں دس بارہ ہزار کتابوں کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ کتابوں کے
کمروں سے ملا ہوا ایک کمرہ خالی دیکھا گیا، جس میں بتایا گیا کہ ہندوستان کے دور دراز مقامات سے ہندی
اور سنسکرت کے ودیارتھی تحقیق علمی کے سلسلہ میں آکر قیام کرتے ہیں اور یہ کمرہ ان کے لئے مخصوص ہے۔
میرے استفسار پر بابا رام کمار داس نے بھی مہاتما وصالی مصنف ماقیماں کے متعلق مذکورہ بالا روایات
کو دہرایا، اور بزرگان قدیم کے اقوال کے سوا، اس کے تحریری ثبوت کے ضمن میں دو چیزیں اپنے ذخیرہ علمی
سے نکال کر میرے سامنے پیش کیں، ان میں ایک تو ہندی کے ماہوار رسالہ موسومہ "تلسی تیر" کی فائل ہے
جو آج سے ساٹھ برس پہلے بندو جی برہمچاری کی ادارت میں اجودھیا سے شائع ہوتا تھا۔ رسالہ تلسی تیر مذکور
کے ماہ پوس سمبت ۱۹۷۲ کے شمارے میں جسے حساب سے اب ٹھیک پچاس برس گزرے ایک مضمون
شری بغیشر پرشاد پریہ تگن جی کا لکھا ہوا بعنوان "مہاتما وصالی" دیکھا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پنجاب کے شہر
ملتان میں "تیر بھٹ تھن" نامی جنگل جھاڑیوں کے بیچ میں سمی مائی دیبی کا استھان ہے۔ اس کے چبوترے پر
پنڈت ٹیک چند رامائن کی کتھا کہا کرتے تھے۔ مہاتما وصالی خراسانی گھومتے ہوئے وہاں جانکلے۔ پنڈت
جی کی کتھا بڑی سندر ہوتی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر وہ برابر کتھا میں شریک ہونے لگے۔ ایک روز
پنڈت کتھا میں راجہ جنک کی پھلواری اور شری رام چندر کے حسن و جمال اور ان کے گوناگوں اوصاف
بیان کر رہے تھے۔ کتھا ختم ہونے پر جب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے، شاہ وصالی نے پنڈت جی سے پوچھا
کہ یہ کہاں کا قصہ ہے اور کون سی کتاب ہے جس میں سے آپ نے حضرت یوسف کی طرح کے

خوبصورت اور خوبیوں والے شہزادے کا ذکر سنایا ہے ۔ پنڈت جی نے بتایا کہ یہ قصہ اودھ کی راجدھانی اجودھیا کے راجہ دشرتھ کے پتر شری رام چندر کا ہے اور اس کو رامائن کہتے ہیں ۔ شاہ صاحب نے کہا کہ میں آپ کی کتھا کئی روز سے سنتا رہا ہوں اور اودھ کے اس شہزادے کے حسن و جمال اور اس کی سیرت کی خوبیوں کو سن کر میں اس کا نادیدہ عاشق اور پرستار ہو گیا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ دین و دنیا سے منہ موڑ کے بس اسی کے کوچے میں جا کر بس جاؤں ۔ قصہ کوتاہ اپنے اسی جذب و شوق میں بالآخر اودھ پری یعنی اجودھیا پہنچ گئے ، اور یہاں اپنے معشوق مجازی کے گیان دھیان میں ایک عرصہ تک مشغول رہ کر راہیٔ ملک بقا ہوئے ۔

اس سلسلہ میں دوسری مطبوعہ چیز جو بابا رام کمار داس نے مجھے دکھائی وہ ہندی کے ماہوار رسالہ کلیان کا خاص شمارہ موسومہ "رامائن انکہ نمبر" بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۳ء ہے ، جو گورکھپور کے مشہور گیتا پریس سے شائع ہوا ہے ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کا خاص نمبر ہے ۔ اس میں ایک مضمون بعنوان مسلمان رام بھگت سدھ فقیر شاہ جلال الدین وصالی ، شری جمنا پرشاد مرلیا ستو کا لکھا ہوا شائع ہوا ہے ۔ (صفحات ۷۴۲ لغایتہ ۷۴۳) مضمون کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ جو شخص جیتے جی پرماتما میں مل جاتا ہے اُسے وصالی کہتے ہیں ۔ یہ شبد فارسی بھاشا کا ہے ۔ اس کی تشریح کوی ولی رام جی نے بہت سندرتا اور فصاحت سے اس طرح کی ہے :

ڈیرا ڈال دیجے ، آٹھ راہ لیجے ، جس راہ میں پیو کو پائے جیو
ہم تم سے نیارے ہو رہیے ، نت ہنسئے کھیلئے گائے جیو
موئے مکت میت کی چاہ کیسی جو پے جیوتے نہ پائے جیو
ولی انت سمے جبہ جاؤ نا ہے ، تہاں جیوتے کو نہیں جا جیو

خراساں کے شاہ جلال الدین وصالی صوفی ، حسن پرست ، اتھات شرنگار نسٹھا کے بھگت تھے ۔ شری رام چندر کے اُپاسک ہونے کے علاوہ وے ان کی الوکک مدھر چھب پر موہت بھی تھے ۔ اُن کا وشواش تھا کہ شری رام چندر جی اننت سندر روپ وان اور سوکمار ہیں ۔ ان کی بھگتی کرنے

تھان کا نام چھپنے سے نیچے کمت ملتی ہے۔ جیسا کہ کوی خوشتر نے اردو رامائن میں کہا ہے:

کرے ورد زباں جو کوئی یہ نام — گلستان جہاں میں پائے آرام
نجات ہر بشر اس نام سے ہے — کہ آخر کام سیتارام سے ہے
عبادت کا نہیں ہر آج کل کام — فقط کافی ہے سیتارام کا نام

اس کے بعد مضمون نگار نے شہر لتان کے سی مائی کے استھان پر پنڈت ٹیک چند کی کتھا کے مذکورہ بالا واقعہ کو دہراتے ہوئے زیب داستاں کے لئے کچھ اور تفصیلات کا اضافہ کیا ہے اور جابجا مہاتماؤں کے اشعار کو حالات پر منطبق کر کے مضمون میں زور و تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مہاتما وصالی کو اجودھیا پہنچا دیا ہے۔ اور لکھا ہے

"وہ بڑے آنند سے اجودھیا کی گلیوں میں گھوما کرتے تھے۔ مندروں کے بھیتر جا کر شہزادہ رام کا دیدار حاصل کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے دل میں بڑی للک اور دھدھک اٹھا کرتی تھی۔ آخر کار جب ان کی بے چینی بڑھی تو آکاش بانی میں وصالی سے کہا گیا کہ وصالی جلد آ! میں تجھ سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہوں یہ آکاش بانی سن کر آبدیدہ ہو گئے اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا ۔

اے کہ در ہیچ جاندار ی جا — بو العجب ماندہ ام کہ ہر جائی

آخر کار مہاتما وصالی سرجو جی کے کنارے گئے۔ وہاں پہنچنے پر انھیں اپنے آپ کی سدھ نہ رہی اور وہ اپنی گدڑی پہنے ہوئے دریا میں کود پڑے اور غائب ہو گئے۔ لوگوں نے ندی میں کود کر ان کو تلاش کیا لیکن وے کہیں نہ ملے، آخر میں وہ ملے کہاں گپتا گھاٹ پر (جو سری رام چندر جی کے سورگ باش ہونے کا مقام ہے) دریا سے باہر نکلنے پر ان کی گدڑی جیوں کی تیوں سوکھی تھی۔ بمصداق سہ

گر بہ دریا روو لرزدہ عشق — رشتۂ دل کشاں نہ گردونم

شاہ صاحب ندی سرجو کے کنارے کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے اور جو انھوں نے دیکھا اسے اس طرح بیان کیا:

دوش رفتم بہ سوئے حمامے　　دیدم آنجا یکے دل آرامے
چابکے دلبرے دیبا کے　　ناز کے مہرخے گل اندامے
کہ بچشمان دلِ مَبیں اے دوست
ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست

پنڈت ٹیک چند جی شاہ صاحب کو ڈھونڈھتے ہوئے اجودھیا آئے، مگر شاہ صاحب نہ ملے۔ پنڈت جی نے اس امید میں کہ شاہ صاحب شاید کتھا سننے کے لئے آئیں یہاں اپنی کتھا رامائن شروع کی۔ ایک روز کتھا ختم ہونے کے وقت شاہ صاحب پنڈت جی کو نظر آئے۔ انھوں نے فرطِ عقیدت سے جَو کے کچھ دانے پنڈت جی کی کتھا کی پستک پر چڑھائے جو دراصل سونے کے دانے تھے۔ شاہ صاحب نے پنڈت جی کو اپنے جائے قیام پر بلایا۔ پنڈت جی وہاں گئے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ وہ کتھا میں پائے ہوئے سب زر و مال کو دان کر دیں، اور ان کے پاس آ کر رہیں۔ پنڈت جی نے ایسا ہی کیا اور شاہ صاحب کے پاس آ کر رہنے لگے۔ شاہ صاحب پنڈت جی سے اپنی ماتیاں کے اشعار پڑھوایا کرتے تھے۔ ایک دن حالت جذب میں شاہ صاحب نے پنڈت ٹیک چند سے کہا کہ اب تم ولی اللہ ہو گئے۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں تو آپ کا سیوک ٹیک چند ہوں۔ جس پر شاہ صاحب نے کہا تو پھر ولی رام ہو جا۔ اس دن سے پنڈت جی کا نام ولی رام ہو گیا اور آگے چل کر انھوں نے دیوانہ ولی رام لکھا ہے۔ پنڈت ولی رام منی پربت پر رہنے لگے۔ کچھ دن بعد وصالی صاحب نے اپنی زندگی ختم کی۔ وصالی کی لکھی ہوئی نظم کی کتاب ماتیاں مشہور ہے۔ یہ کویتا ان کے منہ سے انایاس (اضطراری طور پر یا از خود) نکلی تھی .... دھن ہے مہاتما وصالی آپ کو اور آپ کے پریم کو۔

مندرجہ بالا دونوں مضامین درحقیقت ایک ہی واقعہ سے متعلق و ماخوذ ہیں، جن کے لکھنے والوں نے نہ اپنے قصہ کے زمانہ کا کوئی تعین کیا ہے کہ انھوں نے کب اور کہاں سے یہ واقعہ نقل کیا ہے اور نہ اپنے اس بیان کا ماخذ اور اس کی صحت کی کوئی دلیل پیش کی ہے۔ ان مضامین کی اشاعت کی انتہائی مدت پچاس سال قبل کی ہے۔ ہندی ساہتیہ سمّیلن کا جلسہ جو ۱۹۳۷ء میں فیض آباد

میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد کا واقعہ ہے جس میں شاہ علاء الدین وصالی مصنف مانقیاں کے رام بھگت ہونے، اجودھیا آنے اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے صدر جلسہ نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ ہر چند کہ اس علمی اجتماع میں بھی جس میں بڑے فاضل، ادیب و مورخ شریک تھے اس واقعہ کے ماخذ اور اس کی صحت کی دلیل پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی تاہم ایسے موقع پر اس کے مجرد اظہار سے بھی یہ ترشح ہوتا ہے کہ ہند کی تاریخ و ادب میں کہیں نہ کہیں اس واقعہ کا کوئی حوالہ اور ذکر ضرور موجود ہے اور یہ کوئی محض طبع زاد کہانی نہیں ہے۔ راقم الحروف نے بحد امکان اس کے ماخذ کی تلاش و جستجو کی مگر ہنوز اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ رسالہ "تلسی پتر" اجودھیا اور اس کے دفتر کا وجود ۴۰ برس سے زیادہ عرصہ گذرا ختم ہو چکا ہے۔ اس کے ایڈیٹر اور مضمون نگار بھی اب باقی نہیں۔ رسالہ کلیان، گورکھپور کے مضمون نگار کا بھی خدا حافظ ہے!

تحقیق و جستجو کے سلسلہ میں مجھے معلوم ہوا کہ انیسویں صدی عیسوی میں اجودھیا میں ایک فاضل اور متقی و پرہیزگار بزرگ مولوی عبدالکریم گزرے ہیں۔ اور انھوں نے فارسی میں اجودھیا کے قدیم بزرگان دین پر کوئی کتاب لکھی ہے جس کا قلمی نسخہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ چناں چہ پتہ لگاتا ہوا ان کے مکان واقع محلہ بشسٹ کنڈ اجودھیا پہنچا۔ ان کے پرپوتے مولوی عبدالغفار امام مسجد بابری سے ملاقات ہوئی۔ استفسار پر انھوں نے میری خبر کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ[1] ان کے پردادا مولوی عبدالکریم امام مسجد بابری نے جو بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے انیسویں صدی کے تقریباً وسط میں فارسی کی ایک کتاب لکھی تھی۔ جو اجودھیا کے قدیم بزرگان دین کے حالات اور ان کے مقابر و مزارات کے جائے وقوع وغیرہ کی نشاندہی پر مشتمل تھی۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد جو ۱۸۹۱ء میں ہوا ان کی تحریر کردہ فارسی کتاب کا قلمی نسخہ بزرگوں سے منتقل ہوتا ہوا ان کے (مولوی عبدالغفار) ہاتھ

۱۔ ان کے خاندان میں عہد شہنشاہ بابر سے مسجد جامع بابری اجودھیا کی امامت چلی آتی ہے۔ اور ان کا خاندان قصبہ سہالی کے مشہور علماء کی ایک شاخ سے وابستہ ہے۔

آیا۔ کتاب کے زبان فارسی میں ہونے کے سبب عوام اس سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے عام شائقین اور سیّاحوں وغیرہ کے استفادہ کی نظر سے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر قاضی عبداللطیف ساکن موضع شہنوا ضلع فیض آباد مرحوم (سابق ایڈیٹر اخبار حبل المتین و دارالسلطنت کلکتہ و اخبار کسان فیض آباد) سے ۱۹۲۶ء میں کرا کے "گم گشتہ حالات اجودھیا" یعنی تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء کے نام سے ادبی پریس لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے ۱۹۲۷ء میں اسے طبع کرا کے شائع کیا تھا کتاب صرف ایک ہزار کی تعداد میں طبع ہوئی تھی جس کے سارے نسخے اسی زمانے میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئے تھے۔ حتیٰ کہ اب اس کا کوئی نسخہ ان کے پاس نہیں ہے۔ میرے بڑے اصرار پر مولوی عبدالغفار نے اپنے گھر میں تلاش سے ایک پھٹا ہوا نسخہ اس کتاب کا نکال کر دیا۔ یہ "۹ × ۶" تقطیع پر ۸۰ صفحات کا ایک رسالہ ہے۔ جس میں اجودھیا اور اس کے اردگرد فیض آباد تک جو قدیم آثار، مقابر و مزارات ہیں، ان کے مختصر حالات جائے وقوع کی سرسری نشاندہی کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔ مگر اس میں بھی بالعموم ان بیانات کے مآخذ پر پوری روشنی نہیں ڈالی گئی اور اکثر و بیشتر بیانات تحقیقی حیثیت سے تشنہ اور ناقص ہیں۔ ممکن ہے اصل فارسی نسخہ میں مولوی عبدالکریم نے کچھ اور وضاحت کی ہو۔ اصل قلمی نسخہ کی نسبت مولوی عبدالغفار نے بتایا کہ عرصۂ دراز گذرا اسے ان کے ایک عزیز ساکن ضلع کھیری لکھیم پور لے کر چلے گئے تھے جو عرصہ ہوا انتقال کر گئے اور ان کے ورثاء کی غفلت سے وہ ضائع ہو گیا۔

کتاب گم گشتہ حالات اجودھیا کے آغاز میں جناب مولانا شاہ نیاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جائسی ثم فیض آبادی) جو فیض آباد کے بڑے عالی مرتبت بزرگ گزرے ہیں۔ کی یہ تقریظ درج ہے:

ایک مدت سے اس فقیر کے دل میں تھا کہ اجودھیا میں جو بزرگ آسودہ ہیں ان کے حالات قلمبند کروں مگر یہ خیال حیطہ عمل میں نہ آسکا۔ الحمدللہ کہ میرے بزرگ معظم مغنم جناب مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم و مغفور کہ جن کو فقیر نے خود دیکھا ہے اور جو فقیر کے حال پر بزرگانہ عنایت رکھتے تھے۔ ان کی کتاب حالات بزرگان دین اجودھیا کو جو انھوں نے تحریر فرمائی تھی اس

اور ان کے پوتے برخوردار عبدالغفار سلمہٗ نے شائع کرایا۔ میں اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ یہ کتاب درحقیقت نہایت صحیح اور بہرہ دین دار مسلمان کے پڑھنے کے لائق ہے۔

اس کے بعد مولف علیہ الرحمۃ مولوی عبدالکریم کا مختصر شجرہ اور سبب تالیف کا خلاصہ کتاب سے نقل کیا جاتا ہے۔

حق سبحانہٗ تعالیٰ کی حمد اور حضرت سرور کائنات مفخر موجودات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد عاصی پُر معاصی عبدالکریم انصاری ولد حضرت شاہ عبدالرؤف مغفور اور مرید حضرت سید سبحان علی شاہ لاہوری قادری قدس سرہٗ) ابن شیخ سراج الدین علی ولد شیخ رحمت اللہ ابن شیخ دانیال ولد شاہ حبیب اللہ از اولاد شیخ قاسم انصاری بخاری، قدیم باشندہ قصبہ فتح پور سہالی پرگنہ بارہ بنکی سرکار لکھنؤ ہے اور مقام علمائے فرنگی محل آبا و اجداد کا مسکن تھا۔ جناب جد امجد یعنی شیخ سراج الدین علی نے بطور خود اس خطۂ مبارک کا توطن اختیار کیا تھا۔ لکھتا ہے کہ:

چوں کہ اکثر بزرگان دین و برگزیدگان راہ حق و یقین اولیاء اللہ قدس سرہٗ العزیز کے مزارات کے جو اس خطۂ متبرک یعنی اودھ میں آسودہ ہیں، دور دراز شہروں اور قصبوں سے واسطے زیارت و حصول فیض و برکات شائق و مشتاق آتے ہیں اور باشندگان شہر کی ناواقفیت سے اولیاء اللہ موصوف کی زیارت سے محروم رہ جاتے ہیں لہٰذا شائقین کی آگاہی اور واقفیت کے لئے جہاں تک کہ پتہ اور نشان ان مزارات کا اس خاکسار کو حضرت والد ماجد کی ہمراہی و جناب سید سلطان علی صاحب عرف سید سلطان بخش صاحب مرحوم از اولاد حضرت سلطان موسیٰ عاشقاں قدس سرہٗ و جناب شاہ عبدالحق صاحب اور ان کے صاحبزادے شاہ علاء الحق صاحب و جناب خطیب شیخ قادر بخش صاحب.... وغیرہ بزرگان سے کہ جن کا ذکر اس رسالہ میں بعد کو اپنے موقع پر آئے گا۔ معلوم اور دریافت ہوا ہے اس کو اس مختصر کتاب میں قلمبند کرتا ہوں تاکہ شائقین حضرات اولیاء اللہ کے فیض و برکات کے حصول سے محروم نہ رہیں۔

مذکورہ بالا کتاب "گم گشتہ حالات اجودھیا" کے صفحہ ۳۰ پر علاء الدین خراسانی کی یہ کیفیت درج ہے۔

اس احاطہ میں مزار حضرت سید علاء الدین خراسانی قدس سرہٗ مصنف ترجیع بند ما مقیماں مشہور و معروف خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ العزیز کا ہے۔ اس احاطہ میں صدہا قبریں کہ اجداد حضرت موصوف سے ہیں، یعنی سید احمد طاہر قدس سرہٗ وغیرہم موجود ہیں اور آپ کی اولاد احفاد بھی اس احاطہ میں خوابیدہ ہیں اور سرہانے حضرت سید علاء الدین اودھی قدس سرہٗ کے ایک سیاہ پتھر نصب ہے (ایک سال ہوا کسی نے تمام پختہ قبریں کھود ڈالیں اور پتھر بھی چرا لے گئے۔ یعنی رات کے وقت۔ بذریعہ پولیس تحقیقات کرائی گئی لیکن پتہ نہیں چلا۔۔۔)

کتاب "گم گشتہ حالات اجودھیا" مولوی عبدالکریم نے اپنے والد شاہ عبدالرؤف اور دیگر بزرگوں کی مدد اور معلومات سے استفادہ کرکے آج سے ایک صدی قبل مرتب کی تھی۔ مولف کے والد اور دیگر بزرگوں کی طویل عمروں کے پیش نظر، جن سے براہ راست مولف کو استفادہ کا موقع ہوا، شاہ علاء الدین اور دیگر اجداد کی قبور کی اجودھیا میں موجودگی کا ڈھائی سو برس سے بھی پہلے کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی سعادت خاں برہان الملک کے ۱۷۲۲ء میں دہلی سے حاکم اودھ مقرر ہوکر آنے سے قبل (جن کے ہاتھوں فیض آباد کی بنیاد پڑی) یہ قبریں اجودھیا میں موجود تھیں۔

قدیم کتب تاریخ اودھ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ میں پہلے پہل مسلمانوں کی آمد تقریباً ۹۰۰ سو سال پہلے سید سالار مسعود غازی اور ان کے ہمراہیاں سے شروع ہوئی، اور اس کے بعد شاہان شرقی، خلجی، غوری، تغلق اور مغل کے عاملان کے اودھ میں وقتاً فوقتاً مامور ہوکر آنے کا سلسلہ قائم رہا۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ فیض آباد کی بنیاد پڑنے سے صدیوں پہلے سے اودھ یعنی اجودھیا میں کثیر التعداد مسلمان آباد تھے۔ جس کا ثبوت ان کثیر التعداد قدیم آثار، مقابر و مساجد، باغات اور قبرستانوں کے وجود سے ملتا ہے جو سواد اجودھیا کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور جو امتداد زمانہ کے شکست و ریخت کے عمل کے باوجود بے حد و شمار موجود ہیں۔ شاہ علاء الدین کے اودھ میں آنے کے اسباب اور

اس کے زمانے کے صحیح طور پر متعین کرنے کا ہنوز یہاں کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہوا۔ تاہم خارجی قرائن سے ان کا عہد ۴۰۰، ۵۰۰ سو برس پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مسلک اور رام بھگتی کا بھی کوئی ذکر ابھی ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ان کی تصنیف ترجیع بند ماتقیاں یقیناً صوفیانہ شاعری کی ایک نادر مثال ہے۔

کتاب ماتقیاں کے ایک پرانے نسخہ میں جو مطبع دبدبۂ احمدی، مشک گنج لکھنؤ میں ۱۳۰۱ء میں طبع ہو کر شائع ہوا خاتمۂ کتاب پر جو عبارت درج ہے اس میں مصنف کا نام علاء الدین خراسانی لکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی تھے، اس کے سوا ان کا کوئی مزید حال درج نہیں ہے کہ وہ یہاں کب اور کیونکر آئے۔

اول الذکر دونوں (ہندی رسائل کے) مضمون نگاروں نے پنڈت ٹیک چند کو شاہ علاء الدین کے زیر اثر اور معتقد ہو کر اجودھیا میں ولی رام کا لقب اختیار کرنا تحریر کیا ہے اور ان کے شاعر ہونے کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ کوی ولی رام اچھے شاعر گذرے ہیں۔ چنانچہ کوی ولی رام کا ذکر مختلف کتابوں میں تلاش کیا گیا۔ کتاب "ہندوؤں میں اردو" مرتبہ سید رفیق مارہروی (ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ) میں کوی ولی رام کے ذکر کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"شاعر ولی رام شہزادہ دارا شکوہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ولادت اور وفات نامعلوم ہے۔ قوم کالیستھ سکسینہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ کے مشیر خاص تھے۔ خاندان مغلیہ کے شاہی افراد کی ادب نوازیاں اول تو ویسے ہی قومی تعصب یا عدم رواداری کے جذبات سے پاک تھیں لیکن شہزادہ دارا شکوہ کی علم نوازیاں اس درجہ رواداری کی حامل تھیں کہ بعض مذہبی ذہنیت رکھنے والے لوگ اسے بدمذہب خیال کرنے لگے تھے۔"[۲]

۲۔ ولی رام کی غزل مندرجہ کتاب کے چند شعر جو منشی دیبی پرشاد کی تالیف موسومہ "خزینۃ العلوم" میں موجود ہے یہ غزل جہاں اپنے زمانہ کے رنگ سخن کی وضاحت کرتی ہے وہیں جناب خسرو کی تقلید میں شعر کا پہلا مصرعہ فارسی اور دوسرا اردو دکھا کر۔

چہ دلداری دریں دنیا کہ دنیا سے چلا جانا ہے	چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
تو مہماں آمدی ایں جا شدی خود خانۂ چاوند	تو اپنے آپ سے بھولا کسی کو نا پہچانا ہے
شراب سرخ سے نوشی اجل کردی فراموشی	مرول کو دور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے

منشی دیبی پرشاد نے ان کا زمانہ ۱۴۰۰ء قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں دخل رکھتے تھے اور ہر سہ زبان میں ان کے اشعار دستیاب ہیں۔ منشی دیبی پرشاد نے ولی رام کو ہندو قوم میں اردو شاعری کا موجد لکھا ہے۔ ہر چند کہ منشی موصوف کی یہ تحقیق وسعت نظر کی محتاج ہے۔"

ان واقعات سے علاء الدین وصالی کے اجودھیا آنے کا ضرور پتہ چلتا ہے مگر ان سے متعلق مضامین کے ماخذ کا ذکر و حوالہ نہ ملنے اور زمان و مکان کا کوئی تعین نہ ہونے کے سبب تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی تحقیق و تصدیق ممکن نہیں۔

راقم الحروف نے اودھ سے متعلق جو کتابیں اسے دستیاب ہوئیں، ان میں علاء الدین خراسانی کے ذکر کو تلاش کیا مگر ناکام رہا۔ ایسی صورت میں وہ اپنی علمی بے مائگی، وسائل کی کمی، اور بے سروسامانی کے باعث تحقیق و جستجو میں اپنے عجز و ناکامی کے اعتراف کے ساتھ دیگر اہل علم حضرات سے مستدعی ہے کہ اس باب میں جن صاحب کو مزید معلومات حاصل ہوں از راہ کرم اس پر روشنی ڈال کر تحقیق کا حق ادا فرمائیں اور راقم الحروف کی رہنمائی فرما کر شکر گذار بنائیں۔

ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد کے ارباب اور خصوصاً ان مضامین کے لکھنے اور شائع کرنے والے حضرات سے اگر وہ بقید حیات ہیں گذارش ہے کہ علمی اور تاریخی حیثیت سے وہ ان مضامین کے ماخذ اور ان کی صحت کے دلیل و ثبوت کو واضح فرما کر ان مضامین کو مفید اور باوقار بنائیں، تاکہ ان کی حیثیت ایک طبع زاد کہانی کے بجائے ایک مسلمہ واقعہ بن جائے

اس سلسلہ میں علمائے دارالعلوم ندوہ و فرنگی محل لکھنؤ، اور دیوبند و دارالمصنفین اعظم گڈھ وغیرہ علمی ادارات سے درخواست ہے کہ وہ توجہ فرما کر اس واقعہ کی صحت و تحقیق میں ہماری مدد فرمائیں۔

عبداللہ ولی بخش قادری

جامعہ اور اساتذہ کی تربیت

جامعہ اپنی ذات سے ایک استادوں کا مدرسہ ہے اور اس نے اس نام کا ایک مدرسہ
بھی قائم کیا ہے۔ جامعہ کی یہ دونوں حیثیتیں بڑی نمایاں ہیں جنھوں نے تعلیمی دنیا میں اس کے نام اور
کام کو بہت کچھ امتیاز بخشا ہے۔ پہلی حیثیت جامعہ کو اپنے ان استادوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے
جو دھن کی پروا کیے بغیر اس پر اپنا تن اور من نثار کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ جامعہ نے قومی تحریک آزادی
کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اس کی کفالت کی ذمہ داری سیاسی رہنماؤں پر آئی تھی مگر اس کی پرورش
کرنے والے، اس کے استاد ہی رہے ہیں۔ جن کے حسنِ طبیعت نے اسے ایک جوہرِ ذاتی عطا
کیا ہے۔ جامعہ کی دوسری حیثیت بنانے میں استادوں کے مدرسے کا بڑا ہاتھ ہے۔ دیس کے تعلیمی نظام
میں جامعہ کی اہمیت اس نے بڑھائی اور مضبوط کی ہے۔ اس مدرسے نے قومی ضرورت کے تحت
۱۹۳۸ء میں گاندھی جی کی نیک خواہشات کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تاکہ بنیادی تعلیم کے مدرسوں کے
لیے موزوں استاد تیار کر سکے۔ ابتدا میں ایک ہی نصاب جاری کیا گیا لیکن ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ ابتدائی
اور ثانوی جماعتوں کے لیے علٰحدہ علٰحدہ استاد تربیت پانے لگے۔ اسی زمانے میں آرٹ کے
استادوں کو بھی دوسرے مضامین کے استادوں کی طرح معلمی کے آداب سکھانے کا انتظام
کر کے جامعہ نے ملک کو ایک اہم تعلیمی ضرورت کا احساس دلایا۔ آج جامعہ کے اندر استادوں
کے ایک ہی عملے کی نگرانی میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لیے عام استاد، آرٹ کے استاد اور
کے طالب علم تربیت پا رہے ہیں۔ حرفے کے استادوں کا نصاب عنقریب شروع ہونے والا
اور پوری امید ہے کہ چوتھے قومی منصوبے کے دوران میں ہی نرسری اسکول کے لیے استاد

تربیت کے دو مختلف معیار کے نصاب، تربیتِ جسمانی کا نصاب اور اعلیٰ تعلیمی تحقیق کا مستند کام بھی شروع ہو سکے گا۔ اب نرسری اسکول، مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی باضابطہ طور پر تربیتی ادارے سے منسلک کر دئے گئے ہیں اور آرٹس انسٹی ٹیوٹ، اس کے ایک شعبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح جامعہ کے اندر استادوں کی تربیت کا ایک ایسا جامع نظام قائم ہو رہا ہے جو نہ صرف اپنے اندر بہت سی تعلیمی خوبیاں سموئے ہوئے ہے بلکہ دیس کے لیے نمونے کا کام بھی دے سکے گا۔

اس وقت قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات ہمارے سامنے ہیں۔ اب ان کی روشنی میں ملک کا تعلیمی نظام درست کیا جائے گا۔ استادوں کی تربیت کے سلسلے میں کمیشن نے جو مطمحِ نظر پیش کیا ہے وہ ہمارے اندازِ فکر سے بہت زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ آج جن اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے، ان میں سے اکثر کافی مدت سے ہم برت بھی رہے ہیں۔ اس لیے جہاں یہ بات ہمارے لیے اطمینان اور تسکین کا باعث ہے وہاں ہماری ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں کہ ہم اپنے کام کی لَے تیز کریں، اسے بڑھائیں اور پھیلائیں تاکہ جو مقام حاصل کیا ہے اور جو توقعات قائم کی ہیں، ان کا حق ادا کر سکیں۔ آپ سب کے سامنے یہ دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ حق کی ادائیگی بھی آزادی کی قیمت ادا کرنے کی طرح ہر روز کرنی پڑتی ہے۔ کمیشن کی سفارشات پر نظر ڈالنے سے ہمیں اپنے کام کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے اور اب اُن کے پیشِ نظر ہمیں اپنے قدم آگے بڑھانے ہوں گے۔ استادوں کی تربیت کے سلسلے میں کمیشن کی چند اہم سفارشات یہ ہیں:

۱۔ تعلیم کو ایک مضمون کی حیثیت سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کیا جائے۔

۲۔ فارغ التحصیل طلبہ کی انجمنیں قائم کی جائیں اور تعلیمی کام میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۳۔ مشقِ اسباق کے پروگرام کو پورے طور پر مفید اور موثر بنانے کی غرض سے چند مخصوص مدرسوں کو اپنے زیادہ نزدیک کر کے انھیں اپنا معاون مدرسہ بنایا جائے۔

۴۔ معاون مدرسوں اور تربیتی ادارے کے درمیان تعلیمی عملے کا ربط ضبط بڑھایا جائے۔

۵۔ جامع تربیتی ادارے قائم کیے جائیں۔

۶۔ عام تعلیم اور فنی تعلیم کے ملے جلے نصاب جاری کیے جائیں۔

۷۔ طلبہ میں اپنے آپ مطالعہ کر کے سیکھنے کے طور طریقوں کو فروغ دیا جائے، آپس کے بحث ومباحثہ کے مواقع بڑھائے جائیں اور کام کی جانچ، کام کے ساتھ مسلسل جاری رکھی جائے۔

۸۔ مخصوص نصاب جاری کیے جائیں۔

۹۔ طلبہ سے کوئی فیس نہ لی جائے اور وظائف کا فراخ دلی کے ساتھ انتظام کیا جائے۔

اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان سفارشات میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے برتنے کی گنجائش ہمارے اندر موجود نہ ہو۔ ہماری موجودہ صورت حال ان سب پر عمل کرنے کے لیے نہایت سازگار ہے بلکہ بعض کے لیے تو زمین تک ہموار ہو چکی ہے۔ مثلاً ہمارے تینوں مدرسے، مجوزہ معاون مدرسے کے تصور سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے مدرسے ہیں۔ کچھ کام ایسے بھی ہیں جنھیں اس وقت تک ہم نے نہیں کیا ہے لیکن جب چاہیں انھیں بلا تامل شروع کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چھوٹے چھوٹے نئے نصاب جاری کیے جا سکتے ہیں یا مخصوص ضروریات اور محدود وسائل کے پیش نظر موجودہ نصابوں سے ایک بڑی تعداد کے لیے استفادے کی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ جیسے ابتدائی مدارس کے ان تربیت یافتہ اساتذہ کے لیے جو بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں ایک ایسا نصاب جاری کیا جائے جو دو یا تین سال کے اندر موسم گرما کی تعطیلات میں پورا کیا جا سکے۔ تعلیم میں ایم۔ اے کا نصاب جاری کرنے کا منصوبہ بھی آسانی سے عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد داخلہ مل سکے گا۔ اسی طرح اور بھی مختلف نصاب کسی خاص زحمت کے بغیر جامعہ جاری کر سکتی ہے۔ اس زمانے میں ایک بات خاص طور پر محسوس کی گئی ہے کہ ہمارے دیس کے تربیتی ادارے، دنیا کے مختصر ترین اداروں کی صف میں آتے ہیں اور ان کا یہ اندازِ قد کسی لحاظ سے مفید نہیں ہے۔ ہمارا اپنا تربیتی ادارہ بھی اپنے طلبہ کی تعداد کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ادارہ ہی رہا ہے۔ اب اسے خاطر خواہ ترقی دینے کی ضرورت

۴۔ ایک جامع تربیتی ادارہ بنانے کا خاص مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیمی، مالی اور مادّی وسائل کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ہمارا اُستادوں کا مدرسہ آج بھی ایک جامع تربیتی ادارے کا ایک چھوٹا نمونہ پیش کرتا ہے اور تھوڑی سی توجہ سے وہ بہت جلد اس معاملہ میں دیس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر بن کر سامنے آسکتا ہے۔

لیکن محض ایک جامع تربیتی ادارہ بنالینا یا کسی اور کام کو پھیلا لینا کافی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے کاموں میں وسعت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ وقعت بھی پیدا کرنی ہوگی۔ پہلے جامعہ کا دامن چھوٹا تھا مگر اس کے ہر ٹانکے پر ہمارے استادوں کا خونِ جگر صرف ہوا تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنی بہار دکھائی۔ اس کا رنگ، اپنا رنگ تھا۔ اِس لیے دیس نے اسے جانا اور پہچانا۔ آج ہمیں اس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہم اس رنگ کو یاد رکھیں اور زمانے کے بدلتے ہوئے رنگوں کے پس منظر میں اس سے خلوصِ دل اور آزادیِ فکر کے ساتھ نئے نقش ونگار بنائیں۔ جامعہ کے کچھ اپنے خدوخال اور وضعداریاں رہی ہیں۔ وہ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں ہے بلکہ مخصوص تعلیمی ادارہ ہے اور اسے اپنا مخصوص فرض ادا کرتے رہنا ہے۔ اسی صورت میں جامعہ اپنی ذمہ داری نباہ سکتی ہے اور وطن کے لیے پورے طور پر مفید ہوسکتی ہے۔ جامعہ کی انفرادیت میں اس کا حقیقی حُسن پوشیدہ ہے اور یہ انفرادیت اُس کو اپنے نصب العین اور مقاصد کی بدولت حاصل ہوئی ہے جن کی شہادت، شیخ الہند کے اولین ارشادات میں موجود ہے اور جن کی وضاحت ہمیں اپنے تمام بزرگوں کے خطبات میں ملتی ہے۔ اس بنا پر جامعہ ایک مخصوص تہذیبی ماحول کی حقدار قرار پائی جس کے قائم کرنے میں اس کی خدمت کا بیڑہ اٹھانے والوں نے جوششِ جنوں اور سوزِ دَروں کا جلوہ دکھایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بیک وقت جامعہ کے خادم اور مخدوم بن کر رہے ہیں۔ جامعہ کے کردار کا یہی سب سے روشن پہلو ہے کہ وہ استادوں کا اپنا ادارہ رہی ہے۔ جامعہ کو جامعہ بنانے کا سہرا اس کے استادوں کے سر ہے اور آج بھی ان ہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں، اس کی اصلی روح برقرار رکھیں اور اس کی منفرد حیثیت پر حرف نہ آنے دیں۔ نئی ضروریات کا پورا لحاظ کریں لیکن اپنی روایات کو یکسر بھلا نہ دیں۔ قومی زندگی

کے نئے اسلوب کو پہچانتے ہوئے، ولیں کی تعلیم کے ابھرتے ہوئے خاکے میں جامعہ کی جگہ پر اپنی اصل طبیعت کا رنگ بھریں۔ تب ہی ہم جامعہ کا منصب پورا کر سکیں گے۔ اس فرض کو انجام دینے کے لئے ہمیں خود اپنے مزاج اور مذاق کی تربیت درکار ہے۔ ایک طرف پرانے اساتذہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ جامعہ کے تہذیبی ورثے کو نئے اساتذہ تک پہنچائیں، انھیں اُس سے اچھی طرح آگاہ کریں اور یہ اطمینان کرلیں کہ اُسے معتبر ہاتھوں کو سونپ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہر نئے استاد کا ایک مہذب اور مخلص انسان کی حیثیت سے یہ سماجی اور اخلاقی فرض ہے کہ وہ جامعہ کے خصوصی کردار کو سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا اہل بنائے ورنہ وہ بھی اس لذت سے محروم رہ جائے گا جو مقصد کی لگن اور سرفروشی کی تمنا رکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے اور جامعہ بھی اس سے کچھ فیض حاصل نہ کر سکے گی۔ جامعہ کا مزاج اس بات کا متحمل نظر نہیں آتا کہ یہاں کوئی محض کاغذ کے گھوڑے دوڑاتا ہوا آئے اور ظاہری طور پر تعلق قائم کرکے وقت گزاری کرنے لگے۔ جامعہ کے ساتھ جذباتی لگاؤ اور اس کی تہذیب سے وابستگی بھی درکار ہے۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم نئے اثرات قبول کرنے سے گریز کریں اور اپنے ماضی کو سینے سے لگا کر بیٹھ جائیں یا کوئی تبدیلی نہ چاہیں اور اپنی برادری کو قطعی محدود اور مخصوص بنا لیں۔ جو تہذیب ایسا کرتی ہے، اس کی قوتِ نمو زائل ہوجاتی ہے اور اس کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔ تبدیلیاں آتی ہیں اور آتی رہیں گی۔ وہ تو زندگی کا قانون ہیں۔ لیکن ایک جسم اور ایک وجود اپنے طریقے پر توانائی حاصل کرتا ہے۔ خودرو پیڑ پودے، صرف جنگل ہی اگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن کسی مقصد کے تحت ان کی تنظیم کرنے سے چمن بنتا ہے۔ جو چیزیں صرف ہوا کے زور سے اڑ کر اندر آتی ہیں، ان کی حیثیت خس و خاشاک کی ہوتی ہے اور وہ باعثِ زینتِ گلستاں نہیں ہوا کرتیں۔ جامعہ ایک وجود ہے ایک چمن ہے۔ اس کی بڑھوا اڑ، اٹکل پچو نہیں ہوگی اور نہ چھوٹی چھوٹی وقتی مصلحتوں اور سہولتوں کی قلمیں ادھر اُدھر ٹھونس ٹھانس کر ہم باغبانی کا فرض پورا کر سکتے ہیں۔ نئی پود بھی دیکھ بھال کر لگائی جاتی ہے اور اس کا انتخاب بھی باغ کی غرض و غایت پر منحصر ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو نئی روشیں بھی نکالیں اور پھولوں کے نئے تختے بھی تیار کریں۔ لیکن اِن سب کا تعین، اس باغ کی فضا، خود کرے گی۔ تب ہی وہ باغ اپنی حیثیت

برقرار رکھ سکتا ہے۔ جامعہ کے خصوصی منصب کا ادراک کرکے اس کے جاں نثاروں نے چمن بندی کا کام انجام دیا ہے۔ اب یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اس تہذیبی ورثے کو زمانے کے مطالبات کا لحاظ رکھ کر ترقی دیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح ہمیں ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ہر اضافہ بذات خود ترقی کا موجب نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بامقصد ہونے کی شرط ہے۔ ہمیں برابر یہ کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارے رنگ روپ اور بول چال میں ہمارا اصلی رنگ جھلکتا رہے۔ ہم اپنے صفات کی بدولت نہ صرف پہچانے جائیں بلکہ خصوصی قدر و منزلت کا باعث بنیں۔

جامعہ ایک طرف اپنے ادارے سے باقاعدہ طور پر اساتذہ کی تربیت کا کام لیتی ہے تو دوسری طرف اسے ہم سب کی ذہنی تربیت بھی برابر کرتے رہنا ہے اور خاص طور پر نیا رشتہ جوڑنے والوں کو اپنا مزاج داں بنانے کے لیے سعی کرنی ہے۔ درحقیقت اصلی تربیت کا کام یہی ہے۔ کیونکہ آبیاری کے چشمے اساتذہ کی ذات سے پھوٹتے ہیں۔

اس تقریب کا انتظام قدیم طلبہ کی انجمن نے کیا ہے۔ میں اُن کی اس عنایت کا دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھ سے اس موقع پر اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے کہا۔ مجھے اپنی بات کہنے میں بڑی سہولت تھی کیونکہ مجھ پر کوئی خاص ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔ میں نے نہ جامعہ میں تعلیم پائی نہ میرے کسی خاندانی بزرگ کا جامعہ سے کوئی تعلق رہا ہے۔ نہ میں کسی ذمہ دارانہ حیثیت کا مالک ہوں اور نہ جامعہ کے آزمائشی دور کا لذّت آشنا۔ یہاں بہت سے وہ بزرگ اور احباب موجود ہیں جن کا تعلق جامعہ سے بے حد قریبی اور انتہائی گہرا ہے۔ اُن میں سے کسی کا بھی یہ احساس ہو سکتا ہے کہ اس قدر واجبی تعلق رکھنے والے کو جامعہ کی ذمہ داری اور اُس کے مقصد کی بات کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ پھر بھی میں اپنے تاثرات کے اظہار سے باز نہیں رہا۔ اس میں میری جرأت سے زیادہ آپ کی شریفانہ روایت کو دخل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری ذات کو نظرانداز کرکے آپ میری بات پر توجّہ فرمائیں گے۔ قدیم طلبہ کے کرم نے مجھے یہ جسارت دے دی ہے کہ میں ان سے اتنا عرض کرنے کی ہمّت کروں کہ دراصل جامعہ کی روایات کے امین اور سفیر آپ ہیں۔

اطمینان کی بات ہے کہ جامعہ کے اساتذہ اور کارکنان میں قدیم طلبہ کی ایک قابل لحاظ تعداد موجود ہے۔ جامعہ کی خصوصیات کو پروان چڑھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ اب یہ آپ خود بہتر طور پر سمجھتے ہیں کہ اپنے منصب کا حق کیونکر ادا کریں۔ خدا ہم سب کو وہ زندہ تمنا دے، جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے۔

(جلسۂ تاسیس میں پڑھا گیا)

قومی تعلیم

"... ہمارے ملک میں سیاسی ہی نہیں، علمی اور تعلیمی جماعتوں نے بھی قومی تعلیم کے مسئلے پر بہت کم غور کیا ہے... ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے، مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں۔ قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تفرقوں کو پس پشت ڈال دیں یا ہر سوائے اور ہر گروہ کو، جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہو کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔"

"... جس طرح افراد کی ذہنی نشو و نما اور شخصیت کی تکمیل کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنی سماج کے تمدن سے نشو و نما دیں اور اس کی سیوا کو اپنی ترقی کا ذریعہ جانیں، اسی طرح ہماری بڑی ہندوستانی سماج میں جو جو جماعتیں اور چھوٹی سماجیں ہیں، ان میں بھی یہ عقیدہ نہایت پختہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی بحیثیت جماعت اس وقت پوری ترقی کر سکتی ہیں جبکہ بڑی سماج کا اپنے کو خادم جانیں، اس کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور اس کی برائی میں اپنی برائی دیکھیں۔ اس عقیدے کا پیدا کرنا اگر نظام سیاسی کی خوبی پر منحصر ہے تو نظام تعلیم پر بھی بہت کچھ مبنی ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

(اقتباس از خطبہ کانووکیشن مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء)

انور صدیقی

جامعہ کی کچھ ممتاز ادبی شخصیتیں

ہماری قومی اور ادبی تاریخ کا وہ لمحہ ناقابلِ فراموش تھا جب علی گڑھ کے کچھ سرپھرے اور شعلہ نفس نوجوانوں نے غلامی کی زنجیروں کی گرانباری محسوس کی، یہ غلامی ذہنی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ اس ذہنی اور سیاسی غلامی کا عفریت ہماری صلاحیتوں کو نگل رہا تھا۔ کبھی نہ مٹنے والی بھوک کے ساتھ، ہماری قومی غیرت کی آگ سرد ہو رہی تھی برطانوی سامراج کے سیہ خانوں میں، جو سیاہ بھی تھے اور سرد بھی، غیر ملکی حکومت نے علی گڑھ میں ایک طرح کی قلعہ بندی کر رکھی تھی اور وہاں روشن ذہنوں پر سیاہی کی مہر لگا دی تھی۔ اس قلعے کی باہری زندگی میں گرمی تھی حرارت تھی اور آزادی کے لئے آتش و خون کے طوفانوں سے گزرنے کا عزم تھا۔ شبابِ خوگر دار و رسن نے بہت سے چراغ جلا دیئے تھے جن کی جوان لَو میں ہمارے قومی عزائم تھرتھرا رہے تھے۔ ترکِ موالات کی تحریک پورے ملک میں گاندھی جی کی سرکردگی میں جاری تھی، یہ ناممکن تھا کہ علی گڑھ کے قلعے میں کوئی شگاف نہ پڑتا۔ یہ شگاف پڑا اور محسوس ہوا کہ چاکِ درِ قفس سے ایک کرن داخل ہوگئی پھر کیا تھا اس کرن نے بہتوں کے ذہنوں کے دریچے کھول دیئے آزادی کی بے باک ہوا اور شوخ روشنی کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی کرن کے شعلہ بن جانے کی داستان ہے۔

"کرن" کے اس استعارے سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ شعلہ بن جانے کے بعد اس کرن کی نرمی ختم ہوگئی۔ نہیں، اس کرن میں آج تک گرمی اور نرمی کی کیفیت موجود ہے بلکہ اس میں حرارت اور روشنی کا وہ امتزاج ہے جو حقیقی ثقافت کو جنم دیتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں آنجہانی جواہر لال نہرو نے جامعہ پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں جامعہ کو تحریک ترک موالات کا ایک تندرست بچہ" قرار دیا

تھا۔ مسز نائیڈو نے جامعہ کے جشن سیمیں کے موقعے پر اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا جامعہ ملیہ ایک مشترک خواب کا مظہر ہے جو تین بڑے ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا۔ یہ تینوں یعنی حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی ڈاکٹر مختار احمد انصاری اہلیت اور طبیعت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے لیکن ملک وملت کی فلاح وبہبود کی لگن نے انھیں متحد کردیا تھا۔ وہ بالغ نظر، جری اور شیدائے وطن تھے اور انھوں نے تندہی اور خلوصِ دل سے ہندوستان کی خدمت کی، ان کی دلی تمنا تھی کہ ایک ایسا قومی ادارہ قائم ہو جو اسلامی تہذیب کے اعلیٰ تصور کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرت کی اقدار کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔

ہر انقلابی تحریک اپنے مزاج کے اعتبار سے ادبی تخلیق کے لیے سازگار ہوتی ہے اس تعلیمی اور تہذیبی تحریک کے رہنماؤں میں شاعر بھی تھے، اور شعلہ نوا خطیب بھی۔ مولانا محمد علی جوہر تو باقاعدہ شاعر تھے اور غزل کی روایت کے پاسدار، انھوں نے غزل کی مروجہ علامتوں میں اپنے دور کے کتنے ہی سیاسی تہلکوں اور تحریکوں کا اظہار کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ کہیں بھی تندیٔ صہبا سے غزل کا آبگینہ پگھلا یا ٹوٹا نہیں ہے، لہجے کی شائستگی کہیں مجروح نہیں ہونے پائی ہے۔ نہ کہیں خشونت ہے اور نہ خشکی۔ جوہر ہمارے ملک کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی رہتے ہوئے بھی، "قومی، سیاسی" رہتے ہوئے بھی ادبی رہنے کے گُر سے واقف تھی۔ اس کے احساس میں کہیں کوئی کش مکش نہ تھی، محمد علی جوہر اچھے صحافی، شاعر اور محبِ وطن تھے، ان کا مجموعۂ کلام "کلامِ جوہر" ہماری شاعری میں صرف اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں ایک بیدار ضمیر انسان کا دل دھڑک رہا ہے جو وطن کی آزادی کی خاطر ابتلا اور آزمائش کے دور سے گزرا اور دیارِ غیر میں آزاد اور نئے ہندوستان کے خواب اپنی آنکھوں میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغامِ بقا میرے لیے ہے

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

یقیناً فصلِ گل میں پھر نکل بھاگا ہے زنداں سے
وہی شورِ سلاسل ہے، وہی دیوانہ آتا ہے

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیسے کیسے یہ رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

قید اور قید بھی تنہائی کی
شرم رہ جائے شکیبائی کی

مولانا محمد علی جوہر کے رفقا میں حکیم محمد اجمل خاں اپنی تمام تر طبی، قومی اور تعلیمی سرگرمیوں کے شعر کے کوچے میں تھوڑی دیر بسر کرنے کے لئے مہلت چرا لیا کرتے تھے، شاید یہ مہلت ان کے لئے اخلاقی تعطیل Moral Holiday کا درجہ رکھتی ہوگی۔ اس لئے کہ ان کی غزلوں میں کسی طرح کے بھی سیاسی یا تحریکی عناصر نہیں ہیں۔ اس میں وہ قومی جوش بھی نہیں ہے جو اس دور کے شعراء میں عام بھی تھا اور ارزاں بھی، شاید وہ شعر کو گرام سدھار" قسم کی سرگرمیوں کا آلۂ کار بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ شعر کہتے تو حسن و عشق کی دنیا کے بارے میں، کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ داغ اسکول کی آسان گوئی اور عشقیہ معیار سے ناآسودہ نہ تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "کلام شیدا"

(شیدا حکیم صاحب کا تخلص تھا) عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ ان کے رنگِ کلام کا اندازہ اُن کے ان اشعار سے لگائیے، طبیب ہوتے ہوئے وہ محبوب کا طبی معائنہ نہیں نفسیاتی معائنہ کرتے ہیں:

ابھی سے تقاضا کہ گھر جائیں گے
تم آئے کہ گویا سحر ہو گئی

نہ دیں گے کبھی میرے خط کا جواب
مرے تیرے اے نامہ بر ہو گئی

وہ شئے جس کو پہلو میں رکھا مدام
پلوں میں اِدھر سے اُدھر ہو گئی

سہلِ ممتنع سے لطف اندوز ہونے کے بعد حکیم صاحب کا ایک شعر اور سن لیجیے جو بڑا ہی خوبصورت اور جاندار ہے:

وہ خوابِ ناز میں تھے، مرا دیدۂ نیاز
دیکھا کیا اور اُن کی بلائیں لیا کیا

جامعہ کے دورِ اوّل یا قرونِ اولیٰ کے شعرا میں مولانا اسلم جیراج پوری کی شخصیت قابلِ ذکر ہے، موصوف بڑے فلسفے کے عالم اور شاعر تھے، جہاں ایک طرف دینی مسائل میں مجتہدانہ بصیرت کے مالک اور مذہبی مجادلوں اور محاربوں میں قافلہ سالار تھے وہیں ادب و شعر کے میدان میں بھی منفرد اور ممتاز تھے۔ شبلی کے مسلک کے خلاف مگر شعری اسالیب میں ان کے ہی پیرو تھے۔ انھیں کے انداز میں قومی، ملی اور موضوعاتی شاعری کرتے تھے۔ جامعہ سے تادمِ مرگ وابستہ رہے، جامعہ کی عمارتوں کے سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر انھوں نے اپنی وہ شاہکار نظم کہی تھی جس کا ایک شعر تو جامعہ میں زبان زدِ خاص و عام ہے، ممکن ہے اس شعر کی مقبولیت کی وجہ وہ تعلیمی مشن رہا ہو

جس کی اساس نت نئے تجربوں پر رکھی گئی تھی۔ اور تجربے کبھی کبھی لاحاصل بھی ہوتے ہیں مگر اس لاحاصلی میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ وہ شعر آپ بھی سن لیجئے:

عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہکن کی سعیِ لاحاصل میں ہے

مولانا کا مجموعہ کلام "جواہر طلیہ" شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

جامعہ کے نسبتاً نئے دور کے شعراء میں قیصر زیدی، استاد اردو زبان و ادب، جامعہ کالج اپنی شخصیت اور شاعری کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہیں، انھوں نے بہت کم کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے اس میں شاعری کے حقیقی منصب سے آگہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں جذبے کی تہذیب اور فن کے رچاؤ کا بڑا احساس ہے، ہر جذبے کا اظہار شعری ہے۔ کہیں بھی نثریت پیدا نہیں ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کسی زمانے میں بھرپور شعری زندگی گزاری ہے، اب وہ بہت کم کہتے ہیں۔ مگر باتیں کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں بہت سی نظمیں سو رہی ہیں اور وہ انھیں شعوری طور پر سلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے موجودہ سکوت پر نہ جانے کیا کیا گماں گزرتے ہیں۔ ان کے کچھ شعر سنئے:

غمِ فراق نے یہ حسنِ آگہی بخشا
ہر ایک لمحے کی آغوش جاودانی ہے

ہر نفس جس میں ہے ہنگامۂ محشر کا امیں
ہم نے اس دور میں ہنسنے کی قسم کھائی ہے
زندگی جیسے گزرتی ہے گزرنے دیجے
اور کچھ کہنے میں اک نام کی رسوائی ہے

ایک عالم ہے تماشائی غم
بے کسی انجمن آرائی ہے

جامعہ سے وابستہ شعراء میں غلام ربانی تاباں کا ذکر ناگزیر ہے، ان کا شمار ہندوستان کے شعراء کی صفِ اول میں ہوتا ہے (یہ صفِ اوّل کس قدر مختصر ہے اس کا آپ کو اندازہ ہوگا) وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور اس کے سارے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس تحریک کے مزاج کے ساتھ ان کی شاعری بھی بدلتی رہی ہے — وہ اس کے ہائے وہو میں شریک رہے ہیں آج جب اس تحریک کے شعراء "شائستگی دیدۂ تر" کی منزل تک پہنچے ہیں تو اس منزل میں کارواں کی اگلی صف میں ہیں، اور کبھی کبھی غزل کی ایمائیت کی دولت لئے ہوئے وہ اس کارواں سے آگے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ غزل کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کے مزاج آشنا، اس کی عظیم کلاسیکی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے وہ لفظ و معنی کی نئی دنیاؤں تک پہنچ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں — تاباں صاحب نے اپنے مزاج، اور افتادِ طبع کے مکمل جائزے کے بعد غزل کو ہاتھ لگایا ہے اور اسے نئی بلندیوں سے آشنا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میں ان کے شعر اس وجہ سے پیش نہیں کر رہا ہوں کہ مجھے آپ کے حافظے پر بھروسہ ہے۔ کم از کم ہر پڑھے لکھے شخص کو اپنے اچھے شعراء کے اشعار سے واقفیت تو ہونی ہی چاہیے۔

دراصل جامعہ کا قابلِ فخر کارنامہ شاعری کے میدان میں نہیں نثر کے میدان میں نظر آتا ہے۔ دورِ اوّل کے سیاسی ہنگاموں کے ختم ہوتے ہی یہاں کی زندگی میں ایک طرح کا اعتدال آیا مگر شروع کی بے سر و سامانی کے باوجود تعلیمی اور تہذیبی مشن کا احساس باقی رہا۔ سکون اور اعتدال کی زیادتی شعری تخلیق کی دشمنِ ازلی ہے، شاعری تو اضطراب کا پھول ہے، بعد کی جامعہ سکون کا گہوارہ بنی تو شاعری نے رختِ سفر باندھا اور اس کی جگہ نثر کی انجمن آرائی شروع ہوئی۔ نثر جو کلاسیکی نظم و ضبط، اعتدال اور وضاحت چاہتی ہے

وہ جامعہ کی زندگی بن چکی تھی۔ یہاں کی نثر نگاری تراجم سے شروع ہوئی۔ غیرملکی عالموں اور مصنفوں کی بیش بہا کتابوں کے ترجمے شروع ہوئے، خود ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کے تعلیمی مشن کا آغاز ترجموں سے کیا مگر ان ترجموں میں ثقالت اور گرانباری نہیں سادگی، شائستگی اور پروقار ادبیت ہے۔ یہ خصوصیات ان کے ترجموں "مبادی معاشیات" اور "افلاطون کی ریاست" میں ہر صفحے پر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبیت ان خطبات میں اور بھی نمایاں ہوتی جو وہ مختلف موقعوں پر دیا کرتے۔ ایک خطبے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جہاں مادی ذرائع کی کمی ایک پست ہمت آدمی کے لئے سنگ راہ کا کام کرتی ہے وہاں اس کے لئے اس کا نہ ہونا گویا اس کی حریت نفس اور آزادیٔ فکر کی راہ سے رکاوٹوں کا ہٹ جانا ہے .... تم اپنی بے سروسامانیوں کے باوجود اپنے ضمیر کے اطمینان اور روح کی آزادی پر جس قدر فخر کرو بجا ہے۔"

جامعہ کے نثر نگاروں میں ذاکر صاحب کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے نام آتے ہیں، عابد حسین نے علمی اور ادبی سفر کا آغاز ترجموں سے کیا اور اس مشکل فن میں کچھ ایسی مہارت بہم پہنچائی کہ ان کے ترجموں میں ترجمہ پن کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی، نہرو، کانٹ، اشپرانگر اور افلاطون کی شہرۂ آفاق تصانیف کے ترجمے جس خوبی اور خوبصورتی سے کئے ہیں وہ دوسرے ترجمہ کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ہیں، عابد صاحب نے تہذیب اور تعلیم کے مسائل پر بڑی گہری بصیرت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور ہر جگہ ان کے ذہن کی صفائی اسلوب بیان کی وضاحت میں اضافہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا ذہن بنیادی طور پر تجزیاتی اور فلسفیانہ ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر میں وجاہت آفریں سادگی ہے، ہمارے نثر نگار عابد صاحب کے اسلوب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

جامعہ کے نثر نگاروں میں پروفیسر محمد مجیب صاحب کی تحریروں میں بڑی تخلیقی شان اور جمالیاتی شادابی ہے، یوں تو وہ اپنی دلچسپیوں کے اعتبار سے جامع کمالات ہیں پھر بھی ان کے جوہر ان موضوعات

میں کھلتے ہیں جہاں اُن کا خلاق ذہن ماضی کی بازآفرینی کرتا ہے اور بہتی تخلیقی لمحوں کو لفظوں کے پیرہن عطا کرتا ہے۔ وہ مورخ کی معروضیت کے ساتھ شاعر کے تخیل کو جس طرح ہم آہنگ کرسکے ہیں اس کی مثالیں ہندوستانی مورخوں میں کم ملتی ہیں۔ انھیں تاریخ کے واسطے سے ادب کا بہت گہرا شعور ہے۔ "روسی ادب کی تاریخ" ان کی جمالیاتی پرکھ اور تاریخی شعور کا پتہ دیتی ہے، اپنے ڈراموں "حبہ خاتون" "انجام اور کیمیاگر" میں وہ انسانی اعمال اور انسانی مقدر کے اچھے عالم کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں، اُن کی شخصیت میں جامعہ کی سیر چشمی، وسیع المشربی اور پُرجمال سادگی ہے۔ یہی خصوصیات ان کی نثر میں بھی نمایاں تھیں۔ قطب کی عمارتوں پر انھوں نے جس جمالیاتی حس اور تہذیبی بصیرت کے ساتھ لکھا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں :

"اس محراب کا لطیف تناسب کیونکر پیدا ہوا، اِس میں جان کہاں سے آئی، اس کو زبان کس نے دی، اس کے پاؤں اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے سے اس طرح کیوں ملتے ہیں کہ گویا باہمی کشش انھیں ایک دوسرے سے قریب لا رہی ہے اور وہ جب ملتے ہیں تو اس طرح کیوں جیسے دو محبوب ہم آغوش ہوتے ہوں۔ اور اُن کی ہم آغوشی کیسے بلندی کی طرف اشارہ بن گئی ہے۔"

وقت کی کمی اگر اجازت دیتی تو میں آپ کو بتاتا کہ جامعہ سے وابستہ ہماری ادبی اور ثقافتی زندگی میں ایسی کتنی شخصیتیں ہیں جن کے شعور کو نشو و نما اور جن کی شعریت کو بال و پر یہیں سے ملے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عبد العلیم، وقار عظیم، سید نذیر نیازی، رئیس احمد جعفری، سعید انصاری، شفیع الدین نیّر، ڈاکٹر سلامت اللہ، صالحہ عابد حسین، غفار مدہولی، برکت علی فراق، عبد اللہ ولی بخش قادری، حنیفی پریمی اور عنوان چشتی (تمام ادبی فہرستوں کی طرح یہ فہرست بھی نا تمام ہے) کی صلاحیتوں کو چمکانے میں جامعہ کا حصہ ہے۔ آج بھی نئے ہندوستان کی ثقافتی نشاۃ الثانیہ میں جامعہ منارۂ نور ہے اور مستقبل کا ایک اہم اشاریہ !

(جلسۂ تاسیس میں پڑھا گیا)

عبداللطیف اعظمی

جامعہ اور اس کے طلبۂ قدیم

کل شام تک میرا ارادہ تھا کہ جامعہ ملیہ نے اردو زبان وادب کی جو بیش بہا خدمت کی ہے، آج کے جلسے میں اس کی تفصیل پیش کروں گا۔ جو لوگ جامعہ کی پچھلی خدمات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، ان کو یاد دلاؤں گا کہ جامعہ نے ایک ایسے دور میں اردو کے خزانے میں گراں قدر کتابوں کا اضافہ کیا، جب مغربی علوم کے ماہرین اردو میں لکھنا کسر شان سمجھتے تھے اور جب فلسفہ، معاشیات، سیاسیات اور تاریخ جیسے ضروری علوم پر اردو میں معیاری کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں، جامعہ نے نہ صرف معیاری کتابیں لکھوا کر شائع کیں بلکہ کتابوں کے ظاہری حسن میں بھی انقلاب پیدا کیا۔ موجودہ نسل کے لوگوں میں شاید بہتوں کو معلوم نہ ہو کہ آج اردو کی کتابوں میں جو ظاہری حسن نظر آتا ہے، اس کی داغ بیل جامعہ ہی نے ڈالی تھی۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا تھا کہ آج اردو جس نازک دور سے گزر رہی ہے، اس میں جامعہ کی مدد اور توجہ کی بڑی سخت ضرورت ہے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے جامعہ جن دقتوں سے دوچار ہے، اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ پچھلا دور واپس لانا ممکن نہیں ہے، مگر موجودہ حالات میں بھی میں جامعہ کے اثرات پر ایمان رکھتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ شیخ الجامعہ صاحب اگر چاہیں تو حکومت کی امداد کے بغیر بھی اردو کے لیے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ آج کل علمی کتابیں شائع کرنے والا کوئی ادارہ نہیں ہے، ہر ادارہ چاہے اس کا مقصد تجارت ہو یا خدمت، نفع بخش سودا پسند کرتا ہے، لیکن اردو کو ایسے دیوانوں کی ضرورت ہے جو گھاٹے کے سودے میں لطف محسوس کریں۔ اگر موجودہ صورت حال قائم رہی تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں اردو محض تفریحی موضوعات کی زبان ہو کر رہ جائے گی۔ اس وقت اگر کچھ زیادہ

نہیں صرف اردو اکیڈمی کو زندہ کر دیا جائے تو اس سے بہت کچھ سہارا مل سکتا ہے۔

لیکن جناب صدر! یہ سب کچھ کہنے کا ارادہ تو کل شام تک تھا، لیکن گذشتہ رات جب ایک دوست میرے یہاں تشریف لائے اور آج کے جلسے کا پروگرام معلوم کرنے کے بعد مجھ سے سوال کیا کہ اس پروگرام میں طلبائے قدیم کہاں ہیں، اس جلسے اور پچھلے جلسوں میں معنوی فرق کیا ہے؟ اسی طرح کے اور بہت سے سوالات کئے تو میں نے اپنی تقریر کا عنوان بدل دیا۔ میرے دوست چاہتے تھے کہ جب طلبائے قدیم کے اہتمام میں یہ جلسہ کیا جا رہا ہے تو وہ بتلائیں کہ جامعہ کی موجودہ صورت حال کے متعلق ان کی رائے کیا ہے؟ اور آئندہ کے متعلق وہ کیا سوچتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی ادارے کے طلبائے قدیم اس کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں، اگر کوئی ادارہ اپنے فرزندوں کی توجہ اور ثبت سے محروم ہو جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی۔ میں جامعہ کے السابقون الاولون میں سے نہیں ہوں، بعد کے آنے والوں میں سے بھی نہیں۔ ہاں، اس کے بعد کی نسلوں میں میرا شمار ضرور ہوسکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب میں جامعہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا اور جب ۱۹۴۱ء میں یہاں کے کارکنوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، تو اس وقت بھی جامعہ کی اہم خصوصیات میں دو خصوصیتوں کا بڑا چرچا تھا۔ ایک یہ کہ جامعہ کو چلانے والے اور ان کو حکم دینے والے.........

.....دونوں ایک ہی ہیں، یعنی جو لوگ مزدوروں کی طرح دن رات مختلف کاموں میں جتے رہتے تھے وہی حاکم اعلیٰ بھی تھے، شاید صرف جامعہ ہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں حاکم اور محکوم دو الگ الگ فرقے نہیں تھے، دوسری خصوصیت یہ بیان کی جاتی تھی کہ اس کے چلانے والے تمام تر خود اس کے فرزند ہیں، اس موقع پر شاید آپ کا ذہن ہمارے موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی طرف جائے، لیکن اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ دونوں بزرگ جامعیوں سے زیادہ جامعی ہیں تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ ندوہ نے مولانا عبدالماجد کو ندوی کی خلعت عطا کر کے ایک اچھی روایت کی بنیاد ڈالی ہے، اگر ہماری انجمن نے کبھی اس روایت کو اختیار کیا تو مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے ان دونوں بزرگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے اس

کی عزت کو دوبالا کرے گی۔ خیر تو میں جامعہ کی دو ممتاز خصوصیات کا ذکر کر رہا تھا، مگر اب یہ دونوں خصوصیات باقی نہیں رہیں، ان کو ختم کرنے میں کسی ارادے کو دخل نہیں ہے، یہ بدلے ہوئے حالات کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ دونوں خصوصیات ایک چھوٹے سے ادارے میں تو قائم رہ سکتی ہیں، مگر ایک بڑے اور وسیع ادارے میں ان کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے، لیکن غم اس کا ہے کہ ہم طلبائے قدیم نے کبھی اپنی تنظیم کی طرف توجہ نہیں کی، اگر ہم منظم ہوتے اور ہماری یہ انجمن زندہ اور سرگرم ہوتی تو آج جب جامعہ کے کاموں میں طلبائے قدیم کی کوئی موثر آواز نہیں ہے، تو اس سے جامعہ کو بڑی مدد ملتی۔

ہم جناب شیخ الجامعہ صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے اس اہم جلسے کا انتظام ہمارے سپرد فرمایا۔ وقت کی کمی کے باعث ہم اس کا انتظام اپنی خواہش اور معیار کے مطابق نہ کرسکے۔ مگر اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ہماری انجمن میں، جو کئی سال سے مردہ پڑی تھی، جان آگئی۔ اگر یہ زندگی وقتی نہیں ہے اور واقعی طلبائے قدیم کی نمائندہ جماعت بن گئی تو اس سے جامعہ کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ موقع ایسا نہیں ہے کہ میں طلبائے قدیم کو مخاطب کرکے ان سے کچھ کہوں، مگر مجھے یقین ہے کہ طلبائے قدیم کی تنظیم کا مقصد یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ اپنے لیے کچھ جگہیں یا عہدے حاصل کریں، اگر ان کی تنظیم مضبوط بنیادوں پر ہوئی تو مجھے امید ہے کہ وہ جامعہ کے بہت سے ایسے کاموں میں مدد کریں گے، جن کے لیے حکومت کی امداد نہیں مل سکتی یا جن کو سرکاری ذرائع سے انجام دینا مناسب نہیں ہے۔ طلبائے قدیم کسی ادارے کے لیے اسی وقت اس کا قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں جب وہ بے لوث اور بے غرض ہو کر یادرِ علمی کی خدمت کریں۔ جامعہ کے حالات چاہے کتنے ہی بدل جائیں، طلبائے قدیم کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ ہر حالت میں اس کی بے غرض اور بے لوث خدمت کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔

(جلسۂ تاسیس میں پڑھا گیا)

سردار جگت سنگھ

میری زندگی

یہ مضمون سردار جگت سنگھ صاحب، پرنسپل چائلڈ گائڈنس اسکول نے لکھا ہے۔ ان سے میری ملاقات تیرہ برس پہلے اتفاق سے ہوئی۔ اس وقت شاید یہ نئے نئے دلی آئے تھے اور سوچ رہے تھے کہ بگڑے بچوں کے لئے ایک اسکول قائم کریں۔ مجھے اُن کا خیال پسند آیا اور اس وقت سے ہم دونوں کے درمیان تعاون کی ایک عجیب شکل پیدا ہو گئی ہے کہ دونوں اپنے الگ الگ رستوں پر چلتے ہیں اور ایک دوسرے پر ہٹا ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔

جگت سنگھ صاحب کی معلومات، انسانی نفسیات کے معاملوں میں ان کی گہری نظر، ان کی خود اعتمادی اور ان کے ایمان بالغیب کا اندازہ ان سے مل کر ہی ہو سکتا ہے۔ جس شوق اور ہمت اور استقلال سے انھوں نے اپنے اسکول کو چلایا ہے اور دوسروں کو بچوں کی نفسیاتی دشواریوں کو سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی تدبیریں سوچنے پر آمادہ کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ شاعر نے محض ایک رسمی دعوے کیا تھا کہ "نگاہ میں ہے مری رند و پارسا اک ایک"، جگت سنگھ صاحب جب دلی کے امیر و غریب، مشہور اور گم نام خاندانوں کے اندرونی حالات بیان کرنا شروع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن دلی والوں کے اعمال کی کیفیت بیان کرنا انھیں کے سپرد ہوگا۔ مگر اس کا بھی اطمینان ہو جاتا ہے کہ اگر یہ خدمت واقعی ان کے سپرد ہوئی تو کوئی گنہگار رحمت الٰہی سے محروم نہ رہے گا۔

میری درخواست پر جگت سنگھ صاحب نے کیس سٹڈیز (Case Studies) کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے۔ بہت شرمندہ ہوں کہ اس میں میں اپنے حصہ کا کام اب تک نہ کر سکا۔ جب یہ مجموعہ

نظروں کے سامنے آئے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ جس انکسار سے جگت سنگھ صاحب نے اپنی قابلیت کا ذکر کیا ہے وہ تکلف ہے، اور سند یافتہ عالم ان کے وجدان پر رشک کر سکتے ہیں ——— محمد مجیب)

میری زندگی بچپن ہی سے غیر معمولی رہی۔

میری عمر ابھی دس سال ہی کی تھی کہ پتا جی کا دیہانت ہو گیا۔ ماتا جی دمے کی مستقل مریض تھیں اور میں بھی سال میں کم سے کم پانچ ماہ بیمار رہتا تھا، پتا جی کے انتقال کے بعد گھر کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی اور خاندان کا شیرازہ بکھرتا نظر آیا، بڑے بھائی ملازم تو تھے لیکن تیس پینتیس روپے مہینہ میں ان کا اُن کی بیوی، ماتا جی اور تین بھائی بہن کا خرچ کیسے چلتا۔ اس لئے ماتا جی ہم تین بھائی بہنوں کو لے کر اپنے گاؤں آ گئیں، یہاں یہ سوال ہی نہیں تھا کہ کوئی ایسا ہوتا جو سیر کرانے کو لے جاتا اور جانوروں اور پرندوں وغیرہ میں دلچسپی کے احساس کو بیدار کرتا۔ ماتا جی بیمار رہتی تھیں اور گھر کا ایک ڈھرا بن گیا تھا۔ کم سے کم خرچ، کم سے کم حرکت اور کم سے کم بات۔ ہر ایک کا دو وقت روٹی کھا لینا اور ہر ایک کی علاحدہ زندگی، جہاں کوئی مستقل کام دھندے نہ ہوں وہاں تفریحی مشغلوں (Hobby) کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔

میری زندگی پر کسی باشعور انسان کا کوئی خاص ذہنی و فکری اثر نہیں پڑا۔ ہاں جذباتی طور پر میں اپنی ماتا جی اور نانا جی سے ضرور متاثر ہوا جو خاندانی وقار کے گر جانے اور زندگی کی بے شمار الجھنوں کے باوجود خاموش رہنے کے عادی ہو گئے تھے، ماتا جی خدا پر عقیدہ رکھنے اور ہر حال میں راضی برضا رہنے کی وجہ سے اور نانا جی عادتاً خاموش طبیعت ہونے کے سبب۔

مجھے یاد نہیں کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک میری زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہوا ہو یا کسی خاص انسان نے میری رہنمائی کی ہو، اگر کوئی کام تھا تو پڑھنا اور ہر قسم کے لوگوں سے مطابقت پیدا کرنا اور جب موقعہ ملتا پاٹھ کرنا اور خاص خاص لائنوں پر سچار کرتے رہنا اور گھر میں موجود گروؤں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنا۔

میرا خیال ہے کہ ان دنوں حالات کی خرابی نے میری بہت سی عادتیں بنائیں، گویا میری طبیعت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔

میں پنجابی میں کویتا لکھتا تھا اور جب میں ساتویں کلاس میں تھا ایک آل انڈیا پنجابی مشاعرہ میں بے روزگاری پر ایک کویتا کے سلسلے میں مجھے انعام بھی ملا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد جب میرے بڑے بھائی کام کے لئے باہر چلے گئے اور ماتا جی نے ضد کی کہ وہ کبھی گاؤں سے باہر نہیں جائیں گی، میں نے بھی گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کر لیا، مگر وہاں میرے لئے نہ تو کوئی نوکری تھی اور نہ کوئی اور شغلہ، بس ماں کی بیماری میں ان کے پاس رہنے کی خواہش۔

صرف اس غرض سے کہ کچھ کرنا چاہئے میں نے چار روپے ماہانہ کرایے پر دو کمروں کا مکان لے کر دو تین بچوں کی کلاس شروع کر دی۔ یہ اسکول کوئی سات سال چلا اور یہ سات سال میری زندگی کے بڑے حسین سال تھے۔ کبھی گرو نانک کی کسی بات پر عمل کرانے کی خواہش پیدا ہوئی، کبھی فرید یا کبیر کی بتائی کسی بات پر، ایک بار ایک ماہ تک میرے سبق میں اقبال آتے رہے اور پھر پندرہ دن تک وکٹر ہیوگو کا ناول موضوع گفتگو بنا رہا۔ کبھی ٹیگور اور کبھی ذاکر صاحب کی بنیادی تعلیم کے نظریے کا ذکر ہوتا۔ لیکن میں کسی علمی شوق کو پورا نہ کر سکا، کچھ علم کی کمی تھی، کچھ وسائل نہیں تھے،

اپنا اسکول تھا، لڑکوں کی برانچ علاحدہ، لڑکیوں کی علاحدہ، اسٹاف بالکل اپنی مرضی کا تقریباً سب اپنے طالب علم یا وہ لوگ جن کی مدد کر کے میں نے اُن کو اِس کام کے قابل بنایا تھا۔

چھوٹا سا شہر تھا، ہر بات کو جانچا پرکھا جاتا تھا، اسکولوں میں داخلے مل جاتے تھے، کیریر بنانے کا اتنا زور بھی نہیں تھا اس لئے بچے مجبور ہو کر میرے پاس نہیں آتے تھے، بس کام تھا اور ہم، وہی آرام کی جگہ وہی کھانے کی، رات کو آٹھ بجے گھر جانا صبح سات بجے پھر وہیں، اگر اسکول میں کام نہیں ملا، تو مٹی کے تیل، کپڑے یا گندم کی تقسیم کا کام گورنمنٹ سے لے لیا، سب کاموں میں اسکول کے بچے ساتھ، شہر میں سخت ملیریا پھیلا، خاندان کے خاندان چارپائی پر، ان دنوں ہمارا اسکول دو گھنٹے دیر سے لگتا تھا، صبح کو طلبا کی ٹولیاں جن میں لڑکیاں بھی ہوتیں، لوگوں کے

گھروں میں جا کر اُن کے کمروں کی صفائی کرتیں، دوا دیتیں اور پھر اسکول آتیں۔

استادوں کی تعداد کم تھی، اس لئے بڑے لڑکے چھوٹی کلاسوں کو پڑھا لیتے تھے، میں ہندی نہیں لکھ سکتا، لیکن دسویں جماعت کو آٹھ مہینے ہندی پڑھائی اور آٹھ میں سے سات لڑکیوں کو ۷۵ فیصدی سے زیادہ نمبر ملے۔

مجھ میں ایک کمزوری شروع ہی سے رہی ہے، میں نے جسمانی محنت کا کام کبھی نہیں کیا، یہاں تک کہ دوا دینے کا کام بھی کبھی خود نہیں کیا، ہاں استادوں کے علاوہ والدین بھی میرے منصوبوں میں شریک رہتے تھے۔

ہم کبھی کبھی سالانہ دن مناتے تھے تو اس دن کی تقریبات کے منصوبے اور پروگرام والدین بناتے تھے، بچے گھر سے تمام چیزیں لاتے اور آرائش کرتے، چار کی میزوں پر اگر بیس چادریں ہوتی تھیں تو بیس قسم کی ہوتی تھیں، ہر چادر گھر کی بہترین چادر ہوتی تھی، چار کا سٹ بھی بہت اچھا، جو بچے کچھ نہیں لا سکتے تھے، وہ کوئی ڈیوٹی سنبھال لیتے تھے، سارا پروگرام نویں اور دسویں جماعت کی لڑکیوں کا ہوتا تھا، لڑکے مدد کرتے تھے۔

جن والدین کے بچے میرے پاس پڑھتے تھے، ان میں سے کئی میرے مخالف تھے، ایک وجہ یہ تھی کہ میں تعلیمی منصوبوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ ساتھ رکھتا تھا اور دوسری یہ کہ بچے گھر پر اپنے والدین سے سوال کرتے اور بحث شروع کر دیتے کہ شادی بیاہ میں سادگی ہونی چاہیے، برتھ ڈے نہ منانا چاہیے، تعلیم کے بعد نوکری کرنا ضروری نہیں ہے، اور گاندھی جی ٹھیک کہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کو اسکول سے اٹھاتے نہیں تھے، ایک تو بچے جانے کا نام نہیں لیتے تھے، دوسرے والدین کو میری سمجھ بوجھ اور اخلاق پر اعتماد تھا، مجھے حمیدہ نام کی لڑکی کی یاد آتی ہے، وہ گھر سے تو برقع پہن کر آتی تھی لیکن اسکول میں وہ برقع کو سنبھال کر رکھ دیتی تھی، کوئی پوچھتا کہ اسکول میں کئی مرد ٹیچر بھی ہیں تو اس کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا کہ سردار جی اور ان کے ساتھی کوئی مرد تھوڑے ہی ہیں، شروع کے برسوں میں تو سارے مرد ٹیچر کنوارے تھے اور ان میں سے

ایک ٹیچر جو میرا شاگرد رہ چکا تھا، بدنام بھی تھا لیکن خدا کا فضل ایسا تھا کہ سب کو اعتماد تھا اور سب چپ ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ شرط لگا کر میں نے یہ کہا کہ چھٹی لڑکیاں اسکول میں سویا کریں گی اور وہی ٹیچر ان کو ۸ بجے سے ۱۰ بجے رات تک پڑھایا کریں گے، سب لڑکیوں کے گھروں میں بحثیں ہوئیں، رواروہٹ بھی مچی، لیکن سب بستر لے کر آگئیں اور آخر میں سب کا یہی فیصلہ تھا کہ ـــــ سردار جی کا اسکول ہے، کوئی مخول تھوڑے ہی ہے ۔

میرے پاس میرے وطن کے مقامی لوگوں میں ایک مسلمان پیر جن کی عمر ۶۱ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی اور جن کے مریدوں کی تعداد کم از کم ایک لاکھ رہی ہوگی، پڑھتے تھے، اکثر لوگ آتے اور اسکول ہی میں ان کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر ان کا نذر نیاز دے جاتے تھے، ان کے والد مرحوم کے مزار پر کافی رونق رہتی اور ان کے مریدوں کی ایک کمیٹی صفائی روشنی وغیرہ کا انتظام کرتی ۔

جب میں نے اسکول میں کمرہ صاف کرنے کی ایک ماہ کی ڈیوٹی ان کی لگائی تو بہت حیران اور دکھی ہوئے لیکن کمال یہ ہے کہ وہ ڈیوٹی انھوں نے بڑے شوق سے نبھائی، ہاں اتنا ضرور تھا کہ کمرہ صاف کرتے وقت وہ گلی کا دروازہ بند کر دیتے تھے اور لڑکوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ یہ بات باہر کسی سے نہ کہیں، دروازہ بند کرنے کی وجہ وہ یہ نہیں بتاتے تھے کہ انھیں اس کام سے شرم آتی ہے بلکہ یہ کہ اگر اس کی خبر ان کے مریدوں کو ہوگئی تو سردار جی تو الگ رہے، ان کے سارے گھر والوں کو وہ ایک دن میں ختم کر دیں گے ۔

دہلی آ کر بھی جب میرا کوئی پرانا ودیارتھی ملا یا والدین میں سے کسی سے ملاقات ہوئی تو یہ معلوم کر کے ان کو خوشی ہوئی کہ یہاں بھی میں اسی طرح کام کر رہا ہوں، لیکن بیچاروں کو یہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے حالات بالکل دوسرے ہیں اور نہ میں پہلے کی طرح آزاد ہوں نہ وہ معیار زندگی ہے اور نہ خارجی اثرات کو ہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اب ہر کام کو قاعدے سے کرنا ضروری ہے، اور اس کے لئے صبر اور محنت کی بھی ضرورت ہے ۔ لیکن ایک بات بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ یہاں کے حالات وہاں سے چاہے کتنے ہی مختلف ہوں، میرا یہ

کام کر لوگوں کے جذباتی انتشار کو کم کروں، وہاں بھی تھا اور یہاں بھی ہے، وہاں بھی میں نے خدا کی محبت کو تقدیر بن کر انسانوں کو سہارا دیتے دیکھا ہے اور یہاں بھی۔ مجھے انسانوں کی نفسیاتی کشمکش کی مختلف شکلوں سے کچھ بہت دلچسپی نہیں ہے، میں اس کشمکش کو جہاں بھی دیکھتا ہوں، اس کی شدت کو کم کرنا چاہتا ہوں، مگر ہر کیفیت کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ میں بھی آخر انسان ہوں، ہر روگ پر میرا بس نہیں چلتا۔ لیکن یہاں دلی میں اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ نفسیاتی کشمکش کے مسئلوں پر مل کر غور کر سکتے ہیں، اور چاہے وہ تمام مسئلوں کی تہ تک نہ پہنچ پائیں اس مل کر غور کرنے سے بہتیروں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جائے گا۔

باقی رہا زندگی میں کسی شوق یا مشن وغیرہ کا سوال، تو میں نے ان چیزوں کا مطلب سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی، جذباتی طور پر ہلکا پھلکا رہنا ہی پسند کیا، ان تدبیروں کو کبھی معلوم کرنے کی کوشش جن سے جذبات کو دل و دماغ کے لئے بوجھ بننے سے روکا جا سکتا ہے اور نہ دوسروں کو ان تدبیروں کا پتہ چلانے کی ترغیب دی، البتہ کبھی اگر غور و فکر کی کوئی راہ اس سلسلہ میں مل جاتی ہے تو کچھ دن اسی کے نشے میں گذر جاتے ہیں۔

میں فرائڈ جیسے ماہرین نفسیات کا قائل تو ہوں لیکن ان کے سمجھنے کے لئے جس صبر و محنت کی ضرورت تھی وہ مجھ سے نہیں ہو سکی، میرے کام کے لئے عام طور پر بابا فرید، کبیر، صوفی بلھے شاہ، گرونانک یا ایسے کچھ اور بزرگوں کا طریقہ کارکافی ہوتا ہے، اس سلسلہ کی دوسری چیزیں جن کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کام کے ماہرین سے ٹھوس شکل میں مل جاتی ہیں، محنت کرنے تلاش کرنے کی عادت نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

پیچیدگیوں کا سب سے پریشان کن پہلو یہ تھا کہ اپنی حیثیت اور اہمیت کو قائم رکھنا پڑتا تھا، ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر اس کام سے آمدنی نہ ہوئی تو دوکانداروں اور گھر والوں سے اپنی ناکامی کو چھپانا ہوگا، اس لئے طے کیا کہ بچوں میں نفسیاتی کشمکش دور کرنے کا کام کیا جائے اور بچوں کے والدین کی نظر میں حیثیت اور اہمیت حاصل کی جائے۔ اس طریقے کو اختیار کرنے کی وجہ سے میری اپنی ذہنی کشمکش کا وقت گذر گیا۔ اس کے علاوہ اس کام کے ساتھ میری جذباتی خوشی بھی وابستہ ہوتی رہی۔ میرے کام کی جو نوعیت ہے وہ خاص حالات کا نتیجہ ہے، اور حالات کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔

کوائف جامعہ

تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی انجمنوں کو بہت سی حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے جامعہ میں ان کی حیثیت اور انجمنوں سے کچھ زیادہ ہی ہے، کیونکہ جامعہ کا تعلیمی نظام شروع ہی سے ایسا ہے جس میں طالب علموں کو بہت نمایاں اور ممتاز حیثیت دی گئی ہے اور ان کی عمر اور صلاحیت کے مطابق انھیں مختلف تعلیمی اور انتظامی کاموں میں شریک کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ان کی بہت سی انجمنوں کی مسند نشینی کے جلسے ہوئے۔ ان جلسوں کی اہمیت دو لحاظ سے بہت زیادہ ہوتی ہے، ایک تو طالب علم کو اپنے حوصلوں اور عزائم کے اظہار اور اپنی مشکلات اور دقتوں کو بیان کرنے کا بہترین موقع ہوتا ہے دوسرے شیخ الجامعہ صاحب ان جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور طالب علموں کو جن میں کافی تعداد نئے طالب علموں کی ہوتی ہے جو جامعہ کی خصوصیات سے بڑی حد تک ناواقف ہوتے ہیں، اپنے قیمتی خیالات اور مفید نصیحتوں سے مستفید فرماتے ہیں۔ پچھلے دنوں جن انجمنوں کی مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی، ان کی مختصر روداد قارئینِ جامعہ کی دلچسپی اور اطلاع کے لیے درج کی جاتی ہے:

بچوں کی حکومت

بچوں کی حکومت طلبائے مدرسہ ابتدائی کی انجمن ہے۔ یہ انجمن بڑی حد تک اسمِ باسمّٰی ہے اور اسے مدرسے کی عملی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا آپ تھوڑا سا اندازہ پچھلے سال کی رپورٹ سے کر سکتے ہیں۔ بچوں کی حکومت کے صدر نے مختلف وزیروں کی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ "آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہاں ترانے میں چہارم سے ششم تک ہر کلاس کی ہفتہ میں ایک دن باری ہوتی ہے، جس میں تلاوت کے علاوہ خبریں اور نظمیں وغیرہ پڑھی جاتی ہیں۔ پورے ترانے کا انتظام وزیرِ داخلہ کو ہی کرنا ہوتا ہے، یہ کام

بڑی ذمہ داری کا ہے، وقار حسین زیدی نے اپنے فرائض کو بڑی خوبی سے انجام دیا، آپ نے طلبہ کے اندر نظم وضبط قائم رکھنے کی بہت کوشش کی۔ سب سے مشکل کام کھانے پینے کا ہے اور کھلانے پلانے کا۔ جہاں دونوں کام بچوں کے سپرد ہوں وہاں کیا حال ہوگا، لیکن صاحب ہمارے یہاں پہلی گھنٹی بجتے ہی مانیٹر کھانا لگانے پہنچ جاتے ہیں، دوسری گھنٹی بجتے ہی تمام ساتھی ڈائننگ ہال میں آجاتے ہیں۔ اور خاموشی سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ شاہ نواز صاحب نے چیف جسٹس صاحب اور وزیر صحت وصفائی کی مدد سے ڈائننگ ہال کے اس کام کو بہت اچھی طرح انجام دیا اور ساتھیوں کی کھانے سے متعلق شکایتوں کو اپنے بڑوں تک نہایت ادب سے پہنچایا اور مینو کمیٹی کے جلسوں میں بہت مفید اور اچھے مشورے دیتے رہے۔"

بچوں کی حکومت کے نئے صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک موقع پر کہا کہ "میں ایک عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ پتا نہیں کیوں ساتھی مدرسے کی چیزوں کو اپنی چیز نہیں سمجھتے، اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ مدرسہ کی چیزیں آپ کی ہیں، آپ ہی کے فائدے کے لیے ہیں تو پھر کبھی بھی بے دردی سے استعمال نہ کریں، اس لیے میں درخواست کروں گا کہ آپ آج سے طے کر لیجیے کہ مدرسہ کی ہر چیز کو اپنی چیز سمجھیں گے اور اس کی ایک ایک چیز کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔" شیخ الجامعہ صاحب نے خطبے کے اس حصے کو بہت پسند فرمایا۔ اپنی تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہندوستان کے طالب علم اس بات کو سمجھ لیں تو آج توڑ پھوڑ کی جو کارروائیاں کر رہے ہیں، وہ نہ کریں۔ انھوں نے فرمایا کہ جس طرح مدرسہ کی ہر چیز طالب علموں کی اپنی چیز ہے اسی طرح ملک کی ہر چیز اس کے رہنے والوں کی ہے، اگر کوئی شخص کسی چیز کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔

بزمِ ادب

بزمِ ادب طلبائے مدرسہ ثانوی کی انجمن ہے۔ امسال اس کے نائب صدر عبدالحفیظ خاں منتخب ہوئے ہیں جن کا خاندان جنوبی افریقہ میں بس گیا ہے، عبدالحفیظ خاں مدرسہ ابتدائی سے جامعہ میں پڑھ رہے ہیں اور اب گیارھویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جامعہ کی امتیازی

خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "جامعہ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں جذبات کو عقل سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ یہ جامعہ کا اہم کردار ہے جو اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے، یہ مزاج ہمیں مشکل سے کہیں اور دکھائی دیتا ہے۔ میں نے جنوبی افریقہ کے اس خطے میں آنکھ کھولی جہاں انگریز اور یورپین قومیں رنگ و نسل کا امتیاز پیدا کر کے انسانیت کو کچل دینے کی کوشش کرتی رہی ہیں، جب میں ہندوستان آیا تو یہاں رنگ کے بجائے دوسرے تعصبوں کو انسانیت میں حائل پایا، لیکن جامعہ میں تو میں نے ایک دوسرا ہی رنگ دیکھا، یہاں انسانیت ہی کو ایک مضبوط رشتہ مانا گیا ہے، یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ چمن کے رنگ برنگ پھولوں کی طرح رہتے ہیں۔"

عہدِ غلامی سے مطالبے کرنے کی عادت ہم میں اتنی راسخ ہو گئی ہے کہ ہمیں اپنی آزادی اور ذمہ داری کا احساس ہی نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ ایسے مواقع پر مختلف قسم کے مطالبے کرنا ہمارا قومی مزاج بن گیا ہے۔ مدرسہ ثانوی کی بزمِ ادب کے نئے نائب صدر نے اس روایت کے خلاف شیخ الجامعہ صاحب کو مخاطب کر کے صاف صاف کہا کہ "اس سال ہم آپ کے سامنے کوئی مطالبہ نہیں پیش کر رہے ہیں، کیونکہ ہم کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ کو ان مشکلات اور مطالبات کا علم ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ جو محبت اور شفقت ہے، اس ناطے آپ ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے پوری طرح کوشش فرمائیں گے۔" نئے نائب صدر نے آگے چل کر کہا کہ "میں اپنے ساتھیوں سے کہوں گا کہ انھیں سہولتوں اور آسانیوں کے مطالبے پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے، رکاوٹوں اور دقتوں کے باوجود آگے بڑھتے رہنا چاہیے اور عزم و ہمت کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔" شیخ الجامعہ صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی اور اپنی تقریر میں اس جذبے اور حوصلے کی تعریف کی، ساتھ ہی یقین دلایا کہ طالب علموں کی ضروریات کا ہمیں پورا پورا احساس ہے اور ہم ان کو پورا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

اس موقع پر وزارتِ تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری جناب چنکارا صاحب خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیے گئے تھے۔ موصوف نے طالب علموں کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں پر ایک بصیرت افروز تقریر کی، جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

جناب مجیب صاحب اور میرے پیارے طالب علمو !

یوں تو میں جامعہ میں آتا رہتا ہوں، لیکن آج آپ نے مجھے استادوں اور طالب علموں سے ملنے کا جو موقع دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں، اسکول کی اس اہم سرگرمی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو آج مجھے نزدیک سے دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا ہے، اس کے لئے میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں ۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ جمہوریت میں ایک اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر ایک انسان کی اور اس کی رائے کی پوری پوری قدر ہوتی ہے۔ جب کوئی ملک جمہوریت، تاناشاہی یا کسی اور نظام حکومت کو اپنے لئے چن لیتا ہے تو یہ نظام صرف مرکزی یا صوبوں کی سرکار چلانے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس ملک کے سبھی قومی اداروں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ اس دلیل سے ظاہر ہے کہ جب نظام کے چلانے میں جمہوریت رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں میں نوجوانوں کو اس قسم کے نظام کے لئے تیار کرنا ہمارا فرض ہو جاتا ہے ۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے ترقی پذیر اداروں میں اسکول پارلیمنٹ کا طرز عمل موجود ہے تو کہیں پر طلبا کی سرکار کا اور کہیں پر مجلسِ طلبا کا ۔

فرق اس بات کا نہیں کہ کسی ادارے میں ان میں سے کس سرگرمی کو جاری کیا گیا ہے، اہمیت ہمیشہ اس بات کی رہتی ہے کہ اس سرگرمی کا میدان کتنا وسیع ہے، اس کے کارکنوں میں کس قدر تندہی ہے اور کس کامیابی یا خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چلایا جا رہا ہے ۔

مثال کے طور پر مجلس طلبا کی کامیابی کا جائزہ لینے میں سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس سرگرمی کی مدد سے طلبا کو جمہوری نظام کے لیے کیسی تربیت دی جا رہی ہے اور اس میں انفرادی رائے کو کتنی عزت حاصل ہے ۔

مجلسِ طلبا کا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبا کو مل جل کر کام کرنے کی تربیت دی جائے ۔ لفظ "مجلس" خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں "جماعت" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ۔

جمہوریت کی بنیاد میں یہ بات ہمیشہ عیاں رہتی ہے کہ ایک دماغ سے دس دماغ ویسے ہی زیادہ اچھی طرح سوچ سکتے ہیں جیسے ایک ہاتھ سے دس ہاتھ زیادہ تیزی سے کام کرسکتے ہیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان دس سے تو کیا سینکڑوں انسانوں سے زیادہ ٹھیک اور زیادہ اچھی طرح سوچ سکتا ہے، ایسی حالت میں جمہوریت انفرادی جوشِ عمل کو ختم کرنے کا حکم نامہ نہیں دیتی بلکہ یہ پیغام دیتی ہے کہ کوئی انسان کتنا ہی عقلمند یا ٹھیک کیوں نہ ہو اسے اپنے ٹھیک راستے کے بارے میں جماعت کو قائل کرکے پھر آگے بڑھنا ہوگا۔ اس لئے کونسل کے عہدہ داروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کام کو متحدہ کوشش سے کریں اور ہمیشہ اپنے ساتھیوں کا وشواس ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ ہمیں اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ بڑی بڑی سنستھائیں کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتیں اس کے لئے ہمیشہ کونسل، کمیٹی، ٹرسٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں اور ان کا فائدہ تبھی ہوتا ہے جب اس کے ممبر یک جہتی سے کام کرتے رہیں۔

آپ نے مجلس کی مختلف سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مجلسِ طلبا میں کس قدر زندگی ہے۔ خاص طور پر ایک دن کے اسکول کا پروگرام اور خیال مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوا۔ نیو ایرا اسکول، بمبئی اور لال باغ ہائر سکنڈری اسکول لکھنؤ میں بھی یہ پروجیکٹ کافی سالوں سے چل رہا ہے اچھا رہے گا کہ خط و کتابت کے ذریعہ آپ وہاں کے طلبا سے تجربات کا تبادلہ کرسکیں۔

سالانہ رپورٹ سے یہ معلوم کرکے مجھے خوشی ہوئی کہ طالب علموں نے بہت سے انعامات حاصل کئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لوگ تعلیمی فرض کو صحیح طور پر انجام دیتے ہیں۔ آپ کے نئے صدر نے اپنے ایڈریس میں طالب علموں کی موجودہ بے چینی کا ذکر کیا ہے، مجھے خوشی ہے کہ اس ادارے میں اس قسم کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا ہے، میں آپ سب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے طلبہ اور ملک کے سامنے بہترین ڈسپلن کا نمونہ پیش کیا ہے، میری رائے میں طلبہ کو سیاسی پارٹیوں سے الگ رہ کر اپنے علمی کاموں میں پوری توجہ دینی چاہیئے، اسی میں ملک کی بہتری ہے۔ آپ نے پچھلے سال مختلف قسم کے پروجکٹ کئے ہیں، میں آپ کو ایک ضروری پروجکٹ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، جسے آپ

کسی مناسب موقع پر انجام دیں تو اچھا ہے، وہ ہے "قومی ملکیت کی حفاظت" کا۔ ہمارے ملک میں کچھ تباہ کن عنصر ایسا ہے ـــ اور بدقسمتی سے یہ عنصر دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے ـــ جو ملک کی عمارتوں، ریل گاڑیوں، بسوں اور عوام کے جان و مال کو نقصان پہنچانے میں اپنی کامیابی سمجھتا ہے، اسکول میں بھی ایسا عنصر کبھی کبھی موجود رہتا ہے، جو اسکول کی دیواروں کو خراب کرنے، ڈیسکوں کو لاپرواہی سے استعمال کرنے، اسکول کے پیڑ پودوں کو بے رحمی سے کچلنے اور اسکول، لائبریری کو نقصان پہنچانے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ایسے گمراہوں کو جلدی سے جلدی راہ راست پر لا کر کونسل صرف اسکول کی ہی نہیں قوم کی بہت بڑی خدمت کر سکتی ہے۔ طلبا کے اخلاق یا اُن کی مشکلات سے متعلق اور بھی لاعدد پروجیکٹ سوچے جا سکتے ہیں۔

آخر میں طلبا کو ایک بات ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے کہوں گا کہ جیسے میں نے شروع میں کہا ہے۔ یہ کونسل اُن کو ٹریننگ دینے کے لئے ہے۔ یہ کوئی Agitation کا اکھاڑہ نہیں اِس میں انھیں ہمیشہ اپنے استادوں کی رہنمائی میں چلنا چاہئے تبھی وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی آپ کی کونسل اپنے استادوں کی قابل رہنمائی میں اسی کامیابی کے ساتھ کام کرتی رہے گی اور اِس کی بنیاد میں جو مقصد ہے اُسے پوری طرح سے حاصل کرے گی۔ میں سبھی استادوں اور طلبا کو اِسی سرگرمی کو نہایت خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے مبارکباد دیتا ہوں اور مجھے دعوت نامہ بھیجنے کے لئے دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

انجمن اتحاد، جامعہ کالج

۱۲ر نومبر ۶۶ء کو انجمن اتحاد کی مسند نشینی کا جلسہ ہوا۔ گذشتہ سال انجمن کے جو عہدیدار منتخب ہوئے تھے اُن میں نائب صدر اور ناظم دونوں بی اے فائنل کے طالب علم تھے اور دونوں عہدیدار بی اے کا امتحان پاس کر کے جامعہ سے جا چکے تھے، اس لئے اس جلسہ میں رپورٹ ایکٹنگ سکریٹری نے پڑھی جو معمولی ترمیموں کے ساتھ منظور کی گئی۔ نئے نائب صدر وجے شرما (متعلم بی ایس سی سال دوم) نے اپنے خطبہ میں جامعہ کے طالب علموں کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ طلبہ ہی اپنے ادارہ

کے ماحول کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے جناب شیخ الجامعہ کے سامنے جو جلسہ کی صدارت فرمارہے تھے اپنے اُن مطالبات کو رکھا جو انجمن کے کام کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہیں اور جن کا خود شیخ الجامعہ صاحب کو پورا احساس ہے اور وہ انھیں پورا کرنے کے لئے ضروری تدابیر کر رہے ہیں۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی تقریر میں اُن باتوں کی طرف اشارہ کیا جو تعلیمی اداروں کے ماحول کے لئے ضروری ہیں اور آج کے سیاسی ماحول میں جن باتوں سے بچنے کی ضرورت ہے اُن کا بھی ذکر کیا۔

آخر میں انجمن کے نئے ناظم عبدالجلیل (متعلم بی اے فائنل) نے جناب صدر اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور جناب صدر کی اجازت سے جلسہ کے ختم ہونے کا اعلان کرتے ہوئے طالب علموں اور مہمانوں سے عصرانہ میں شریک ہونے کی درخواست کی۔

عنوان چشتی کا مجموعۂ کلام

جناب عنوان چشتی صاحب جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ میں اردو کے لکچرر ہیں، موصوف ادب کا اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور اردو کے نوجوان شعراء میں قابل ذکر حیثیت کے مالک ہیں۔ ابھی حال میں ان کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ "ذوق جمال" کے نام سے شائع ہوا ہے، جس کا اعلان اکتوبر کے رسالہ جامعہ میں کیا جا چکا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت کی خوشی میں ان کے احباب نے ۱۳ر اکتوبر کو عصرانے اور جلسے کا انتظام کیا اور موصوف کو مبارکباد دی۔ اس موقع پر ان کے ایک دوست جناب انور صدیقی صاحب نے ان کی شاعری پر ایک مختصر مضمون پڑھا، جس میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے فرمایا کہ "عنوان چشتی حسن وجمال کے شاعر ہیں اور ان کا اپنا ایک انداز نظر اور ان کی اپنی ایک افتاد طبع ہے۔۔ عنوان چشتی نے اپنے مجموعے کے لیے جو کلیدی شعر انتخاب کیا ہے، جسے ہم ان کی شاعری کا اسم اعظم کہہ سکتے ہیں، وہ ان کے جمالیاتی نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے، اسی ذوق جمال اور احساس جمال کی کرشمہ سازی ہے کہ انھیں زندگی کے مظاہر میں غزل کا سا کیف محسوس ہوتا ہے:

تیری نسبت سے ملا ہے مجھے یہ ذوقِ جمال
مسکراتی ہوئی ہر چیز غزل ہو جیسے

ایک شعر اور دیکھئے

تجھ کو کیا غم بڑی چیز ہے احساسِ جمال
میرے ناصح یونہی رہنے دے گنہگار مجھے

انور صدیقی صاحب آگے چل کر اپنی تقریظ میں مزید فرماتے ہیں "عنوان چشتی نے فن کے معروف عیوب سے اجتناب کرنے کی کوشش کی ہے، مگر وہ فن کی معنوی لطافت کو فن کی جامد پابندیوں پر ترجیح دینے کے قائل ہیں، دراصل یہی صحت مند فنی نقطۂ نظر ہے۔ ان کے یہاں عام نوجوان شعراء کی سی فنی بے راہ روی نہ ملے گی، وہ اردو کی بہترین شعری روایات سے واقف ہیں اور اسی روایت کے آئینہ میں اپنے ذوقِ سلیم سے اپنی شاعری کی مشاطگی کرتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ ان کے یہاں ابہام اور پیچیدگی نہیں ہر خیال کا چہرہ روشن ہے اور جذبے کے رنگ نمایاں ہیں

یہ کون مسکرا کے پسِ پردہ چھپ گیا　　اب تک خزاں پکار رہی ہے بہار کو

محفلِ ناز میں پھول لیے آیا ہوں　　آج اظہارِ محبت کا محل ہو جیسے

بجھا چکا ہوں ترے انتظار کی شمعیں　　کھلا ہوا ہے مگر شام ہی سے دروازہ

انور صدیقی نے اپنے اس مضمون کو حسب ذیل تبصرے پر ختم کیا ہے:

"اس طرح کے بہت سے اشعار عنوان چشتی کہہ رہے ہیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ رومانیت کے پُراسرار و پُرکیف دھند سے نکلنے کے لیے مضطرب ہیں اور ان کا احساس اس دور کی صد ہا پریشان کن سچائیوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے تاب ہے۔"

(عبداللطیف اعظمی)

فخر و مسرت کے ساتھ

ماہنامہ شاعر بمبئی —

فروری ۱۹۶۷ء میں

اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان

اور پاکستان کے اردو ادیبوں بلکہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی زبانوں

کے مشہور قلمکاروں نیز دنیا کی مختلف زبانوں کے ایک سو سے زیادہ مصنفین

و مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

چھ سو صفحات سے زیادہ کی ایک عظیم منفرد اور حسین

خصوصی اشاعت

فوٹو آفسٹ کی ۲۴ صفحات پر یادگار تصاویر

قیمت ——— دس روپے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اس کی عظمت کی
کہانی، اس کی تصانیف کا جائزہ، اس کے زندہ اسلوب، فکر
اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر
تنقیدی نظر

ایجنٹوں سے

آرڈرس پہلے سے آنے چاہئیں، بعد میں تکمیل نہ ہو سکے گی

کرشن چندر نمبر میں

خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار

نئے

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں۔ ایک ڈرامہ

ایک مزاحیہ۔ میرے ادبی نظریات

میرے تنقید نگار

میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

★

کرشن چندر کے [illegible] تصاویر

اور ان کی

عکس تحریر

کرشن چندر کے اہم

خطوط

منیجر شاعر ——— مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۳ بی سی

ماہنامہ جامعہ کی خاص اشاعتیں

پچھلے چند برسوں میں ماہنامہ جامعہ کے حسب ذیل خاص نمبر شائع ہوئے ہیں:

۱۔ ۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا جائزہ — قیمت : ایک روپیہ

۲۔ ۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا جائزہ — " : " "

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر — " : " "

۴۔ ٹیگور نمبر — " : پچاس پیسے

۵۔ حضرت جگر نمبر — " : " "

۶۔ مستشرقین نمبر (اس نمبر میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ دہلی پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے) — قیمت : پچاس پیسے

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: دیال پریس دہلی

APPROVED REMEDIES for QUICK RELIEF

for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS

TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON

for
FEVER & FLU
QINARSOL

for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI

PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES
Cipla
BOMBAY 8.

AVAILABLE AT ALL CHEMISTS